نئی پرانی کتابیں
صفدر امام قادری
مرتبہ: الفیہ نوری

تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی

ڈی ایف کی جاتی ہیں ۔

مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا

ضروری نہیں ۔

فیس بک گروپ

کتابیں پڑھئے

ایڈمن ۔ سید حسین احسن

0344-818-3736

0314-595-1212

ظفر کمالی

سب جس کو محبت سے پکاریں صفدر
ہیں اس میں شرافت کے ہزاروں جوہر
چھوڑے گا بھلا کیسے اشراف کی خو
اشرفؔ[1] کا پسر ہے وہ اشرفؔ کا پسر
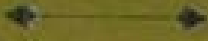
تازیست نہیں ہوتا ہے اس سے جدا
ہوتی ہے اگر دنیا ہو جائے خفا
معلوم ہے، سو عیب ہیں اس میں ، لیکن
مجبور ہوں دل سے جو اسی پہ ہے فدا

غم اپنا دنیا سے چھپا لیتا ہے
درد اٹھے تو دل میں دبا لیتا ہے
اس میں کتنی ہمت ہے ، جو اپنی
بربادی کا جشن منا لیتا ہے

جیون کی راہوں کو پُرخار کیا
اس نے اپنا جینا دشوار کیا
دل کے زخموں کو گننا نا ممکن
سانسوں کو کیوں اس نے تلوار کیا
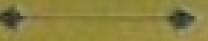
کاموں کا انبار لیے پھرتا ہے
کیا کیا وہ آزار لیے پھرتا ہے
لوگوں میں وہ کتنی خوشیاں بانٹے
جو دکھ کا سنسار لیے پھرتا ہے

دنیا کو سمجھتا ہے چالاک ہے وہ
لڑتا ہے زمانے سے بے باک ہے وہ
وہ یار ہے یاروں کا جب تک خوش ہے
ہو جائے جو نا خوش تو خطرناک ہے وہ

[1] جناب اشرف قادری مرحوم

نئی پُرانی کتابیں

صفدر امام قادری

ترتیب: الفیہ نوری

تحقیقی، تنقیدی، علمی کتب و رسائل پر تبصرے

صفدر امام قادری

ترتیب:

الفیہ نوری

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

Nai Purani Kitaben
By Safdar Imam Quadri
Edited by Alfiya Noori
Ist Edition 2013
Price: Rs 300

نام کتاب : نئی پرانی کتابیں
مصنف : صفدر امام قادری
مرتبہ : الفیہ نوری
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
پہلی اشاعت : ۲۰۱۳ء
زیرِ اہتمام : انجمن ترقی اردو، بہار، پٹنہ
قیمت : تین سو روپے
تعداد : ۵۰۰
سرورق : اظہار احمد ندیم

رابطہ :
1. Dept. of Urdu, College of Commerce, Patna, Bihar-800020
2. Abu Plaza, 202, Near NIT More, Ashok Rajpath, Patna, Bihar-800006
E.mail: safdarimamquadri@gmail.com, Mob: 09430466321

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۶
- بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
- مکتبۂ آزاد، پتولین، گلزار باغ، پٹنہ۔۷
- کتاب دار، ممبئی۔

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob:9971775969,9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

اردو کے اپنے پہلے استاد

مولانا علی الیاس عاجز

کے

نام

جن کی نگرانی میں

میری ادبی اور تنقیدی

تربیت ہوئی

ترتیب 149

ادبی صحافت 182

جہانِ تازہ 230

قطعۂ تاریخ انطباع واحد نظیر 240

التماس

نئی پرانی کتابوں یا رسائل پر یہ تبصرے کسی خاص تیاری یا اہتمام کے ساتھ نہیں کیے گئے تھے۔ یہ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۳ء کے بیچ تقریباً ربع صدی کے وقفے میں لکھے گئے اور بالعموم شائع ہوئے۔ موجودہ جلد تحقیقی، تنقیدی اور علمی کتابوں اور چند رسائل سے متعلق تبصروں کے لیے وقف ہے۔ اس دوران شاعری اور فکشن سے متعلق کتابوں پر بھی اظہار خیال کے مواقع دستیاب ہوئے لیکن اُن تحریروں کو مستقبل کے لیے اُٹھا چھوڑا۔ مقصد واضح ہے کہ اس کتاب کے تبصرے مزاج کے اعتبار سے آہنگ میں رہیں۔

اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت پر گفتگو سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ نگاری آخر فن تنقید سے کس درجہ ہم رشتہ ہے؟ تبصرہ نگار کا دائرۂ کار کیا ہے؟ متنِ کتاب کے تعارف تک ہی مبصر کو رہنا ہے یا کتاب کے مشتملات کی گرہیں کھولنے کا کام بھی اُس کے ذمے ہے۔ ایسے بہت سارے سوالات پڑھنے والوں کے ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ بعض اہم عصر رسائل میں فی زمانہ جو تبصرے شائع ہوتے ہیں، اُن کا نوے (۹۰) فی صد حصّہ تعارف اور کوائفِ ظاہری کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ پچھلی دہائی سے ایک نئی بدعت یہ بھی شروع ہوئی ہے کہ بعض اہم رسائل نوآموز یا مبتدی اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اُنھیں تبصروں کے لیے کتابیں فراہم کرتے ہیں اور اُن کے کچے پکّے تبصرے شائع کر کے اپنی ادارتی ذمے داریوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ مبصرین کا ایک حلقہ ایسا بھی ہے جو کتابوں کی فہرست اور مقدّمے یا ڈسٹ کور (Dust Cover) پر شائع شدہ تاثرات سے کام کی بات اخذ کر کے تبصرہ نگاری کے فرائض سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے جس پر رضا نقوی واہی نے کبھی یوں پھبتی کسی تھی: ''پڑھ کے لکھا تو تبصرہ کیسا؟''

انگریزی اخبارات اور رسائل یا جرنلس (Journals) میں تبصروں کا کالم ملاحظہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ وہاں اکثر و بیشتر کتابوں پر تبصرے ان موضوعات کے ماہرین کیا کرتے ہیں۔ ان رسائل میں کسی نوآموز کو جانے سمجھے بغیر کسی مصنف کی برسوں کی جاں سوزی کے احتساب کی چلتے پھرتے ذمے داری نہیں سونپ دی جاتی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے جب 'آگ کا دریا' کا انگریزی ترجمہ شائع کرایا، اس وقت 'انڈیا ٹوڈے' (India Today) نے اس کتاب پر خوش ونت سنگھ کا تفصیلی جائزہ شائع کیا۔ مبصرین سے بے اطمینانی ہی ہوگی کہ پاکستان میں عبداللہ حسین نے جب 'نادار لوگ' ناول شائع کیا تو پیش لفظ میں یہ گزارش بھی کی کہ مبصرین حضرات براہ کرم چھے ماہ تک اس کتاب پر تبصرہ نہ کریں اور ان کے قارئین کو آزادانہ طور پر رائے قائم کرنے کا موقع دیں۔ ایک عہد ساز مصنف کی مبصرین کے سلسلے سے

اس تاثر سے اتنا تو ثابت ہی ہے کہ کتاب لکھنے والے مبصرین کے کاموں سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہیں۔ عبداللہ حسین نے یہ بات لکھ دی تھی، دوسرے اپنی کتابوں پر تبصرے دیکھ کر آہ سرد کھینچنے کو مجبور ہیں اور خاموش رہ جاتے ہیں۔

اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک بالیدہ روایت رہی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے اس فن کی نہایت ٹھوس بنیادیں رکھی تھیں۔ حالی، شبلی، ذکاء اللہ نے احتساب کی ایک مستقل روایت قائم کی۔ 'آبِ حیات' جیسی عظیم کتاب کا سرسید، حالی اور ذکاء اللہ سب نے علمی طور پر جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ نذیر احمد کے خطوط شائع ہوئے تو محمد حسین آزاد نے ان پر تنقیدی رائے پیش کی۔ مولوی عبدالحق، عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی نے ہماری زبان میں تبصرہ نگاری کو باضابطگی عطا کی۔ رفتہ رفتہ تبصرے اچھے خاصے عالمانہ اور حکیمانہ رنگ کے بھی سامنے آنے لگے۔ قاضی عبدالودود نے ابتدا میں تو مختصر تبصرے لکھے لیکن وہ زمانہ بھی آیا جب اُن کے تبصرے پانچ اور سات قسطوں میں رسائل میں شائع ہوئے اور چالیس پچاس صفحات سے لے کر ڈیڑھ دو سو صفحات تک پھیلتے چلے گئے۔ لیکن وہ سب تھے تبصرے اور مبصر کے دائرۂ کار کو سمجھتے ہوئے لکھے گئے تھے۔ پچھلے تیس چالیس برسوں کے دورانیے کو نگاہ میں رکھیں تو رشید حسن خاں اور ظ۔ انصاری بہ حیثیت مبصر اُبھر کر سامنے آئے۔ قاضی عبدالودود نے سخت گیری کا جو طور سکھایا تھا، ان اصحاب نے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دوٹوک، بے لاگ اور ظ۔ انصاری نے 'شوخ' تبصروں کی روایت قائم کی۔

مذکورہ تمام اصحاب میں ایک بات لازماً موجود تھی کہ وہ کتاب کے متن اور اس کی جہات پر قدرت رکھتے تھے اور ایک ایک لفظ اور بین السطور کے مفاہیم متعین کرنے کے اہل تھے۔ دس جملے میں لکھیں یا سو صفحات رقم کریں، ہر جگہ اُن کی مہارت اور قدرت اپنے آپ ظاہر ہو جاتی تھی۔ آج اکثر رسائل میں شائع ہونے والے تبصروں کے بارے میں ایسی باتیں یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیش تر رسائل یا مصنفین کتابوں کے آزادانہ اور ماہرانہ احتساب یا جانچ پرکھ سے احتراز کرتے ہیں۔ شاید وہ تعریف و توصیف سے بڑھ کر کتابوں کے جائزے کے لیے آمادہ نہیں۔ ادب کی داخلی جمہوریت کے لیے یہ واقعتاً خطرے کا نشان ہے۔

میرے لیے یہ کہنا مناسب نہیں کہ اس کتاب میں پیش کیے جانے والے تبصرے ہماری زبان کے جیالے مبصرین کے سلسلے میں شامل ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ادب کے مطالعے کے دوران مذکورہ افراد ہمارے لیے مثالی کردار کے بہ طور رہنما رہے ہیں۔ تبصرے کی تحریر و ترتیب کے دوران مبصر اُن کے جیسا بننا تو ضرور چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس مرحلے میں میرے ہاتھ میں ریت ہی آئی ہوگی لیکن اس بات کا اطمینان ہے کہ یہ ریت اپنے اسلاف کی تحریروں کو ذہن نشیں کرنے کے دوران بہ طور انعام حاصل ہوئی ہے۔ اسے متاعِ فقیر سمجھ کر میں خوش ہوں۔

یہ تبصرے فرمائشی نہیں ہیں۔ ذہن کو گرفت میں لینے میں جو کتابیں کامیاب رہیں، اُنھی پر کچھ آڑی ترچھی

لکیریں کھینچ دی گئیں۔ اس معاملے میں تازہ ترین کتابیں تو پیشِ نظر رہیں ہی لیکن کچھ پُرانی کتابیں بھی ہاتھ آگئیں۔ مطالعے کا عمل میکانکی نہیں ہوتا، اس لیے نئے پرانے کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی۔ اتنی کوشش ضرور کی گئی ہے کہ تبصرے میں کتاب آئینہ ہوجائے۔ کوئی یہ سوال نہ کر سکے کہ مبصر نے کتاب کو آدھے ادھورے یا سرسری طور پر نمٹا دیا اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ درست نہیں ہے یا اس کے لیے وافر مقدار میں دلیلیں نہیں پیش کی گئی ہیں۔ ان تبصروں میں یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی مجموعی ادبی حیثیت اور فکر و نظر کے بارے میں بھی کچھ اشارے لازمی طور پر پیش کر دیے جائیں چہ جائے کہ گفتگو کسی ایک ہی کتاب پر مرکوز کیوں نہ ہو۔ بعض افراد اسے تبصرہ نگاری سے مختلف کام قرار دیتے ہوں گے لیکن مجھے کسی کتاب کو پڑھتے اور سمجھتے ہوئے ہمیشہ اُس مصنف کو پورے طور پر غور و فکر کا محور بنانے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کتاب کے اکثر تبصرے شاید اس کا ثبوت فراہم کریں۔

جانچ پرکھ اور احتساب کا کام دو دھاری تلوار کا سفر ہے۔ اسی لیے ساری باتیں دل پسند نہیں ہو سکتیں۔ بزرگوں کے بارے میں بھی کبھی کبھی وہ لکھنا پڑتا ہے جو ناپسندیدہ ہو لیکن ایمان اور انصاف کے ساتھ قلم کا رشتہ مستحکم ہو، اس کے لیے یہ تردد، تکلف یا بدنامی برداشت کرنے میں بھی مجھے کوئی افسوس نہیں۔ یوں بھی قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، رشید حسن خاں اور ظ۔ انصاری کی تحریروں کے زیرِ سایہ ہماری تربیت کچھ ایسی ہوئی کہ صاف اور دو ٹوک انداز میں بغیر کسی مصلحت کے اپنی بات کہنے سے گریز کرنا ہمیشہ نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب میں جو پُرانے مضامین شامل ہیں، اُن پر نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ گیارہ تبصرے پچھلے دو برسوں میں عظیم آباد کے معتبر جریدے سہ ماہی 'آمد' میں شائع ہو چکے ہیں جس کے لیے 'آمد' کے مدیرِ اعزازی معتبر شاعر خورشید اکبر کا شکریہ واجب ہے۔ بہت سارے لکھنے والوں نے ان تبصروں کو پسند کیا یا علمی اعتبار سے انھیں قابلِ قبول سمجھا۔ میں اُن تمام کا شکر گزار ہوں۔ حلقۂ احباب میں ظفر کمالی اور واحد نظیر اس مسودے کی اشاعت کے لیے متواتر اصرار کرتے رہے۔ خورشید اکبر، ظفر کمالی اور واحد نظیر سے تعلق کی تین دہائیاں گزر چکیں۔ خدا سے یہی دعا ہوگی کہ محبت کا یہ رشتہ اور علم دوستی کا بندھن زندگی کی سانسیں اُکھڑنے تک قائم رہے۔ عبدالرشید اور جمشید قمر صاحبان نے جو تقاضا کیا کہ یہ اور دوسری کتابیں بھی لازمی طور پر آ جانی چاہییں۔ اُن کی محبت نے مجھے خوابِ غفلت سے جگایا۔

اس کتاب کے بہت سارے مضامین میں نے اپنے بعض عزیز طلبہ کو املا کرائے ہیں۔ نازیہ امام، محمد ولی اللہ قادری، محمد امین، جاوید اقبال، تسنیم فاطمہ، نازیہ امان، تسلیم عارف، منصور فریدی، الفیہ نوری، رحمت یونس، نشاط فاطمہ، شکیب ایاز وغیرہ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کیوں کہ انھی کے لکھے حروف سے میرے اکثر مضامین تیار ہوئے۔ ان مضامین کی کمپوزنگ میں شجاع الزماں تحفے نے سب سے زیادہ مشقت کی ہے۔ افشاں بانو، تسلیم عارف، رہبر مصباحی،

اشتیاق اور مجاہد الاسلام صاحبان نے بھی چند صفحات کی کمپوز کتابت کی اور پروف کی اصلاح میں پریشان ہوئے۔ اب عرشیہ پبلی کیشنز کے مالک و مختار عزیزی ڈاکٹر اظہار احمد ندیم کے سپرد یہ کتاب کرتا ہوں کیوں کہ کتاب چھاپنے میں اب وہ صاحب اسلوب نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کا انتساب میں نے اردو کے اپنے پہلے استاد مولانا علی الیاس عاجز کے نام کیا ہے۔ مولانا نے کلاس روم میں ہمیں کبھی نہیں پڑھایا لیکن ساتویں، آٹھویں جماعت سے غیر رسمی طور پر اُن کے ذریعے تعلیم کا جو سلسلہ شروع ہوا؛ ایسا لگتا ہے، اُسی طاقت کی بدولت میں آج بھی کھڑا ہوں۔ مولانا الیاس نے میرے ذہن کو تنقید و تحقیق کے پُرزوں سے لیس کرنے کی ۱۹۷۵-۷۶ء کے زمانے میں جو کوششیں شروع کی تھیں، اس کے نتائج بہر صورت سامنے آئیں گے۔ یہ ٹوٹے پھوٹے لفظ اُنھی کے قدموں میں حاضر کرتا ہوں۔ اُن کے جیسا پڑھنے، لکھنے اور پڑھانے والا اُستاد میں نے آج تک کسی دوسرے کو نہیں پایا۔ آج وہ پرائمری اسکول سے سبک دوش ہو کر تصنیف و تالیف اور مطالعے کے کُل وقتی مشغلے میں منہمک ہیں۔ انھوں نے ہی ہمیں سب سے پہلے یہ بتایا تھا کہ کتابوں میں بھی زبان و بیان اور نفسِ مضمون کی غلطیاں ہوتی ہیں، اس لیے مطالعے کے دوران اس حقیقت پہ نظر ہونی چاہیے۔ میری زندگی میں تنقید کا وہ پہلا بنیادی سبق تھا جو ہمیشہ کے لیے ذہن پر نقش ہوگیا۔ خدا انھیں صحت و تندرستی کے ساتھ درازیِ عمر عطا کرے۔ آمین۔

'نئی پرانی کتابیں' سامنے نہیں آتی اگر میری شاگرد عزیز محترمہ الفیہ نوری ان بکھرے مضامین کو رسائل کے اوراق سے تلاش و جستجو کے بعد جمع کر کے کمپوزنگ کے عمل میں مستعد نہ ہوتیں۔ انھوں نے پروف خوانی میں بھی جاں فشانی سے مقدور بھر گریز نہیں کیا۔ ترتیب و تدوین کی ذمے داری انھی کی تھی۔ صفحات کی تنگ دامانی اور بر وقت اشاعت کا جبر ایسے اسباب رہے جن سے اُن کا تفصیلی مقدمہ اس کتاب میں شامل نہیں ہو سکا۔ کتاب پڑھنے والے اپنی آزادانہ رائے قائم کریں، اس لیے کسی تفصیلی تنقیدی تاثر سے گریز کیا گیا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے جو دعائیہ تاثر عطا کیے، اس کے لیے میں خاص طور سے اُن کا شکر گزار ہوں۔ ظفر کمالی نے اپنی محبت رباعیوں کی شکل میں بھی عنایت کی، انھیں کتاب کے فلیپ پر سجادیا گیا ہے۔ واحد نظیر نے قطعۂ تاریخ کے ساتھ کتاب کے سرنامے کی کتابت کر کے جاذبیت میں اضافہ کیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۱۸/ جولائی ۲۰۱۳ء

صفدر امام قادری

تحقیق

ہندستانی سماج پر اسلامی اثر

پروفیسر محمد مجیب کی انگریزی کتاب کے ترجمے کا جائزہ

اردو اور انگریزی کے ممتاز مترجم اور نقاد پروفیسر محمد ذاکر کی تازہ مترجمہ کتاب 'ہندستانی سماج پر اسلامی اثر اور دوسرے مضامین' معتبر مورخ اور دانش ور پروفیسر محمد مجیب کے ۱۶ انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ ہے۔ مجیب صاحب گاہے بہ گاہے اردو میں بھی لکھتے رہے اور آخری زمانے میں تو ''کتاب نما'' میں انگریزی نظموں کے اُن کے تراجم اصل متن کے ساتھ بھی شائع ہوتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارکانِ ثلاثہ ذاکر حسین، سید عابد حسین اور محمد مجیب؛ سب کے سب انگریزی داں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان کے شیدائی رہے۔ سب دونوں زبانوں میں صاحب اسلوب مانے گئے۔ ہندستان کی قومی تحریک کے جاں نثاروں کی یہ کھیپ ایک ساتھ ہندستان کی متوقع صورت کے نقش ونگار تلاش کرنے میں لگی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کی تاریخ، تہذیب کی تشکیل اور ارتقا کے جانے اَن جانے پہلوؤں پر غور وفکر کرنا اور نئے حالات یا تقاضوں کے تحت اُن کا تجزیہ کرنا اس کا شیوۂ علمی بن گیا۔ اسی لیے یہ سب جدید ہندستان کی تعمیر کے لیے علمی ستون بن کر اُبھرے۔ سب نے تصنیف وتالیف کو اپنی زندگی کا محور بنایا اور اپنی سماجی، سیاسی یا انتظامی مصروفیات کے باوجود زندگی کے کسی بھی موڑ پر اپنی علمی سرگرمیوں سے غافل نہیں ہوئے۔ ان کی کتابوں اور مضامین کو ایک بڑے حلقے نے آنکھوں سے لگایا اور دلوں میں بسایا۔ ان کی فکر کا مرکز بہر صورت ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ اور مستقبل قرار پایا۔

منجملہ اور اوصاف کے، محمد مجیب کی دانش ورانہ بصیرت ان کی مشہور زمانہ کتاب 'ہندستانی مسلمان' (The Indian Muslims) میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی مؤرخانہ اور دانش ورانہ حیثیت کے سبھی قائل رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ دیگر موضوعات پر وقتاً فوقتاً محمد مجیب نے بعض نہایت ہی فکر انگیز اور عالمانہ مضامین قلم بند کیے۔ ایسے منتخب مضامین پہلی بار محمد ذاکر کی ترجمہ نگاری کے طفیل اس کتاب میں جلد بند ہو کر اردو زبان میں

سامنے آئے ہیں۔ مضامین کثیر الجہات ہیں اور بہت سارے علوم وفنون کی راہیں اس مختصر سی کتاب سے نکلتی ہیں لیکن مصنف اور مترجم نے جس مضمون کو سرنامہ بنایا، وہ اس کتاب کی رگوں میں دوڑنے والا خون ہے۔ یعنی بات امراؤ جان ادا کی ہو یا جبہ خاتون کی، لال قلعہ زیرِ بحث ہو یا فارسی عربی رسم الخط، گرونانک ہوں یا مہاتما گاندھی ——— ہر جگہ ہندستانی سماج پر اسلام کے اثرات کی جانچ پرکھ اور تجزیہ وتفہیم کی کوئی نئی جہت آشکار ہو رہی ہے۔ مترجم نے یہ اچھا کیا کہ اس کتاب میں محمد مجیب کے باغ سے رنگ برنگے پھولوں کو اپنے گلدستے میں ضرور سجایا لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان پھولوں کی خوشبو میں ایک سبک خرامی اور ہمواری ہو۔ یہاں مترجم مصوّر بن گیا ہے اور کینوس پر رنگوں کا خلفشار پیدا کر کے آنکھوں کو چوندھیانے کے بجائے ایک رنگ سے دوسرے رنگ کی محفل میں ایسی نرم روی کے ساتھ ہمیں لے آتا ہے جیسے خوابوں کی کوئی لطیف چادر اڑھا دی گئی ہو۔

اس کتاب میں 'تعارف' عنوان سے محمد مجیب کا جو مضمون شامل ہے، وہ پوری کتاب کا نچوڑ ہے۔ آج اکثر و بیشتر ایسی کتابیں لکھی جاتی ہیں جن کے مصنفین کے ذہن میں اپنے موضوع کے بارے میں کوئی شفاف تصور نہیں ہوتا اور نہ ہی انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تجزیے کی کشتی کس ساحل پر لگے گی یا کس بھنور میں ہچکولے کھاتی رہے گی۔ انھیں اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ٹھیک ٹھیک پتا نہیں ہوتا، صرف غرور، بے جا کا دھواں اُن کے اردگرد پھیلا ہوتا ہے۔ محمد مجیب ہمارے معتبر اور عظیم لکھنے والے افراد کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۴ صفحے کے اس 'تعارف' میں کتاب کے مشتملات پر محمد مجیب نے تین چار سطریں لکھی ہیں لیکن اس کے بعد ہندستان کی تعمیر وتشکیل، عہدِ قدیم سے ہمارے زمانے کے احوال، حکومتوں، زبانوں اور مذاہب کی سماج بنانے میں خدمات اور ان سب سے بڑھ کر ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے نئی تہذیبی تبدیلیوں کے آثار ——— ان پہلوؤں پر محمد مجیب نے کچھ اس انداز سے جملے رقم کیے ہیں کہ مذہبی صحائف یا اقوالِ زرّیں جیسی زبان پیدا ہوگئی ہے۔ یہ ناقابلِ یقین ہے اور حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں کہ ۸۰۰ سے زیادہ برسوں کی اُتھل پتھل کی کہانی بارہ چودہ صفحے میں اس طرح سے قید ہوگئی ہے کہ آپ اس کے سیاہ وسفید ہر پہلو کو دیکھ لیتے ہیں۔ موضوع پر حیرت انگیز گرفت، ذاتی مشاہدے کی صلابت اور فکر کی ایسی اُپج ہے کہ ہمارے بالکل پاس سے ایسی کوئی مثال پیش کر دی جائے گی جسے ہم تو پیچ سمجھ رہے تھے لیکن محمد مجیب نے اسے ہند اسلامی تاریخ کا ستونِ نو بنا دیا۔ اس مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(i) ''ساتویں صدی کے وسط میں مسلمان عربوں نے ساسانیوں کا تختہ الٹ دیا تو انھوں نے جنوبی ہند، سیلون یعنی لنکا اور مشرق کی طرف مرچ مصالحے اور دوسری اور چیزوں کی تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جنوبی عراق کا شہر بصرہ ایک تجارتی منڈی بن گیا، ایسا مرکز Extrepot جہاں مال آتا بھی تھا اور جاتا بھی تھا۔ اس راستے پر سمندری ڈاکو برابر لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور اصل میں اس تجارتی راستے کے تحفظ کے لیے ہی عربوں نے سندھ کو ۱۲-۷۱۱ء میں فتح کیا تھا۔'' (ص-۱۴)

(ii) ''عرب اسلام کو خاص اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ اُن ایرانیوں کو جو اسلام قبول کر لیتے تھے، بہت مشکل سے مذہبی حیثیت ملتی تھی۔ وہ بھی جب، جب وہ عرب خاندانوں یا قبیلوں کے موکل بن جاتے تھے کیوں کہ مذہب کی تبدیلی کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان لوگوں (یعنی نومسلموں) کی تعداد میں اضافہ ہوجائے گا جو سیاسی معاملات میں دخل دینے پر اصرار کریں گے اور عربوں کی (سیاسی طاقت یا) اجارہ داری اور ان کے حق حکومت کے خلاف جنگ کریں گے۔'' (ص:۱۵)

(iii) ''ہر صاحبِ استطاعت مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اسے اس کی مہمان نوازی اور فیاضی کی وجہ سے جانیں۔ ان احکام کے پیچھے جو اخلاقی اصول تھے، وہ نمود و نمائش کے جوش میں پس پشت جا پڑے تھے اور ان کے مالی اثرات کچھ باتوں کے اعتبار سے اعلا طبقے کے لیے تباہ کن ہوتے تھے۔'' (ص:۱۸)

(iv) ''اسراف (یا خرچ بے جا) کی طرف مسلمانوں کا رجحان بے شک سادہ زندگی کے نصب العین کی نفی تھی۔'' (ص:۱۹)

(v) ''ہندوؤں کا مذہبی رجحان شہر سازی کے خلاف رہا ہے اور مسلمانوں کا شدت سے شہر سازی کی طرف۔ مسلمانوں کی حکومت کے دور میں شہروں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور وہ بہت بڑے بڑے بھی ہو گئے لیکن ...... کسی میں بھی نہ تو مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ تھی، نہ وہ اقتصادی اعتبار سے زیادہ خوش حال

تھے۔" (ص:۳۰)

(vi) "شہر سازی کو اس طرح ہندستانی زندگی کو مسلمانوں کی ایک دین کہا جا سکتا ہے۔" (ص:۳۰)

(vii) "مسلمانوں کے ہاتھوں جو تبدیلی اس فنِ تعمیر میں ہوئی، وہ یہ تھی کہ اس میں سنگ تراشی اور بُت تراشی کی بہ جائے عمارت سازی کی کیفیت آگئی اور ساخت کے اعتبار سے اس میں عمودیت کی بہ جائے اُفقیت آگئی۔" (ص:۳۰)

(viii) "شمالی ہند کی بولیاں سنسکرت اور برہموں کے غلبے سے آزاد ہوگئیں۔" (ص:۳۳)

ان اقتباسات سے یہ بات پہلی نظر میں ہی سمجھ میں آجاتی ہے کہ محمد مجیب کے تجزیے میں کیسی جہاں بینی اور گہرائی ہے۔ نقطۂ نظر اس حد تک معروضی اور غیر جانب دارانہ ہے جیسے علمی اعتبار سے کوئی مثالی صورتِ حال سامنے آرہی ہو۔ تاریخی حقائق کا ایسا دانش ورانہ اور بے لاگ تجزیہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ چند جملوں میں ہماری آنکھوں کے سامنے آٹھ سو برسوں سے زیادہ کے واقعات اور ان کے پیچھے کارفرما عوامل متحرک فلم کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔ اس تعارف میں محمد مجیب نے کچھ بڑے تاریخی حقائق بھی پیش کردیے ہیں:

(الف) عربوں نے سندھ پر حملہ خالص تجارتی غرض وغایت سے کیا تھا۔

(ب) ایرانیوں کے اسلام قبول کرنے کے باوجود عرب افراد ان کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔

(ج) فیاضی اور فضول خرچی نے مسلمانوں سے سادہ زندگی کے نصب العین کو چھین لیا۔

(د) شہر سازی کو ہندستان میں مسلمانوں کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔

(ہ) شمالی ہندستان کی بولیوں کو آزادانہ ترقی حاصل ہونے کے امکانات مسلمانوں کی آمد سے پیدا ہوئے۔

اس کتاب کے سرنامے کا مضمون چھے صفحے سے کم پر مشتمل ہے لیکن مکمل کتابوں سے جتنی معلومات یا بھرپور مطالعے کی توقع کی جاتی ہے، وہ اس مختصر نوشتے میں موجود ہے۔ ہندستانی سماج پر اسلامی اثر کن کن

پہلوؤں سے واضح ہوتا ہے۔اس کی تحقیق کے نتائج محمد مجیب نے اس طرح پیش کیے ہیں:

(۱) مذہب عوام الناس تک پہنچ گیا۔

(۲) محض بولی جانے والی زبانیں (یعنی بولیاں) زبانیں بن گئیں۔

(۳) شہر تہذیب کا مرکز بن گئے۔

(۴) سلے ہوئے کپڑوں کا رواج عام ہوا۔

(۵) روزانہ استعمال کی چیزوں کی بہتات ہوگئی جس کی وجہ سے سادگی رخصت ہوئی اور زندگی پُر لطف اور پیچیدہ ہوگئی۔

(۶) معاشرتی آداب تسلیم شدہ قانون بن گئے۔

کہنے کو یہ محض چھے باتیں ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ سات سو برس کے امتزاج واشتراک کی حصول یابی یہاں ان لفظوں میں سمٹ کر چلی آئی ہے۔اس مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دور کی کوڑی لا کر فلسفہ طرازی یا مبہوت کردینے والی حقیقت کی پیش کش سے رعب قائم کرنے کے بہ جائے سامنے کی سچائیوں اور مشاہدے اور تجربے کے بطن سے اُبھر کر آنے والی حقیقی باتوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔مزاج کا رُخ اس قدر معروضی ہے کہ باتیں کہتے وقت اس امر کا قطعی خیال نہیں رکھا گیا ہے کہ اس کے سماجی یا سیاسی اثرات کسی کے لیے ناپسندیدہ تو نہیں ہوں گے۔محمد مجیب کا حقائق کی پڑتال کا انداز اچھا خاصا محققانہ ہے۔اسی لیے نتائج کی پیچیدگی سے وہ باخبر ہیں اور اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے:"جہاں حقیقت پیچیدہ ہو اور پیچیدگی کی وجہ سے زیادہ دلکش ہو جائے، وہاں ہمیں معاملات کو سادہ اور آسان بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے"۔ (ص:۲۹) تاریخی اور سماجی مطالعے کا یہ ایسا زریں اصول ہے جسے محمد مجیب نے اس کتاب کے ہر مضمون میں استعمال کیا ہے۔

تصوف کے سلسلے سے اس کتاب میں دو مضامین شامل ہیں۔دونوں کا تناظر عالمی ہے۔تصوف کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جب صوفیوں کی دو اقسام 'ارباب ہوش' اور 'اصحاب سُکر' کا وہ ذکر کرتے ہیں تو سرسری طور پر نتیجہ نکالنے کے بجائے محمد مجیب کا کہنا ہے:"اس طرح صوفی ازم یعنی تصوف کی وضاحت کرنی مشکل ہو جاتی ہے؛ (لیکن) یہ بات صوفی (کی شخصیت) کو اور زیادہ، اور زیادہ دلکش بنا دیتی ہے"۔ (ص:۳۶) صوفیوں نے کس طرح شاعری کو مسلمانوں کے درمیان ایک کارآمد شے کے طور پر پیش کیا،اس موضوع پر روی

کے حوالے سے محمد مجیب کیسی خدا لگتی کہہ گئے ہیں، ملاحظہ کیجیے: ''تصوف اور شاعری کے اس میل سے تہذیبی اعتبار سے کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں، اس سے آدمی میں وہ جرأت ضرور پیدا ہوگئی جس نے اسے خدا سے ہم کلام کردیا۔'' (ص:۳۷) تصوف کے سلسلے سے محمد مجیب کے نتائج عالمانہ تو ہیں ہی لیکن پیش کش کا انداز ایسا سادہ اور موثر ہے جس سے یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کتنی گہری اور پُر مغز باتیں کہی جارہی ہیں۔ تین مختصر اقتباسات ملاحظہ کریں:

(۱) ''مسلم تہذیب میں محبت، محبوب، وصل، مے اور نغمہ، اسلام اور کفر، کعبے اور بت خانے کو علامتیں کہہ کر ان دونوں رویوں میں باہمی مطابقت پیدا کرلی گئی۔'' (ص:۳۷)

(۲) ''صوفی ازم یا تصوف صدیوں سے مسلمانوں میں دانش وری کا ایک فیشن تھا۔ جس طرح سیکولرازم غیر مذہبی ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مجبوری آن پڑے تو مذہب کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، اسی طرح تصوف بھی اگرچہ راسخ الاعتقادی نہیں ہوتا تھا (غیر تقلیدی ہوتا تھا) لیکن وہ راسخ الاعتقادی کا مخالف بن سکتا تھا''۔ (ص۔۴۲)

(۳) ''اپنے عروج کے زمانے میں تصوف یقیناً اندھی تقلید، سماجی ناانصافی اور فرد کے جذبات کو کچل دینے کے خلاف واقعی بغاوت کی علامت بن گیا تھا۔'' (ص:۴۳)

یہ اقتباسات پروفیسر محمد مجیب کے تجزیے کی گہرائی کا مظہر ہیں۔ یہاں تصوف زندگی اور سماج سے الگ تھلگ کوئی فکری دھارا نہیں ہے بلکہ تاریخ کی کروٹوں میں انسانی زندگی کا ایسا ساتھی ہے جس کے ارتقا میں اونچ نیچ اور اتھل پتھل کے بہت سارے سلسلے موجود ہیں۔ اسی لیے محمد مجیب کا تجزیہ وسیع تر تناظر میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ صرف تاریخ کے طالب علم یا صرف تصوف کے رمز آشنا سے ممکن نہیں تھا۔ محمد مجیب کا ذہنی سانچہ اس قدر سائنٹفک ہے کہ یہ مذہب، مسلک، علاقائیت، قومیت اور نہ جانے کتنی دیواریں توڑ کر ایک آزاد اور مکمل شہری کی تلاش کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ''ہندستانی مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح کے تصورات اور تحریکیں'' ہے جو ۳۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں تاریخی تناظر تو ہے لیکن پچھلی دو صدیوں کے احوال زیادہ تفصیل سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں تحریکِ آزادی کے مجاہدین، ایسے مصلحین جن کے تعلق سے متعدد اختلافات بھی قائم ہوئے اور ملک کے قوانین سے مسلمانوں کا تعلق وغیرہ سب باتیں زیرِ بحث ہیں۔ اس

مضمون کا وہ انداز ہرگز نہیں ہے جہاں اجمال حُسن ہے اور جن مضامین میں محمد مجیب ایک ایک جملے میں بڑے حقائق سمو دیتے ہیں۔ یہاں صراحت اور تفصیل کا راستہ چُنا گیا ہے۔ سرسید کے تعلق سے محمد مجیب نے تقریباً تین صفحات لکھے ہیں لیکن یہاں تجزیے میں محمد مجیب کا دانش ورانہ آہنگ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ سرسید پر مختلف انداز کی تحریروں کی کمی نہیں، اس کے باوجود یہ تین صفحات صاف گوئی کے ساتھ تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی ایک دوٹوک مہم ہیں۔ اسی لیے سرسید کی تاریخی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ان کے نکتہ چینوں کی سنجیدہ باتوں اور سرسید کی ناکامیوں پر بھی مساوی طور پر توجہ دی گئی ہے۔

اس کتاب کے تین مختصر مضامین —— ''لال قلعہ''، ''فارسی عربی رسم الخط'' اور ''ادب میں ہندایرانی امتزاج'' نہ جانے کس عالم میں محمد مجیب کے قلم سے نکلے ہیں۔ زبان کی سطح پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ انشاپردازی میں شاعرانہ سحرکاری اس طرح سے بھر دی گئی ہے جیسے کوئی مشاق شاعر اپنی ایک طویل نظم سنا رہا ہے۔ مجھے پہلی نظر میں یہ شبہہ ہوا کہ کہیں مترجم نے اردو زبان کی عمومی شاعرانہ دل چسپیوں کو دورانِ ترجمہ اینڈیل کر تو نہیں رکھ دیا لیکن جیسے ہی انگریزی مضامین سے ان کا موازنہ کیا تو آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ محمد مجیب کے پاس زبان کا کیسا جادو ہے کہ انگریزی لکھتے ہوئے اردو شاعری یا تہذیب کی لطافتوں کو انگریزی انشاپردازی کا کامیابی کے ساتھ حصّہ بنا دیتے ہیں۔ کسی پڑھنے والے کو یقین نہ آئے تو اسے محمد مجیب کے اس ترجمے سے جستہ جستہ ربط رکھنا چاہیے تاکہ تخیل، شاعرانہ اظہار اور ایک مورخ کی اسلوبیاتی قدرت کا پتا چل جائے؟ ان مضامین سے چند مختصر اقتباسات قابلِ توجہ ہیں:

(۱) ''کسی چیز پر اتنی اُداسی نہیں برستی جتنی کسی ایسے مکان پر جس میں رہتا تو کوئی نہیں لیکن لوگ اسے دیکھنے چلے آتے ہیں۔ کسی ایسے محل کی اُداسی جو یادگار بن کر رہ گیا ہو، چاہے قومی یادگار سہی، اتنی ہی زیادہ یا کم ہوتی ہے جتنی کہ کسی زمانے میں اس کی شان و شوکت رہی ہو۔'' (ص:۹۱)

(۲) ''لیکن قلعے کا دروازہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے جیسے وفادار رعایا کو دعوت دے رہا ہے کہ آؤ اور اپنے بادشاہ کے سامنے آداب بجا لاؤ، بجائے اس کے کہ یہ معلوم ہو کہ جیسے وہ اصلی دشمنوں کو یا اُن لوگوں کو جو دشمن بن سکتے ہوں، ایک خطرہ معلوم ہو۔'' (ص:۹۳)

(۳) ''لال قلعے کے عین دنیوی شان و شوکت میں اورنگ زیب نے ایک واقعی

موتی کی سی مسجد بنوادی۔ گویا یہ جتانے کے لیے کہ جب اُس کے چاروں طرف لوگ دنیوی شان وشوکت اور طاقت کی پوجا کر رہے ہوں تو وہ خدا سے لَو لگا سکتا تھا۔" (ص:۹۶)

(۴) "جب مجھے اردو کے حروفِ تہجی سکھائے جا رہے تھے تو مجھے بدنویسی یا خراب لکھنے پر سزا ملتی تھی۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے صرف بے پروائی یا نالائقی کی سزا نہیں ملی تھی بلکہ تہذیب کی میں نے پوری طرح عزت نہیں کی تھی، اس کی سزا ملی تھی۔" (ص:۱۰۰)

(۵) "مجھے نہیں معلوم پہلی ایرانی بلبل گلاب کے عشق میں اپنی بھرپور آواز میں کب نغمہ بار ہوئی۔" (ص:۱۰۵)

(۶) "میرے خیال میں سوائے فارسی ادب کے اور کسی ادب میں کوئی ایسا تمثیلی پیکر نہیں ہے جو اِس درجے دال روٹی کی طرح عام بھی ہو اور شاعروں کے لیے ایسا بھی جیسے جنت کا میوہ، جو سامنے کی حقیقت بھی ہو اور ادب کے شائقین کے لیے انتہائی انوکھی بات بھی۔ فارسی شاعری میں اور خیالی پیکر یا امیج بھی ہیں، ایسے ہی مثالی جیسے گُل کے عشق میں مبتلا بلبل؛ مثلاً جام، ساقی، مے، نشہ، اور ان سب کی اصل و سرچشمہ محبوب۔" (ص:۱۰۵)

(۷) "یہ تھے وہ لوگ جو بلبل اور گلاب کی کہانی، جام، ساقی اور شراب کی پیکریت یا امیجری ہندستان میں لائے۔ وہ راسخ الاعتقادی کے سخت اور پریشان کرنے والے دشمن ہی نہیں تھے، وہ عالمِ دینیات کی باریک نقاب میں چھپی ہوئی منافقت کے مقابلے میں قانون (شرع) سے وابستگی کا زیادہ مخلصانہ اور دلی اظہار کرتے تھے۔" (ص:۱۰۹)

یہ کتاب صرف متفرق مضامین کا مجموعہ نہیں ہے۔ بیسویں صدی میں جس دانش ورانہ فکر کا ارتقا قومی تحریک اور آزادی کے بعد ملک کی صالح تعمیر کے دوران ہوا، اسی فکر کے کچھ گُل بوٹے اس کتاب کی زینت ہیں۔ اردو میں ایسے لکھنے والے پچھلے زمانے میں کم نہیں تھے جن کے اندر طرح طرح کے تصورات اور قومی مسائل کے حل کے لیے نئی نئی کونپلیں پھوٹتی رہتی تھیں۔ اردو نثر کے دامن میں

ابتدائی عہد سے ایسے بہت سارے ہنروران دکھائی دیتے ہیں۔ آج سے چار صدی پہلے کی تصنیف ''سب رس'' کو کیا دانش ورانہ نثر کا نمونہ نہیں کہہ سکتے؟ انیسویں صدی میں غالب، اس کے بعد سرسید اور ان کے رفقا نے اردو نثر میں گوناگوں قومی مسائل کو پیوست کرنے کا ایسا سلیقہ آزمایا جس کے نتیجے میں ہماری زبان اور اس کے بولنے والوں میں فکر و فلسفہ کی ایک چاٹ سی لگ گئی۔ شعر فہمی، صوفیانہ موشگافیاں اور پھر زبان اور قوم کے معاملات و مسائل۔ سب میں ہمارے اسلاف کی برابر دل چسپیاں رہیں۔ 'غبارِ خاطر' پڑھتے ہوئے بعض لوگ کبیدہ خاطر ہوتے ہیں کہ یہ کتاب رہ رہ کر اتنے دقیق علمی مسائل کی سُرنگ میں کیوں چلی جاتی ہے؟ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ فکر و فلسفہ ہماری زبان اور اس کے بولنے والوں کی شریانوں میں دوڑتا ہوا لہو ہے۔

محمد مجیب کی کتاب اسلامیانِ ہند کی اسی فکری جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ بھلے یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی لیکن لکھنے والے کی مادری زبان اردو ہی ہے۔ کتاب کے مشتملات پر غور کریں تو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اردو تہذیب کا پروردہ شخص ہی ایسی کتاب اور ایسے مضامین لکھ سکتا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کے ایک ایک صفحے پر ہمارا قومی تفکر، اختصاص و امتیاز جھلکتا ہے۔ یہاں لال قلعہ عمارت نہیں بلکہ ہندستان میں اسلامی تہذیب کا ایک مینارہ ہے اور عربی اور فارسی رسمِ خط سلیقہ مندی اور تہذیب کا عکس ہیں۔ محمد مجیب کی ہر تحریر میں اپنے قومی اوصاف اور مذہبی امتیازات کے نئے نئے پہلو تلاش کر کے پیش کرنے کی حیرت انگیز خوبی ملتی ہے۔

ہندستانی مسلمانوں کی بات کرتے ہوئے محمد مجیب ان کی مظلومیت کا استعارہ بن کر گلے شکوؤں کا پشتارہ نہیں قائم کر دیتے بلکہ ہندستانی سماج کی سانسوں اور دھڑکنوں سے ایسے پل ڈھونڈ کر نکالتے ہیں جب مذہب اسلام یا مسلمانوں نے اس ملک کی زندگی، تہذیب اور روح کو متوّر کیا تھا۔ یہ کام اتنے سلیقے، سپردگی اور انہماک کے ساتھ محمد مجیب نے انجام دیا ہے جس سے برادرانِ وطن کے آب گینوں کو ٹھیس بھی نہ لگے اور ہماری خدمات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائیں۔ تحریر میں ضبط کی ایسی قوت ہے کہ بادشاہت اور حکومتوں کے احوال بیان کرتے ہوئے غرور اور تمکنت کے چھینٹے بھی نہیں پڑتے۔

محمد مجیب کی یہ کتاب انتہائی توازن سے مذہبی، سماجی، سیاسی اور نہ جانے کتنے داخلی اور خارجی مسئلوں کو حل کرتی نظر آتی ہے۔ محمد مجیب دانش ور اور مورخ کے ساتھ ساتھ ایک نامور ڈراما نگار بھی ہیں۔ ان کی

نثر اختصار پسندی کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس زمانے میں ایسی نپی تلی زبان پر قدرت رکھنے والے شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اس زبان میں ایک وقار اور علمی شان کے آثار روشن ہوئے ہیں۔ بیان پر ایسی قدرت ہے کہ کہیں لکھنے والا بھٹکتا نہیں اور نہ ہی تاریخی احوال بتانے میں مثالوں کی بھیڑ کھڑی کر دیتا ہے۔ صاف ستھری اور بے لاگ زبان میں، ایک خاص دل نشینی کے ساتھ کام کی باتوں کی پیش کش محمد مجیب کا بڑا کارنامہ ہے۔

یہ کتاب انگریزی مضامین کا ترجمہ ہے۔ مترجم پروفیسر محمد ذاکر ہیں جو خود اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ لکھنے اور ترجمہ کرنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ آج ان کی عمر آٹھ دہائیاں پوری کر رہی ہے۔ خدا انھیں سو برس اور زندہ رکھے۔ آمین۔ ان کی مشق دو چار برس کی بات نہیں بلکہ نصف صدی سے زیادہ کا قصہ ہے۔ 'کلاسیکی غزل' اور 'نظیر کا آوازہ بلند' عنوان سے ان کی مختصر کتابوں کو پڑھنے کے بعد ان کی تنقیدی اور نثری صلاحیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ نپی تلی زبان لکھ سکتے ہیں اور ایک ایک لفظ کو جملے میں سمونے سے پہلے اس کا وزن و وقار اور مول تول سمجھ کر قدم بڑھاتے ہیں۔ اتنے صبر اور اطمینان سے لکھنے والے اس زمانے میں شاید ہی میسّر آئیں۔ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو نثر و نظم کے تراجم کے لیے وہ انعام یافتہ بھی ہیں اور بڑے بڑے انگریزی پبلشروں کے پسندیدہ بھی۔

میرا یہ منصب نہیں کہ اس کتاب کے ترجمے کی جانچ پرکھ کروں اور انگریزی اردو کا موازنہ کر کے محمد ذاکر کی ترجمہ نگاری پر رائے زنی کروں۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ چند مختصر اقتباسات پیش کر کے اصل انگریزی اور محمد ذاکر کے اردو ترجمے کو برائے مطالعہ پیش کر دوں تا کہ اس تبصرے کے قارئین کو یہ پتا چل سکے کہ ہماری زبان میں کیسے کیسے روشن ستارے اور چاند سورج موجود ہیں جو خاموشی سے بڑے بڑے علمی کام بغیر کسی دعوے کے کیے جا رہے ہیں۔ پہلے اردو اور انگریزی عبارتوں کا موازنہ ملاحظہ ہو جس سے انشا پردازانہ لطف و انبساط حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی انشا کا حسن اور بے تکلفانہ انداز اور اسی کے پہلو بہ پہلو اردو زبان کا رچاؤ اور مطابقت پیدا کرنے کا مترجم کا کمال اس گوشوارے کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں مصنّف اور مترجم کا ماہرانہ انداز ایک ساتھ دیکھیے:

انگریزی (محمد مجیب)

"Finally, though it is not my business to discuss the influence of Hinduism on the Muslims, I must say that if I were an eighteenth or early nineteenth century Muslim, I could easily have become that public nuisance called a reformer. I could have said, 'Islam is buried deep beneath Hindu influences, let us dig it out, clean it and see what it really looks like." (p-11)

اردو ترجمہ (محمد ذاکر)

"ایک آخری بات -- اگرچہ مسلمانوں پر ہندومت کے اثرات سے بحث کرنا (اس وقت) میرا مقصد نہیں ہے لیکن اتنا میں ضرور کہوں گا کہ اگر میں اٹھارویں یا اوائل انیسویں صدی کا مسلمان ہوتا تو میں آسانی سے لوگوں کے لیے وہ وبالِ جان بن جاتا جسے ریفارمر یا مُصلح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میں کہتا: "اسلام ہندو اثرات کے بہت نیچے دبا ہوا ہے۔ ہمیں اُسے کھود کر نکالنا چاہیے، پاک صاف کرنا چاہیے اور پھر دیکھنا چاہیے کہ یہ حقیقت میں کیسا لگتا ہے؟" (ص:۳۲)

"My pen works miracles", wrote Mir Ali, a calligraphist of Jahangir's Court, and rightly enough is the form of my words proud of its superiority over meaning. To each of the curves of my letters, the vault of heaven acknowledges its bondage, and the value of each of my stroke is eternity." (p-128)

"میرا قلم معجزے دکھاتا ہے، میرے لفظ کی 'شکل' کو اپنے پر فخر ہے کہ وہ 'معنی' سے برتر ہے۔ میرے حروف کی ہر گولائی کی خوبی کا گنبدِ آسماں بھی معترف ہے۔" یہ ہیں دربارِ جہاں گیر کے خطاط میر علی کے الفاظ۔" (ص:۹۷)

"وہ امتزاج جو ایرانی اور ہندستانی تہذیبوں کی باہمی آمیزش کا نتیجہ تھا کوئی زبردستی سے بنایا ہوا محلول یا Solution نہیں تھا۔ گلاب اور بلبل، جام اور ساقی زور زبردستی سے ہندستانی ادب میں نہیں آ گئے۔ وہ تو ایک چنوتی، ایک چیلنج ہیں اور اس چیلنج کا نتیجہ ہے ایک نئی زبان کی تلاش، ایک نئی امیجری، یا پیکریت اور سب سے زیادہ نئے سامعین۔" (ص:۱۱۰)

"The synthesis that was the result of the fusion of Iranian and Indian cultures was not an imposed solution. Rose and nightingale, cup and cup-bearer, do not force themselves into Indian literature. They become a challenge and the consequence of the challenge is the search for a new language, a new imagery and, what is most important, a new audience." (p-130)

"کسی چیز پر اتنی اُداسی نہیں برستی جتنی کسی ایسے مکان پر جس میں رہتا تو کوئی نہیں لیکن لوگ اسے دیکھنے چلے آتے ہیں۔" (ص:۹۱)

"Nothing looks so drearly as a house that is not lived in but only visited." (p-109)

"ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہیں گے، فکر و نظر اور زندگی کی نئی صورتیں وجود میں آتی رہیں گی۔" (ص:۴۴)

"Past, present and future will continue to merge into each other and new form of thought and life will come into being. (p-66)

"بنی نوع انسان کی پوری سیاسی تاریخ انصاف اور ذاتی مفاد کی کشمکش سے تعبیر کی جا سکتی ہے"۔ (ص:۱۹۱)

"The whole political history of mankind can be resolved into a struggle between justice and self interest." (p-191)

(ہندستانی سماج پر اسلامی اثر اور دوسرے مضامین: محمد مجیب: اردو ترجمہ: محمد ذاکر: دلّی کتاب گھر، دہلی: ۲۰۱۱)

(Islamic influence on Indian Society : M. Mujeeb; Meenakshi Prakashan, Meerut; 1972)

یہاں صرف چھے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ مقابلہ کرتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اصل کی شان کے پہلو بہ پہلو مترجم کی آن بان بھی قائم ہے۔ میر امّن کے سامنے 'نوطرز مرصع' نام کی اردو کتاب ہی تھی جس کا پھر سے انھیں اردو ترجمہ کرنا تھا۔ آج دونوں کتابیں سامنے ہیں۔ مترجم کی حیثیت سے انھیں جب جب آزادی کی ضرورت محسوس ہوئی، متن کو استحکام دینے کے مقصد سے انھوں نے اس کا استعمال کیا۔ ظ۔ انصاری نے دستیوئیفسکی کے ناول 'ایڈیٹ' کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس ناول کی زبان میں سلاست، سادگی اور ہم واری کے بہ جائے ایک مانوس کھردرا پن قائم رہنے دیا کیوں کہ اسی سے دستیوئیفسکی کا سچا اسلوب نکھر کر اردو والوں کے سامنے آتا ہے۔ محمد ذاکر نے ترجمے کے دوران اصل متن کی سرگوشیوں کا بھی اتنا خیال رکھا ہے کہ انگریزی زبان کی کوئی ایک آہٹ بھی اردو کا قالب پانے سے رہ نہ جائے۔ اس کے لیے کہیں کہیں قوسین میں چند لفظوں کو بھرنے کی ضرورت پڑی تو اس سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہ کتاب بیش قیمت مضامین کا مجموعہ ہے اور جس سلیقے سے دتی کتاب گھر سے شائع ہوئی ہے، اس کے حساب سے ایک سو روپے میں مفت حاصل کرنے جیسا ہے۔ آج کل اغلاط کتابت تو اردو کتابوں کا زیور ہیں لیکن یہ کتاب تقریباً ایسی کوتاہیوں سے پاک ہے۔ اردو کے طالب علم، ریسرچ اسکالر، اساتذہ اور تمام مخلصین سے میری یہ سفارش ہوگی کہ اس کتاب کی ایک کاپی ہر خاندان میں لازماً ہونی چاہیے۔ محمد مجیب کی انگریزی کتاب تو اَب نایاب ہے، اس لیے اپنی زبان میں اُن کے اِن مضامین کو پڑھ کر ہم اپنے اسلاف کی روشن ضمیری اور علمی گہرائی پر خوش تو ہو ہی سکتے ہیں۔ اردو نثر کے طالب علموں کے لیے بھی یہ ایک رہنما کتاب ثابت ہوگی کیوں کہ وہ یہ جان سکتے ہیں کہ سلجھی ہوئی زبان میں کس انداز سے اہلِ علم گفتگو کرتے ہیں اور تاریخ و تہذیب اور مذہب و ادب کو دیکھنے اور سمجھنے کا حقیقی پیمانہ کیسا ہوتا ہے؟ مجھے خوشی ہے کہ محمد ذاکر نے محمد مجیب کے ان بیش قیمت مضامین کا ترجمہ کر کے ہماری زبان کا دامن وسیع کر دیا ہے۔

اس کتاب میں مترجم نے جس دل جوئی سے خونِ جگر صرف کر کے اپنے تراجم پیش کیے ہیں، اس سے اپنے آپ یہ توقع پیدا ہوتی ہے کہ کیوں نہیں ایک بھرپور مضمون محمد مجیب کی شخصیت اور خدمات کے حوالے سے کتاب میں شامل کیا گیا۔ مترجم نے اپنے ترجمے کے جو اصول بتائے ہیں، وہ دو جملوں میں مکمل ہو گئے ہیں۔ آج کل لکھنے والے اپنے کاموں کا خود بھرپور طریقے سے تعارف کراتے ہیں۔ کون کون سے نئے علمی

نکات ان کی تحریر میں در آئے، اس پر بہ صراحت گفتگو ملتی ہے۔ مصنفین محمد مجیب کے لفظوں میں ''مضحکہ خیز خود ستائی'' کے نمونے تعارف میں پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ محمد مجیب نے اپنی کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے ایک یا دو جملے ہی اس انداز کے لکھے ہیں۔ محمد ذاکر نے ترجمے کے مرحلے میں متوقع خودستائی سے گریز کی ایسی صورت نکالی جس میں عالمانہ بے نیازی کی انتہا سامنے آتی ہے۔ کیا یہ تجربہ اردو کے پڑھنے والوں کے لیے مفید نہیں ہوتا کہ محمد ذاکر اس ترجمے کے دوران محمد مجیب کے اسلوب بیان میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے انگریزی اردو کے جہانِ معنی کی جو سیر کرتے رہے، اسے چند صفحات میں قلم بند کر کے اپنے پڑھنے والوں کو بہ طور تحفہ شریک کر لیتے؟ اسی طرح مترجم کا جو تعارف شاملِ کتاب ہے، وہ بھی اس انداز سے لکھا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جبر ہے، جس کے تحت ان رازوں کو افشا کرنا ہے۔ مترجم کی کتابوں کی تفصیل ادھوری ہے اور بعض کے تو نام بھی شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ یہ درویشی اور فقر کبھی کبھی ہمیں عالمانہ بُخل کا مرتکب بنا دیتے ہیں۔

انگریزی سے ترجمہ کرنے کے دوران محمد ذاکر نے اردو کے لسانی مزاج کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ محمد مجیب کی زبان میں ایک ذرا تجرباتی لہر ہے اور ایک عجیب بے تکلفانہ فضا میں یہ پروان چڑھتی ہے۔ محمد ذاکر نے اس بے تکلفی کو ترجمے میں بہ کمال شامل کر لیا ہے لیکن انگریزی جملوں کی بناوٹ اور رموزِ اوقاف کے جبر سے کبھی کبھی مترجم فتح یاب نہیں ہو پاتا ہے۔ خاص طور سے انگریزی کے جملوں میں جہاں بغیر سکتہ اور وقفہ کام چلانے کا رواج ہے، وہاں کبھی کبھی اردو میں اس کی لازمی شمولیت درکار ہوتی ہے لیکن مترجم آخر کیا کرے کہ دو زبانوں کے پاٹوں کے بیچ اُسے ہر لفظ اور ہر جملے کی ادائیگی میں صفحۂ اوّل سے آخر تک پستے رہنا ہے۔ اسی لیے کہیں کہیں انگریزی کا جادو حاوی ہو جائے گا تو کہیں اپنی زبان کا طلسم؛ اور اس سے مفر نہیں۔ یہ ہر مترجم کا مقدر رہے۔

(2011)

سرسیّد شناسی کا ایک نیا باب

(شافع قدوائی کی انگریزی کتاب کا تنقیدی جائزہ)

سر سیّد کی پیدائش کو اب دو سو برس ہونے کو آئے، دنیا کی متعدد زبانوں میں بلاشبہ ہزاروں کتابیں اُن کی خدمات پر لکھی گئیں۔ ان کی تحریروں پر نرم گرم بحث بھی لگاتار ہوتی رہی لیکن ولی نے جو کہا تھا: 'راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں'، اس کے مصداق اب بھی سر سیّد کی حیات و خدمات کے نئے نئے پہلو اُجاگر ہوتے رہتے ہیں اور لکھنے والوں کی توجہ اس طرف سے کم نہیں ہوتی۔ پچھلے برسوں میں افتخار عالم خاں کی کتاب 'سر سیّد درونِ خانہ' سامنے آئی تو محسوس ہوا کہ حیاتِ سر سیّد کے ابھی کئی کام باقی تھے جو اُن کی وفات کے سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد انجام دیے جانے تھے۔ اسی طرح ابھی کچھ دنوں قبل اردو کے معروف نقّاد شافع قدوائی کی کتاب "CEMENTING ETHICS WITH MODERNISM : An Appraisal of Sir Sayyid Ahmad Khan's Writing" (Gyan, 2010, Pages-320) سامنے آئی تو یقین آ گیا کہ سر سیّد شناسی کے ابھی بہت سارے نئے ابواب کھلنے باقی ہیں۔ شافع قدوائی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ اردو میں انھیں مابعد جدید نقّاد اور ہم عصر فکشن کی سوجھ بوجھ رکھنے والے ادیب کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ سر سیّد کے تعلق سے ان کے کچھ زیادہ مضامین بھی اردو رسائل کی زینت نہیں بنے۔ رسالہ 'آج کل' میں منشی سراج الدین کے بارے میں ایک مضمون کے علاوہ سر سیّد شناسی میں ان کی کوئی دوسری قابلِ ذکر اردو تحریر دکھائی نہیں دیتی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سر سیّد کی خدمات کے حوالے سے ان کی مستقل تحقیقی و تنقیدی کتاب بھی اردو کے بہ جائے انگریزی زبان میں منظرِ عام پر آئی۔ پتا نہیں، اسے کب اردو کا قالب نصیب ہوگا؟ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے علمی حلقے کو اس کتاب کی اہمیت سے واقف کرایا جائے۔

یہ کتاب سرسید کی صحافتی تحریروں کا تقریباً مکمل احاطہ کرتی ہے۔ سرسید کی حیات و خدمات سے واقفیت کے لیے دو ذرائع عام طور پر استعمال میں لائے جاتے ہیں: (۱) سرسید کی کتابیں اور (۲) سرسید سے متعلق لکھی گئیں معروف افراد کی مستند کتابیں (حیاتِ جاوید وغیرہ)۔ شافع قدوائی نے سرسید کے اخبارات ورسائل کو بنیادی وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ سرسید کے خیالات کا ایک سلسلہ وار گراف بھی اُبھرتا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان بنیادی ماخذات تک رسائی جتنی مشکل تھی، اسے راہِ تحقیق کے مسافر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ سرسید کی صحافت کے تعلق سے اردو میں بھی چند محققانہ جلدیں سامنے آئی ہیں لیکن بنیادی مواد کا اس بڑے پیمانے پر استعمال اور انھیں سرسید کی فکری نشو و نما کے پہلو بہ پہلو جانچنے پرکھنے کا کام اب تک کسی اردو سرسید شناس نے انجام نہیں دیا تھا۔

شافع قدوائی نے اخبار کے تراشوں اور اداریوں یا مضامین کے اقتباسات کی کھتونی تیار کر کے اپنی کتاب مکمل نہیں کی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ کچھ چنے ہوئے اقتباسات جمع کر کے اپنے Pre-conceived notion کو لفظوں کا جامہ پہنا کر کام چلا لیا ہے۔ اس کے بر خلاف ان کا مطمحِ نظر بالکل واضح ہے۔ اخبارات، رسائل اور سرسید کے مضامین سب سے مل کر اُس دانش ورانہ جہت کی ایک شکل بنتی ہے جس کی بدولت ہندستان کی جدید کاری کے مرحلے میں سرسید نے اتنی زبردست کامیابی پائی۔ شافع قدوائی نے سرسید کے معتقدین و معترضین دونوں کی تحریروں سے واسطہ رکھتے ہوئے اپنی گفتگو کے دوران جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، بھرپور بحث اور اپنے نتائج کو پختگی عطا کی ہے۔

سوانحِ سرسید کی گم شدہ کڑیاں:

شافع قدوائی نے سرسید کی صحافتی خدمات کی تفصیلات بتانے سے پہلے سوانحِ سرسید کے بعض گم شدہ پہلوؤں کو اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سرسید کے سوانح نگاروں کی تعداد اچھی خاصی رہی اور ہر زمانے میں نہایت سنجیدگی سے اس موضوع پر گہرائی کے ساتھ لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ جی۔ ایف۔ آئی۔ گراہم، الطاف حسین حالی اور افتخار عالم خاں نے سوانحِ سرسید سے متعلق نہایت گہرے کام کیے ہیں۔ اس کے باوجود شافع قدوائی نے حیاتِ سرسید کی کڑیوں کو جوڑنے کے مرحلے میں ان سوانح نگاروں کی حدود کا صاف صاف احساس کرادیا ہے۔ مذکورہ تینوں کتابیں سوانحِ سرسید کے سلسلے سے اساسی اہمیت کی حامل ہیں اور سرسید شناسوں کے لیے معتبر حوالے کا درجہ رکھتی ہیں لیکن ان کتابوں کے نتائج پر انگلی رکھ کر ان کی خامیوں کی اصلاح کر دینا شافع قدوائی کا بڑا کارنامہ ہے۔ نمونتاً سوانحِ سرسید کے

چند پہلوؤں پر شافع قدوائی کی بحث کا خلاصہ پیش ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے:

(۱) سرسید نے اپنے آبا و اجداد کے ہندستان پہنچنے کا زمانہ عہدِ اکبر مانا ہے لیکن حالی اور ان کی تقلید میں خلیق احمد نظامی اور افتخار عالم خاں وغیرہ نے یہ واضح کیا ہے کہ سرسید کے آبا و اجداد شاہ جہاں کے عہد میں ہندستان آئے۔ شافع قدوائی کا اصرار ہے کہ جب تک کوئی دوسری شہادت نہ ہو، سرسید کے بتائے زمانے سے کیوں انحراف کیا جائے؟

(۲) منشی سراج الدین جنھیں سرسید کی سوانح لکھنے پر مامور کیا گیا تھا لیکن بہ وجوہ وہ سوانح سرسید کو پسند نہیں آئی اور غیر مطبوعہ صورت میں ہی حالی کو وصول ہوئی۔ شافع قدوائی نے اپنی بحث میں یہ واضح کرنے میں کامیابی پائی ہے کہ منشی سراج الدین کی کتاب کو حالی نے حیاتِ جاوید لکھتے وقت تقریباً ضم کر لیا یا اسے بہ خوبی استعمال میں لایا ہے۔

(۳) سرسید نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمد کے سات سو روپے ماہانہ مشاہرے پر مدرسۂ عالیہ، کلکتہ میں فائز ہونے کی جو بات 'سیرتِ فریدیہ' میں لکھی ہے، اُسے شافع قدوائی نے مولوی عبدالستار اور محمود برکاتی کے نتائج سے اتفاق کرتے ہوئے باطل قرار دیا ہے۔

(۴) سرسید کے والد کے نام کے سلسلے سے بعض اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ سرسید کے پہلے سوانح نگار گراہم نے ان کا نام سید محمد تقی لکھا اور حالی نے میر متقی۔ شافع قدوائی کا کہنا ہے کہ سرسید نے اپنے والد کے نام میں کہیں بھی میر کا سابقہ استعمال نہیں کیا۔ سرسید نے خود اپنے والد کا نام سید محمد متقی لکھا ہے۔ شافع قدوائی نے بہ جا طور پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ گراہم کی کتاب پر 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں سرسید کے دو خطوط شائع ہوئے لیکن کہیں بھی سرسید نے اس نام کی غلطی پر نہ کوئی تبصرہ کیا اور نہ اصلاح کی کوئی تجویز پیش کی۔

(۵) سرسید کے والد کی وفات کا سال گراہم نے 1836ء لکھا ہے اور حالی نے 1838ء۔ شافع قدوائی نے اس خلفشار کی طرف صاف لفظوں میں اشارہ کیا ہے لیکن کون سی تاریخ واقعتاً درست ہے، اس پر اپنی رائے واضح نہیں کی۔

(۶) شافع قدوائی کا کہنا ہے کہ حالی نے سرسید کی والدہ کی خصوصیات تو بڑی تفصیل سے لکھی ہیں لیکن وہ ان کا نام نہیں لکھتے۔ شافع قدوائی نے سرسید کی ماں کا نام عزیز النسا (بیگم) بتایا ہے اور ان کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی تاریخِ وفات 19 نومبر 1857ء درج کی ہے۔ غدر کے ہنگاموں کے دوران سرسید کی والدہ کو بہت مشکلوں سے دہلی سے سرسید کے پاس میرٹھ پہنچایا گیا۔ اس میں سرسید کے ایک رفیقِ خاص مولوی سمیع اللہ نے بہت تعاون دیا تھا۔ شافع قدوائی نے مولوی ذکاء اللہ کے ایک مضمون کا حوالہ پیش کرتے ہوئے اس بات پر بجا طور پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ سرسید کے مورخین نے اس اہم پہلو سے کیسے صرفِ نظر کیا۔

(۷) سرسید کی بہن کا نام حالی نے صفیۃ النسا بیگم لکھا ہے لیکن شافع قدوائی نے سرسید کی تحریر سے یہ واضح کیا ہے کہ ان کی بہن کا نام عجبت النسا تھا۔

(۸) سرسید کی شخصیت میں موجود بذلہ سنجی کی طرف ان کے کسی سوانح نگار کا دھیان نہیں گیا۔ شافع قدوائی نے سرسید کے سوانح نگاروں کی حدود یہاں بتادی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سرسید نہایت پُر مذاق شخصیت رکھتے تھے اور ان کے دوستوں اور ہم عصروں نے سرسید کے اس رنگ کو پہچانا تھا لیکن ان کے سوانح نگاروں نے اس عنصر کی طرف سے عدم توجہی برتی۔

(۹) سرسید کی خوش دامن اور اہلیہ کے تعلق سے بھی شافع قدوائی کے تحقیقی نتائج بہت کارآمد ہیں۔ 'سیرتِ فریدیہ' میں سرسید نے اپنے نانا کی تین صاحب زادیوں کا ذکر کیا ہے لیکن شافع قدوائی نے افتخار عالم خاں کی تحقیق کو درست مانا ہے جس کی رو سے سرسید کی اہلیہ پارسا بیگم عرف مبارک بیگم اپنی ماں فخر النسا کی تنہا اولاد تھیں۔ کسی دوسری اولاد کا، خواہ بیٹا ہو یا بیٹی، کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سرسید کی نانی کی آخری عمر میں بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ وہ سرسید کی اہلیہ کے ساتھ ہی رہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ سرسید کی نانی کی کوئی دوسری بہن یا بھائی نہیں۔ سرسید کی اہلیہ سے متعلق سرسید یا ان کے سوانح نگاروں کی جانب سے بہت کم اطلاعات پیش کرنے کی شکایت شافع قدوائی ضرور کرتے

ہیں لیکن اس موضوع پر پڑی ہوئی گرد کو وہ بھی بہ طریق احسن صاف نہیں کر پاتے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شافع قدوائی نے کس قدر تحقیقی گہرائی کے ساتھ حیاتِ سرسید کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے نتائج اس بات کا ثبوت ہیں کہ حیاتِ سرسید کے تعلق سے جو تحقیقی ذخیرہ موجود ہے، اس کا انھوں نے تقابل اور تطابق کے ساتھ جائزہ لیا ہے، تب جا کر یہ ممکن ہوا کہ حالی اور گراہم یا دوسرے معتبر محققین سرسید سے جو تحقیقی فروگذاشتیں ہوئیں، ان کی شافع قدوائی نے اکثر و بیش تر اصلاح کر دی۔ حیاتِ سرسید کے تحقیقی جائزے میں سرسید کی ملازمت، کتابوں کی اشاعت اور ان کے مختلف ایڈیشنز کے ساتھ ساتھ سرسید کے قائم کردہ علمی اداروں اور دیگر علمی اور سماجی تنظیموں سے اُن کے روابط کی ضروری تفصیلات اس تحقیقی کتاب کے بابِ اوّل میں تقریباً پچاس صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حیاتِ سرسید کے مضمرات پر شافع قدوائی کے نتائج اس وجہ سے بھی قابلِ یقین ہیں کیوں کہ انھوں نے سرسید کے اُن تمام اخبارات و رسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے جنھیں سرسید نے جاری کیا تھا اور جن میں علی گڑھ تحریک سے متعلق چھوٹی بڑی ہر اطلاع مندرج ہوتی تھی۔ اسی لیے اکثر و بیش تر بحث و تمحیص میں بحث کی تان کبھی 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' پر ٹوٹتی ہے تو کبھی 'تہذیب الاخلاق' کے اوراق پر۔ ان رسائل اور اخبارات کا براہِ راست مطالعہ شافع قدوائی کے نتائج کو معتبر اور باوقار بناتا ہے۔

یوں تو اس کتاب کا اصل مقصد سرسید کے دو آثار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' کے مشمولات کا جائزہ لینا ہے لیکن جس طرح حیاتِ سرسید کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑنے کے لیے ایک بھرپور اور کارآمد باب اس تحقیقی مقالے میں شامل کیا گیا ہے، اسی طرح سرسید کی مشہورِ زمانہ صحافتی تحریروں کے معیار و مرتبے کے تعین سے پہلے ۲۵ صفحات کا ایک مختصر سا باب سرسید کی ابتدائی صحافتی دل چسپیوں کے لیے وقف ہے جہاں خاص طور سے 'سید الاخبار' اور 'زبدۃ الاخبار' کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ سرسید کی ابتدائی تحریریں اپنی کامیابی کے پرچم انھی اخبارات و جرائد میں لہرا رہی تھیں۔ اس گوشے میں 'لائل محمڈنس آف انڈیا' کا بھی بہ غور مطالعہ کر کے سرسید کی صحافت سے ابتدائی دل چسپیوں کو روشن کرنے میں کامیابی پائی گئی ہے۔ شافع قدوائی نے ان دونوں ابواب کو اپنے اصل مطالعے کے پس منظر کے طور پر شامل کیا ہے لیکن یہاں سرسری گزرنے یا ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بہ جائے علمی اور تحقیقی ضبط اور ٹھہراو کے ساتھ گفتگو کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ کسی تحقیقی مقالے کی اتنی ٹھوس اور قابلِ اتباع پیش بندی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ:

اس کتاب میں 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے تعارف اور تجزیے کے لیے تقریباً نوے صفحات مخصوص کیے گئے ہیں۔ کثیر لسانی معاشرے کی ضرورتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے سر سید احمد خاں نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی چار زبانوں میں اس اخبار میں تحریریں چھاپیں۔ اسے 1866ء میں ہفتہ وار کے طور پر سر سید نے شروع کیا اور سر سید کی زندگی میں تقریباً یہ لگاتار نکلتا رہا۔ بعد میں تو یہ ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا۔ سر سید اور علی گڑھ تحریک کے تعلق سے اس کی حیثیت اساسی ہے۔ اس لیے یہ اچھا ہوا کہ شافع قدوائی نے اپنے مطالعے میں 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کو مرکزیت عطا کی۔

اخبارات اور خاص طور سے قدیم اخبارات پر تحقیق اور تعارف اس وجہ سے نہایت مشکل کام ہے کیوں کہ جیسے ہی آپ مواد کی جانچ پرکھ میں منہمک ہوتے ہیں، آپ کا بنیادی کام متفرقات کے تعارف اور تجزیے پر منحصر ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے اخبارات کے سلسلے سے جو تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں، ان میں اخبارات کے تراشے اور طویل مضامین کے اقتباسات کی کثرت رہتی ہے۔ ہر چند یہ تراشے نہایت قیمتی اور پڑھنے والوں کے لیے معلومات کے نئے اور انوکھے خزائن ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایسی تحقیقات پریشاں خیالی کا مجموعہ بن جاتی ہیں۔ شافع قدوائی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ صحافت کے استاد ہیں جہاں انھوں نے صحافت کی تعلیم و تدریس کا معیاری نمونہ پیش کیا۔ قدیم اخبارات کی تحقیق کے موضوعاتی بکھراو سے وہ واقف تھے، اسی لیے اپنی تحقیق میں ابتدا انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ان کی تحقیق گراں باری یا انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی مقصد سے انھوں نے اخبار کے متعلقات کی جانچ پرکھ کے لیے بہت سارے ضمنی عنوانات قائم کیے تاکہ اخبار میں شامل تمام معاملات پر بحث کرنے میں کامیابی حاصل ہو سکے۔

'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے متعلقات کے تعارف کے دوران شافع قدوائی کا مطمح نظر یہ بھی ہے کہ مختلف ضروری تاریخی حوالوں کا اندراج بھی 'گزٹ' کے صفحات سے تلاش کر کے نمونتاً پیش کر دیے جائیں۔ شافع قدوائی نے اخبار کے تعزیتی شذرات پر جو بحث کی ہے، وہ بے حد دل چسپ ہے اور سر سید کی وسعتِ ذہنی اور گزٹ کے دائرۂ کار کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ انگریزی شاعر لارڈ ٹینی سن، منشی نول کشور اور سالار جنگ وغیرہ کے شامل کُل ایک سو نو (109) تعزیتی شذرے ہیں۔ اخبارات میں اجتماعیت کا زور سب سے زیادہ ہوتا ہے، اس

لیے بہت ساری تحریریں اپنے لکھنے والوں کے نام سے آزاد ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ مشکل بات ہے کہ 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں شائع شدہ ان تعزیتی تحریروں میں کون سر سید کے قلم سے نکلی ہیں، اس کی نشان دہی کی جاسکے۔ شافع قدوائی نے حسبِ دستور داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ دیانند سرسوتی، مولوی چراغ علی، عبدالحئی فرنگی محلی وغیرہ بارہ افراد کے تعزیتی گوشوارے لازماً سر سید کی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے شافع قدوائی نے اس میں شائع شدہ کتابوں کے تبصروں کو بہ جا طور پر اہمیت عطا کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو میں کتابوں کے تفصیلی تبصرے کی اشاعت کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ 'گزٹ' میں شیخ محمد ابراہیم ذوق، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، حالی، منشی ذکاءاللہ، سید احمد دہلوی، شوق قدوائی، ڈپٹی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر کی تازہ کتابوں پر تفصیلی تبصرے شائع ہوئے۔ 'آبِ حیات'، 'نیرنگِ خیال'، 'حیاتِ سعدی'، 'دیوانِ ذوق'، 'دیوانِ حالی' اور 'سفرنامہ مصروشام' جیسی کتابوں پر 'گزٹ' میں ان کی اہمیت کے مطابق تبصرے شائع ہوئے۔ 'آبِ حیات' پر سر سید، حالی اور منشی ذکاءاللہ کے الگ الگ تبصروں (مطبوعہ ۱۸ دسمبر ۱۸۸۰ء) کے بارے میں شافع قدوائی نے وضاحت سے لکھا ہے کہ ذکاءاللہ نے آبِ حیات کی خصوصیات تسلیم کرنے کے باوجود بعض شعرا کی عدم شمولیت پر سوالات قائم کیے تھے۔ خاص طور سے مومن کا 'آبِ حیات' میں شامل نہیں ہونا محمد حسین آزاد کے سامنے ایک بڑا سوال بن گیا تھا۔ اس سلسلے میں 'گزٹ' کی اہمیت بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یکم فروری 1881ء کے مطبوعہ خط میں محمد حسین آزاد نے واضح کیا ہے کہ 'آبِ حیات' کا نیا ایڈیشن سامنے آنے والا ہے، جس میں بہت ساری اصلاحیں شامل ہیں۔ 'گزٹ' میں کون سی تحریریں سر سید کی ہیں اور کون سی دوسروں کی، اس سلسلے سے شافع قدوائی نے بحث کرتے ہوئے اردو کے دیگر محققین سے اختلاف کیا ہے اور سر سید کے ایک سو مضامین یا شذرات کے عنوانات تاریخ وار پیش کردیے ہیں، جن کے مطالعے سے سر سید کے عبقری ذہن اور وسعتِ نظری کے ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔

'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں سر سید کے وہ مضامین بھی محفوظ ہوئے جو کسی نہ کسی جہت سے تعلیم یا زبان سے واضح تعلق رکھتے ہیں۔ 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں ہی سر سید نے اردو کے خلاف غیر ضروری طور پر چل رہے پروپیگنڈے کو سمجھتے ہوئے اپنا سلسلۂ مضامین قائم کیا۔ 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں اس سلسلے سے سر سید اور دوسروں کے چھبیس (۲۶) مضامین شائع ہوئے۔ سر سید کی صحافتی دیانت داری کا یہ ادنا ثبوت ہے کہ انھوں نے 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں ہندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں لکھے گئے مضامین بھی شائع کیے۔ اردو ہندی تنازعات پر گفتگو

کرتے ہوئے عام طور پر سرسید برادرانِ وطن کے نفسیاتی پہلوؤں کو بہ خوبی توجہ میں رکھتے ہیں۔ شافع قدوائی نے اردو ہندی تنازعات کے سلسلے سے 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نقطۂ نظر کو مثالی صحافتی اقدار کا حامل قرار دیا ہے۔

'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کی جانچ پرکھ کے لیے شافع قدوائی نے تعلیم کے موضوع کا بھی انتخاب کیا ہے کیوں کہ فکرِ سرسید کا یہ بنیادی عنصر ہے۔ گزٹ میں ایسے تمیں مضامین شائع ہوئے جن کا موضوع براہِ راست تعلیم وتدریس ہے۔ شافع قدوائی نے اس ضمن میں سرسید کے صرف ایک مضمون کا ایک مختصر اقتباس شامل کیا لیکن ان کی محققانہ خوبی کہیے کہ یہاں سرسید شناسی کا ایک اہم پہلو اپنے آپ روشن ہو جاتا ہے۔ یہ اقتباس تعلیمِ نسواں سے متعلق ہے۔ شافع قدوائی نے تو یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے طرف دار تھے اور اس سلسلے سے سرسید کی تنقید کرنے والے لوگوں پر طنزیہ فقرے بھی پیش کیے ہیں۔ میرا کہنا ہے کہ وہ جوشِ دفاع میں سرسید کی تمام تحریروں اور دوسرے کام کاج کو نگاہ میں رکھے بغیر اس موضوع پر ایک اقتباس یا ایک تحریر کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہتے ہیں، یہ درست نہیں۔

'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے سیاسی، سماجی اور دیگر موضوعات پر شائع شدہ مضامین کی بنیاد پر شافع قدوائی نے بہ جا طور پر سرسید کا ایک اعلا صحافتی بُت قائم کیا ہے۔ یہ بُت عقائد نہیں بلکہ حقائق کی بنیاد پر مکمل کیا گیا ہے۔ یہ انھوں نے اچھا کیا کہ اپنی باتوں کو کہتے ہوئے اخبار سے ضروری اقتباسات بھی ترجمہ کر کے بہ طور ثبوت پیش کر دیے۔ 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' سے متعلق نوے صفحات میں شافع قدوائی نے جس جاں فشانی کے ساتھ سرسید کی تحریروں اور موقف کا جائزہ لیا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید شناسی کا نہایت سنجیدہ اور گہرا کام، دوسرے لفظوں میں بھاری پتھر شافع قدوائی نے اٹھایا ہے۔ دورانِ گفتگو تحلیل وتجزیہ کے مرحلے میں شافع قدوائی، سرسید کی تحریروں کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں جیسے معلوم ہو کہ ان کے زمانے میں ہی یہ سب چیزیں شائع ہوتی رہیں جب کہ معاملہ سوا سو برس قبل کا ہے۔ یہ محقق کا اپنے موضوع پر پورے طور پر قادر ہونے کا ثبوت ہے۔

تہذیب الاخلاق:

علی گڑھ تحریک کے فیضان کو 'تہذیب الاخلاق' اور "The Muslim Social Reformer" کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ 1869ء میں سرسید جب انگلینڈ پہنچے، اس وقت وہاں "The Tattler" اور "Spectator" کا چرچا تھا۔ ان کا نکلنا ہر چند کہ بند ہو چکا تھا لیکن ذکر جاری تھا۔ سرسید نے وہیں طے کرلیا کہ اپنے ملک میں واپسی کے بعد اسی طرح کا ایک رسالہ شائع کریں گے۔ ان کے اردو اور انگریزی نام بھی انگلینڈ

میں ہی طے ہو گئے تھے۔ سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' میں جس سرگرمی سے اپنے مضامین شائع کیے، اس سے رسالے سے اُن کے تعلقِ خاطر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ سرسید کی حیات تک 'تہذیب الاخلاق' کے جو شمارے سامنے آئے ان میں کُل تین سو پچیس مضامین شائع ہوئے۔ ان میں تنہا ایک سو ستاسی یعنی 53% سرسید کے قلم سے نکلے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سرسید کے خیالات اور علی گڑھ تحریک کی سانسوں اور دھڑکنوں کو سمجھنے کے لیے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' ایک بنیادی ماخذ ہے، جس پر شافع قدوائی نے اپنے مقالے میں کوئی پچاس صفحات وقف کیے ہیں۔

شافع قدوائی کے اس تحقیقی مقالے کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ سرسید اور ان کے صحافتی کاموں سے متعلق جو تحقیقی غلطیاں ایک سے دوسری کتابوں میں نقل در نقل کے سبب دیکھنے کو ملتی ہیں؛ ان کا بھرپور حقائق کے ساتھ تدارک کر دیا گیا ہے۔ کہنے کو یہ ایک غلطی کی اصلاحِ محض ہے لیکن غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ تحقیقی بھول اُن بزرگوں سے ہوئی ہے جن کے نقشِ قدم پر چلنا کامیابی کی ضمانت ہے۔ شافع قدوائی نے بھی ایسی اصلاحوں میں جوشِ بے جا کو روا نہیں رکھا۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی:

(۱) 'تہذیب الاخلاق' کس کس زبان میں نکلا؟:

آج ہم سب کو یہ معلوم ہے کہ 'تہذیب الاخلاق' اردو زبان کا معتبر رسالہ رہا ہے۔ 'حیاتِ جاوید' میں حالی نے کہیں بھی 'تہذیب الاخلاق' کو ذولسانی یا کثیر لسانی رسالے کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ انھوں نے اسے خالص اردو رسالہ تسلیم کیا ہے۔ شافع قدوائی نے محسن الملک کے نام لندن سے لکھے گئے سرسید کے مکتوب کا ترجمہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے بعد شافع قدوائی نے وہ تفصیلات بھی شامل کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ 'تہذیب الاخلاق' میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں؛ کبھی کبھار انگریزی اور عربی زبان میں بھی معتدبہ چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ مضامین، رپورٹس، خطوط اور اداریے سب حسبِ ضرورت انگریزی اور عربی میں بھی شائع ہوئے۔ اس طرح یہ تحقیقی امر کہ 'تہذیب الاخلاق' میں انگریزی اور عربی زبانوں کا بھی حصہ ہے، سرسید شناسی میں غالباً پہلی بار شافع قدوائی کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔

(۲) تہذیب الاخلاق کا وقفۂ اشاعت:

اردو صحافت کی تاریخ کے مشہور محققین امداد صابری، عبدالسلام خورشید اور عتیق صدیقی نے اپنی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ 'تہذیب الاخلاق' ایک ماہ میں تین بار شائع ہوتا تھا لیکن شافع قدوائی اسے درست نہیں مانتے۔ انھوں

نے محسن الملک کے نام سرسید کے لکھے خط کا اقتباس پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ ابتداً سرسید کے ذہن میں ماہانہ رسالے کا ہی تصور تھا۔ لیکن پہلے ہی شمارے میں یہ اعلان شائع ہو گیا کہ ایک ماہ میں ایک بار یا دو بار یا جتنی بار ضرورت ہو، یہ رسالہ شائع ہوگا۔ اسی وجہ سے کبھی مہینے میں ایک یا کبھی دو یا کبھی تین شمارے بھی شائع ہوئے۔ شافع قدوائی نے یہ لکھا ہے کہ 1896ء کے بعد ہی یہ ہفتہ وار ہو سکا۔ شافع قدوائی نے لکھا ہے کہ اپنے پہلے سال میں 'تہذیب الاخلاق' کے ابتدائی چھے شمارے دس دن کے وقفے سے شائع ہوئے اور پھر اس کی اشاعت کا دورانیہ پندرہ روزہ ہو گیا۔

(۳) تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے کی انگریزی تاریخ:

تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے کی اشاعت کی انگریزی تاریخ حالی نے ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء درج کی ہے۔ ہجری تاریخ یکم شوال ۱۲۸۷ ہے۔ 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں انگریزی اور ہجری دونوں تاریخیں ایک ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ لیکن 'تہذیب الاخلاق' میں سرسید نے صورت بدل دی اور صرف ہجری تاریخ ہی شائع ہوتی رہی۔ اس تاریخ کی حالی نے جو عیسوی مطابقت پیش کی، اُسے دیگر ماہرینِ سرسید یا محققینِ صحافت بہ شمول مولوی عبدالحق، سید عبداللہ، امداد صابری، محمد عتیق صدیقی، عبدالسلام خورشید، خلیق احمد نظامی، شان محمد، قدسیہ خاتون اور نفیس بانو وغیرہ نے حالی کی مکھی پر مکھی بٹھاتے ہوئے ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کی ہی تاریخ درج کی ہے۔ شافع قدوائی کا کہنا ہے کہ یہ تاریخ درست نہیں ہے۔ انھوں نے تقویم کی مدد سے یہ تاریخ ایک دن آگے یعنی ۲۵ دسمبر ۱۸۷۰ء طے کی ہے۔ محققین کی ہدایت ہے کہ تقویم ہجری و عیسوی کی مطابقت قائم کرتے ہوئے جب تاریخ معلوم ہو تو ایک دن کی اور تاریخ یا ماہ نہیں معلوم ہو تو ایک سال کے لیے باز پرس نہیں کی جا سکتی۔ اس اعتبار سے شافع قدوائی کی طرف سے ایک دن زیادہ کی تاریخ کوئی بڑا کارنامہ نہیں مانی جاتی اگر شافع قدوائی نے سرسید کا قول نہ پیش کر دیا ہوتا کہ ان کے رسالے کی افتتاحی شان بھی کیا خوب ہے کہ عید اور کرسمس ایک ہی روز وقوع پذیر ہوئے۔

مذکورہ بالا تینوں مثالوں سے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ شافع قدوائی نے سرسید کے رسالے کا سرسری طور پر مطالعہ نہیں کیا بلکہ اُسے لفظ بہ لفظ اور صفحہ در صفحہ پڑھنے کی کوشش کی، اسی لیے تحقیقی جہت سے گفتگو کرتے ہوئے انھیں بہت سارے مسلّمات پر انگلی رکھنی پڑی اور آج یہ صورتِ حال ہے کہ بعض امور میں وہی نتائج لائق اعتنا ہیں جو شافع قدوائی نے طے کر دیے۔ لیکن یہ کتاب صرف تحقیقی جہت سے کارآمد نہیں ہے بلکہ علمی نقطۂ نظر سے سرسید کے اخبار و رسائل کے اندر جو خزینہ چھپا ہوا تھا، اس پر بہت سارے لوگوں نے اپنے دانش ورانہ نتائج

ظاہر کیے ہیں لیکن شافع کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسی سیکڑوں بنیادیں فراہم کرتے ہیں جو افکار سر سید کے طالب علم کو نئے سرے سے غور و فکر کے لیے مجبور کر دیں۔ ان کے پاس معلومات کا اتنا وسیع خزانہ ہے کہ حقائق کی پیش کش میں دوسرے متعلقات سے مناسبت پیدا کر کے تصدیق تو کرتے چلے جاتے ہیں۔ نتائج اخذ کرنے کے دوران شافع قدوائی کا ایک اور انداز قابل اتباع معلوم ہوتا ہے۔ وہ کسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے اپنے مرکز یعنی 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' کے مضامین پر حاوی تو رہتے ہیں لیکن مزید صراحت کے لیے وہ متعلقہ مطبوعات اور سر سید کے خطوط یعنی دیگر مآخذات سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تحریر کو استحکام عطا کرتے ہیں۔ اتفاق سے سر سید کی صحافت پر اردو میں مضامین اور کتابوں کی کمی نہیں لیکن تفہیم و تجزیہ کا تازہ ترین اور ترقی یافتہ اسلوب جو شافع قدوائی کے ہاتھ آیا ہے، وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

دونوں اخبارات و رسائل کے تجزیے میں شافع قدوائی کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ وہ صرف اردو زبان کے محقق اور نقاد نہیں بلکہ شعبۂ صحافت میں پروفیسر بھی ہیں اور یہ کتاب شعبۂ صحافت میں رہتے ہوئے ان کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس لیے سر سید کے جرائد پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے جن تکنیکی پہلوؤں سے اور زیادہ تفصیلات درج کی ہیں، وہ تو اردو کا کوئی عالم پیش ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے ظاہری صورت حال بھی صاف صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ مضامین کتنے کالم انچ میں شائع ہوئے اور خبروں کا تناسب کیا تھا، فیچر کتنا شامل ہوا اور تبصروں کے لیے اخبار میں کتنی جگہ رکھی گئی؛ یہ تمام باتیں شافع قدوائی نے اپنے تکنیکی ناپ تول سے ظاہر کر دی ہیں۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ شافع قدوائی نے ایک ایک شمارہ ملاحظہ کیا اور ہر تحریر کو اپنے جائزے میں اہمیت دی۔ بے صبر محققین کی ایک خو یہ ہوتی ہے کہ "تھوڑا پڑھا، اور زیادہ سمجھا، اور اس سے بھی زیادہ لکھا" کے سنہرے اصولوں پر عمل پیرا ہونا کامیابی کا زینہ سمجھتے ہیں لیکن جسے پتّا ماری کا کام کہتے ہیں، وہ تحقیق ہے۔ جس میں کبھی یہ اصول کار بند نہ ہو سکا کہ چاول کے ایک دانے کو دیکھ کر پوری ہانڈی کے بارے میں فیصلہ کر لیا جائے۔ شافع قدوائی نے واقعتاً 'تہذیب الاخلاق' اور 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے ایک ایک دانے کو دیکھا، جہاں ناپ تول کی ضرورت تھی، وہ بھی کیا اور پھر سر سید کی تحریک اور ان کی زندگی کے تناظر میں ان شذرات کی اہمیت کو روشن کیا۔ رسائل اور اخبارات کا ظاہری طور پر کتنا مؤثر جائزہ وہ لے سکتے ہیں، اس کا ایک نمونہ 'تہذیب الاخلاق' کے سرورق پر لکھے گئے نام کی تفصیل میں ملاحظہ کرنا چاہیے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ وہ مختصر نویسی کا فن جانتے ہیں اور تکنیکی تفصیلات پوری صفائی کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہیں:

"The upper half of the masthead was devoted to the English name - The Mahomedan Social Reformer - the first part of English name-The Mahomedan-appeared in semi circle and the rest of the name- Social Reformer" published in a 3-inch long horizontal box. The upper half carrying floral decoration is followed by Urdu name which also appeared in similar horizontal box. The masthead comprised name, volume, issue number and dateline."

شافع قدوائی کی اس کتاب کے آخری دو ابواب سر سید کے مضامین کو فکری طور پر سمجھنے کی کوشش میں وقف ہوئے ہیں۔ تحقیقی مقالے کی معروضیت کا یہ تقاضا بھی تھا کہ حیات اور مطبوعات کی تمام تفصیلات کے بعد اب اختصار میں یہ بتا دیا جائے کہ سر سید کے افکار و نظریات کے اصل نکات کیا ہیں؟ یوں تو پوری کتاب میں انھوں نے 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' کے مشتملات کو زیرِ بحث لا کر سر سید کے اُس عبقری دماغ میں اُترنے کی کوشش ہی کی ہے۔ سیکڑوں مثالوں سے وہ بہت حد تک سر سید کے متعلقات ظاہر کرنے میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ پانچویں باب میں جہاد اور اسلام، مسلم ریزرویشن، حقِ رائے دہی اور ہندستان میں جمہوریت، اردو ہندی تنازعات، جنسی مساوات، مجالسِ قانون ساز کا عوام کے مفاد میں استعمال جیسے موضوعات پر سر سید کے خیالات اور کارکردگی کا علاحدہ طور پر اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں شافع قدوائی نے سر سید کے زمانے کے بعد کے حالات اور مسائل و مباحث کو بھی سامنے رکھ کر اپنے تجزیے کے لیے نئی بنیادی زمین تلاش کی ہے۔ یہاں وہ صحافتی آثار اور قدیم کتب خانے کے طالب علم نہیں معلوم ہوتے جیسا کہ وہ اس کتاب میں سوا دو سو صفحات سے زیادہ تک میں دکھائی دیتے ہیں بلکہ یہاں زمانۂ موجود کے سلگتے ہوئے سوالات اور تنازعات پیدا کر دینے والی باتوں یا کتابوں کے نتائج سے گریز نہیں کرتے بلکہ سر سید کے تناظر میں ان تمام امور کا بے لاگ اور منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حصے میں سر سید کے تعلق سے شائع شدہ بعض اہم تحریروں کا بھی وہ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر اردو میں سر سید سے متعلق چھپی ہوئی کتابوں سے واقف ہیں لیکن اس کتاب میں ان کا بھرپور استعمال کہیں دکھائی نہیں دیتا البتہ انگریزی ماخذات کا حسبِ ضرورت وہ جائزہ لیتے رہتے ہیں اور ان کا استعمال بھی حوالہ جات کے لیے کرتے چلتے ہیں۔

پانچویں باب کی فہرست میں خواتین کی تعلیم کے سلسلے سے ایک پوری شق قائم کی گئی ہے لیکن کتاب کے

متن میں اس شق یا باب کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ اسے محض چھپائی کی بھول کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس طرح سر سید کے سماجی امور سے متعلق تصورات کو سمجھنے کے لیے یہاں کوئی جگہ دکھائی نہیں دیتی۔ سر سید کے محققین نے سر سید کے ذہنی تحفظات کے سلسلے سے بھی دو چار باتیں پیش کی ہیں۔ یہ تمام باتیں سر سید کے گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین پر گفتگو کرتے ہوئے زیرِ بحث آسکتی تھیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ان اندھیرے گوشوں پر بھی روشنی پڑے۔ ہر چند اس میں سر سید کی تھوڑی شبیہ بگڑتی ہی کیوں نہ معلوم ہو لیکن کسی عہد ساز شخصیت کی عظمت پر دو چار سوالات سے کوئی گہن نہیں لگتا۔ شافع قدوائی نے اپنے محسن کا ہزار حقائق کے ساتھ جو بُت قائم کیا تھا، شاید اُسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے تیز دھوپ میں وہ سر سیّد کو جلنے سے بچانے میں کامیاب ہوئے۔

یہ سچائی ہے کہ یہ کتاب سر سید کی صحافتی تحریروں کا جائزہ ہے۔ یہاں ان کی مقصود بالذات کتابیں زیرِ بحث نہیں رہیں۔ ضمنی طور پر اُن کا کہیں ذکر آ گیا ہو تو یہی بہت بڑی بات ہے۔ لیکن کتاب کا جو انھوں نے سرنامہ بنایا، اس میں 'writing' لفظ سے اپنے آپ یہ توقع پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ سر سید کے مکمل ذہنی سانچے کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اختتامی باب میں تو اور بھی اختصار آ گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کام کی باتوں پر انحصار کرتے ہیں اور سر سید کی صحافت سے زیادہ دور ہو کر گفتگو کرنا ان کے لیے موضوع سے الگ ہونے جیسا ہے۔ اس لیے آخری باب کا لہجہ بھی تمام و کمال سر سید کی صحافیانہ حیثیت پر واضح روشنی ڈالنے جیسا ہے۔ شاید محقق کی حیثیت سے اُن کی یہ حد ہے۔

سر سید پر اردو میں صحافت کے حوالے سے جو کتابیں موجود ہیں، ان سے اگر شافع قدوائی کی کتاب کا موازنہ کیا جائے تو کئی دل چسپ نتائج برآمد ہوں گے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے حوالے سے اصغر عباس کی کتاب کی بہت شہرت ہے۔ لیکن اس میں سر سید کی تحریروں کو مکمل یا اقتباس کی صورت میں پیش کرنے میں زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ تحلیل و تجزیہ یا بحث طلب امور سے جوجھنے میں مصنف کی طبیعت مائل نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس شافع قدوائی کی اس کتاب میں حقائق کے متوازی سر سید اور ان کے رفقا کی تحریریں اور سر سید کے خطوط، اخباری تراشے اور نہ جانے کتنی چیزیں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ تحقیق کا یہ انداز بہت دل پذیر اور قلب کو ٹھنڈک پہنچانے والا ہے۔ شافع قدوائی کو کچھ فائدہ انگریزی زبان سے بھی ہوا ہے۔ کیوں کہ اردو اور انگریزی کے علمی مزاج میں جو واضح فرق ہے، اس سے انھوں نے خود کو غیر ضروری صفات اور مبالغہ آمیزی سے دور رکھا ہے۔ اللہ کرے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ فوری طور پر سامنے آ جائے تاکہ اپنے موضوع پر اتنے سلیقے سے لکھی ہوئی یہ کتاب اپنے اصل قارئین تک بھی پہنچ جائے۔

(2012)

تعلیمِ جدید کا مثالی منشور

نذیر احمد کے خطوط اُن کے بیٹے کے نام

انیسویں صدی اردو نثر کی تاریخ میں چند جیالوں کی حیرت انگیز صلاحیتوں سے اپنے عروج کو پہنچی، ان میں ڈپٹی نذیر احمد اپنی کثیر الجہات شخصیت اور گوناگوں علمی کارناموں کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز تو سب کا مقدر ہیں لیکن نذیر احمد کو کم عمری ہی میں جن تجربات و حوادث کا سامنا کرنا پڑا، اسی نے انھیں سونا بنایا۔ انھوں نے طرح طرح کی چیزیں لکھیں، ایک تحریر دوسری سے بالکل الگ دنیا کی سیر کراتی ہوئی ملتی ہے لیکن ہر جگہ اُن کی جہاں دیدنی زیریں لہر کی طرح پیوست دکھائی دیتی ہے۔ ان کی زندگی شوکیس میں بجی دھجی نہیں تھی بلکہ دتی کی گلیوں اور مدارس و مساجد کی صبر آزما منزلوں میں مرحلہ در مرحلہ تشکیل پاتی رہی۔ اس بے چین زندگی کو دتی کالج میں داخلے سے جو قرار حاصل ہوا؛ وہیں سے ایک نئے نذیر احمد کا ورود مسعود ہوتا ہے۔ یہاں نو برس کی تعلیم نے نذیر احمد کی علمی شخصیت کو یوں سجایا جیسے کوئی مالی جنگل میں اُگے پھول اور پتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر رنگ اور خوشبو کا جہانِ نو قائم کر دے۔ زندگی کی دھوپ چھانو کا جو ابتدائی سبق انھیں چاروناچار پڑھنا پڑا تھا، تمام عمر وہ انھی تھپیڑوں کی تعبیر اور ان کی نئی نئی شقیں قائم کرتے رہے۔ غدر کی تباہی و بربادی کے نتیجے میں نذیر احمد کے ذہن کا جو نیا دریچہ کھلا، غور کیجیے تو اس کا بھی ابتدائی سرا اُن کی اپنی زندگی بالخصوص دورِ اول سے پورے طور پر مجوا ہوا ہے۔

علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہر فرد تعلیم کو اپنی قومی زندگی میں سرِ فہرست رکھتا تھا۔ سرسید کی لائق قیادت اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی شکل میں خوابوں کی تعبیر نے انھیں جدید ہندستان کا تعلیمی رہنما بنا دیا۔ اس وجہ سے

ان کے بعض رفقا کی تعلیمی اوّلیات پر بالعموم غور وفکر اور محاسبے سے کام نہیں لیا جاسکا۔ سب کے سب سرسید کے جزو ہوگئے اور ایک کُل جو وجود میں آیا، اس پر سرسید کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ سرسید کی شناخت پر کوئی سوالیہ نشان لگانا مقصود نہیں لیکن نذیر احمد، حالی، شبلی وغیرہ کا ذہن بھی ہندستان کی آیندہ تعلیم کے سلسلے سے پورے طور پر متحرک تھا۔ محمد حسین آزاد بھی تعلیم جدید کی بعض بنیادی باتیں پیش کررہے تھے۔ مشرقی اور مغربی تعلیم کی خانہ بندی آج کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن اُس زمانے میں قومی تعلیم کا کوئی مکمل خاکہ تیار ہوسکتا تھا تو اس کا سب سے متوازن رنگ نذیر احمد کے یہاں اُبھرتا ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ نذیر احمد ناول نگار مانے گئے، زبردست عالمِ دین، بے مثل خطیب اور مترجم بھی قبول کیے گئے، محاورات وضرب الامثال کی بہتی ہوئی انشاپردازانہ ندی تسلیم کیے گئے لیکن انھیں جدید ہندستان کی تعلیمی تشکیل وتعمیر کے بنیادگزار کے طور پر بہت کم یاد کیا جاتا ہے۔ نئی تعلیم کے بارے میں انھوں نے بھی اپنے علم، مشاہدے اور قومی ضرورت کے مطابق کچھ اساسی کام کیے تھے؛ اس سلسلے سے ہم اکثر غفلت کا شکار ہوتے ہیں۔ مغربیت اور سرسید کی قیادت کا طوفان اتنا شدید تھا جس نے ہمیں اُس عہد کے بہت سارے لوگوں کے کارناموں کی اہمیت سے بے پروا ہوجانے دیا۔ تاریخ کے دھارے میں ایسی ناانصافیاں اشخاص اور قوموں کا مقدر ہوجاتی ہیں۔ نذیر احمد واقعتاً اس کا شکار ہوگئے۔

نذیر احمد نے اپنے اکلوتے بیٹے بشیرالدین احمد کو اپنی ڈپٹی کلکٹری کے سلسلے سے دہلی سے باہر پوسٹنگ کے دوران جو ایک سو سے زاید چھوٹے بڑے خطوط رقم کیے، وہ اُن کے تجربات ومشاہداتِ زندگی کا نچوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ 'موعظۂ حسنہ' نام سے ۱۸۸۷ء میں پہلی بار یہ خطوط شائع ہوئے۔ ملازمت کے دوران نذیر احمد اپنے صاحب زادے کو ساتھ رکھتے تھے اور ابتدائی تعلیم وتربیت بالخصوص عربی زبان کی تدریس خود اُن کے ذمے تھی۔ لیکن جیسے ہی انگریزی تعلیم کا معاملہ اور کالج میں داخلے کی بات سامنے آئی، نذیر احمد نے اپنے بیٹے بشیرالدین احمد کو دلّی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ بیٹے کی جدائی میں یہ خطوط لکھے گئے ہیں جن کی تحریر کا زمانہ ۱۸۷۶ء سے ۱۸۷۹ء ہے۔ اُس زمانے میں عبدالغفور شہباز عظیم آبادی کی ترتیب وپیش کش اور اس کتاب پر محمد حسین آزاد کا تعریفی تبصرہ سامنے آنا یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اس کا پُرجوش استقبال کیا گیا تھا۔ کتاب کے عنوان سے آج ہمیں زیادہ سروکار نہیں کیوں کہ اس وقت 'مقصدیت' کا بھاری پتھر سبھوں کے ذہن پر سوار تھا۔ نذیر احمد تو پورے مولوی ہی تھے لیکن آج اس مجموعۂ مکتوب کو پڑھتے ہوئے اردو کے مراسلاتی ادب کے تناظر کے پہلو بہ

پہلو ہماری اس بات پر بھی نظر ہونی چاہیے کہ نذیر احمد اور ان کے دیگر معاصرین قومی ذہن سازی کا جو تصور پیش کر رہے تھے، کیا اُس کے کچھ چھینٹے اِن خطوط پر بھی پڑے؟ اپنی واحد اولاد کو اپنے علم کا کون سا اصلی جوہر وہ عطا کرنا چاہتے تھے؟ یہ خطوط صرف ایک باپ کی جانب سے بیٹے کو لکھے ہوئے نوشتہ جات نہیں ہیں بلکہ قومی زندگی کے خواب میں سرگرداں ایک تپے تپائے عالم اور مفکّر کا اپنے بعد کی نسل کو دیا جانے والا ایک حتمی پیغام بھی ہے۔ نذیر احمد ان خطوط میں جو لکیریں اور دائرے یا نقطے بناتے ہیں، ان سے صرف مولوی بشیر الدین کی زندگی کا معاملہ جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ انھی سے ایک بدلتے ہوئے ملک کی آیندہ زندگی کی تصویر بھی تیار ہوتی ہے۔ ایک اور جہت بھی اظہر من الشمس ہے۔ ماہرینِ تعلیم اس کتاب کے صفحات پر نگاہ ڈالیں کہ کس طرح ایک نوعمر اولاد کو عام خیر و عافیت کے پیرایے میں رائج تعلیم کا محاسبہ کرتے ہوئے نئی تعلیم کا خاکہ ذہن نشیں کرایا جا رہا ہے۔

نذیر احمد نے اپنے بیٹے کو خاص طور سے انگریزی تعلیم کے مقصد سے دہلی بھیجا تھا۔ وہ زمانہ انگریز زدگی کا تھا اور ہر کوئی اُسی طرف دوڑ رہا تھا۔ مولوی نذیر احمد کا بھی دوسروں سے کچھ الگ خیال نہیں تھا۔ انگریزی تعلیم کی اہمیت، افادیت اور سیکھنے سکھانے جیسے بنیادی امور پر الگ الگ مکاتیب میں جو باتیں گوش گزار کی گئی ہیں، انھیں مرتب کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کا اصولی اور عملی دونوں تجربہ رکھتے تھے اور خطوط میں اپنے بیٹے کو اس نئی تعلیم کی مستقل ترغیب دیتے رہے۔ ذیل کے جملوں پر ذرا ایک نگاہ ڈالنا چاہیے:

(۱) جہاں تک ہو سکے، بُری بھلی، غلط صحیح، ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنی چاہیے۔ (ص:۴)

(۲) تم اونچی کلاس کے لڑکوں سے تعارف پیدا کرو اور ہر روز تین چار گھنٹے انگریزی میں بات چیت کرو تاکہ جھجک اور رکاوٹ دور ہو۔ (ص:۴)

(۳) تمھارے ماسٹر ہندستانی یا انگریز جو ہوں، ان سے اردو میں ایک لفظ مت کہو۔ (ص:۴)

(۴) لیسن صاحب کی میم سے تجدیدِ تعارف کر لو۔ (ص:۴)

(۵) انگریزی مسودہ ہر روز لکھنا چاہیے۔ (ص:۵)

(۶) مجھ کو ہمیشہ انگریزی میں خط لکھو اور چوں کہ راز کی بات نہیں ہوتی، کسی ماسٹر یا کسی اونچی کلاس کے لڑکے یا کسی متعارف سے اس کو درست کرا لیا کرو۔ (ص:۵)

(۷) ایک کتاب انگریزی کمپوزیشن کی بنالو جس میں اپنا کمپوزیشن تاریخ وار لکھ کر اس میں سُرخی سے اصلاح لے لیا کرو اور اصلاح کو بہ نظرِ غور دیکھ کر یاد رکھو کہ پھر ویسی غلطی نہ ہو۔ (ص:۵)

(۸) میں نے سُنا ہے کہ تمھارے مدرسے میں..... ماسٹر صاحب ہیں اور وہ انگریزی کے بڑے ادیب ہیں۔ ان سے تعارف پیدا کرو۔ (ص:۵)

(۹) مدرسے کے خالی گھنٹے اور فرصت کے اوقات انگریزی گفتگو میں صَرف کرو۔ تفریح کی تفریح اور فائدے کا فائدہ۔ (ص:۷)

ان ہدایات میں نذیر احمد استاد کے استاد اور ایک مکمل سرپرست کے طور پر بھی نظر آتے ہیں۔ ایک نئی زبان سیکھنے کے لیے جتنے گُر آزمائے جاسکتے ہیں، انھیں نذیر احمد نے اپنے صاحبزادے کو بتا دیے۔ ان جملوں میں اصول بھی ہیں اور ان کے اطلاق کے پیمانے بھی۔ ان سب سے بڑھ کر وہ استادانہ ہوش مندی اور چالاکی بھی بین السطور میں سمو دی گئی ہے جس سے بہ ظاہر یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ طالب علم کی بغیر بتائے جانچ پرکھ کا ایک مکمل انتظام روا رکھا گیا ہے۔ یہاں بڑی معصومیت سے ایک ہمہ جہت نگرانی کا طور بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک غیر ملکی زبان سیکھنے کے سلسلے سے طالب علم کی سرگرمیاں کن پہلوؤں سے ہونی چاہئیں، نذیر احمد اس معاملے میں نہایت مستعدی کے ساتھ اپنی مدرسی اور سرپرستانہ خدمات انجام دیتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد انگریزی تعلیم کے بُرے پیروی کار نہیں تھے۔ انھیں انگریزی تعلیم کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کا بھی خیال تھا۔ مشرقی علوم کے سلسلے سے اُس زمانے میں بالعموم ناقدری کا ایک جوش بھرا ماحول تھا اور سرسید کی قیادت میں تحریک زوروں پر تھی لیکن نذیر احمد کو معلوم تھا کہ علم کی گہرائی اور کلاسیکی زبانوں کی ہم نشینی کے الگ ہی جلوے ہیں اور ان سے لیس ہوئے بغیر طالب علم بہرحال ادھورا رہے گا۔ بیٹے کو لکھتے ہیں:

■ ''بشیر! افسوس اگر تم نے عربی نہ پڑھی، عجیب چیز ہے۔ بُرے انگریزی داں جہاں دیکھیے، بے تمیز اور مبہوت: نہ اپنی کہہ سکیں اور نہ دوسرے کی سمجھیں۔'' (ص:۳۱)

■ ''انگریزی خوانوں میں بڑا، بہت بڑا، بہت ہی بڑا نقصان یہ دیکھنے میں

آیا کہ اُن لوگوں میں مطالعے کا دستور نہیں اور چوں کہ طبیعت پر غور و خوض کا بوجھ نہیں ڈالتے، میں نے جہاں تک دیکھا، استنباطِ مطلب میں اکثر خطا کرتے ہیں۔ آج کل کے بی۔اے، ایم۔اے، بات صاف تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کی نظروں میں مطلق نہیں جچتے۔ محالِ الفاظ اور تعلقاتِ سابق و لاحق اور عبارت کے اطراف و جوانب اور مضمون کے مالۂ و ماعلیہ پر بھی اُن کی نظر کو احاطہ کرتے نہ دیکھا۔ پس اِن کی مثال اُس غوطہ زن کی سی ہے جس میں قعرِ دریا تک پہنچنے کا دَم نہیں، ڈبکیاں لگاتا اور دُرِ مطلب کو نہیں پاتا۔'' (ص:۱۹۳)

■ ''اب تم انگریزی ایسی لکھتے ہو کہ مجھ کو مشکل سے غلطی ملتی ہے۔ اخبارِ انگریزی کا مطالعہ اور اس کا طرزِ ادائے مطلب خیال میں رکھنا بہت مفید ہوگا۔ عربی جو تمھارا موروثی علم ہے، اس کی طرف تم کو مطلق توجہ نہیں۔ افسوس!'' (ص:۱۶۹)

اس کے باوجود یہ سچائی اپنی جگہ قائم ہے کہ نذیر احمد اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم کی گوناگوں برکتوں سے مستفید کرنا چاہتے تھے ورنہ عربی کی تعلیم کے لیے انھیں اپنے صاحب زادے کو کسی دوسرے کے پاس کیوں کر بھیجنا تھا؟ انھیں معلوم تھا کہ عربی کی جو بنیاد انھوں نے قائم کر دی ہے، اسے رفتہ رفتہ اُن کی اولاد مستحکم کر لے گی۔ اس میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کا تدارک وہ خود کر سکتے تھے لیکن زمانے کو دیکھتے ہوئے اصل مقصد تو انگریزی تعلیم میں آگے بڑھنے کا تھا۔ وہ متعدد خطوط میں بیٹے کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ اُن سے الگ ہو کر دہلی میں صرف اس لیے قیام پذیر ہے کیوں کہ اُسے انگریزی تعلیم اور کالج کی زندگی اختیار کرنی ہے۔ اس لیے انگریزی زبان کی خصوصیات اور سیکھنے کی جدّ و جہد اور پھر ترغیب پیدا کرنے کے لیے پُر لطف واقعات کی شمولیت سے ان خطوط میں ایک دل پسند ماحول قائم کیا گیا ہے؛ ملاحظہ ہو:

■ ''کالج کے کتاب خانے کو جا کر دیکھو۔ عربی فارسی کی الماریوں میں پاؤ گے کتابیں متقدمین کی۔ کتاب زمانۂ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے جس قدر پُرانی، اُسی قدر ہم لوگوں میں معتبر اور مستند؛ برخلاف انگریزی کے کہ سو برس کی کتاب مثلِ تقویمِ پارینہ سلسلۂ درس سے خارج۔ شتان بینھما۔ اس سے ظاہر

ہوا کہ کسی علم میں ہم نے ترقی نہیں کی۔ کی ہوتی تو عظامِ رمیم کو کیوں پڑے پچوڑتے۔'' (ص:۱۹۴)

■ ''.......ڈپٹی کلکٹر کی استعدادِ انگریزی کچھ ایسی اچھی نہ تھی مگر انگریزی فیصلے خوب لکھتے تھے۔ بعض لوگ شبہ کرتے تھے کہ کسی سے لکھوا لاتے ہیں۔ میں نے اس کی ٹوہ لگائی تو معلوم ہوا کہ نظائر ہائی کورٹ کے چند (غالباً سو سوا سو) فیصلے ہیں کہ اوقاتِ فرصت میں اُن کو بالالتزام نقل کیا کرتے ہیں۔ نقل کرتے کرتے کورٹ لینگویج دھیان پر چڑھ گئی ہے اور کثرتِ کتابت سے سوادِ خط میں بھی پختگی کے نشان پیدا ہوگئے ہیں۔'' (ص:۱۹۵)

■ ''ایک دوست نے مجھ کو انگریزی میں ترقی کرنے کی یہ تدبیر بتائی تھی کہ اخبار سے چھوٹے چھوٹے مضامین مثلاً آٹھ آٹھ دس دس سطر کے پڑھ لیے اور پھر انھی مضامین کو آپ انگریزی میں لکھ کر اخبار سے مقابلہ کیا اور جہاں اختلاف ہوا، اُس کو غور سے دیکھ بھال لیا اور بہ تدریج مشق کو بڑھاتے گئے۔ مجھ کو اس تدبیر کے تجربہ کرنے کی تو فرصت نہیں ملی مگر عقل چاہتی ہے کہ بے شک مفید ہوگی، تم سے ہو سکے تو کر کے دیکھو۔'' (ص:۱۹۶)

■ ''جو لوگ گفت وشنود سے نہیں بلکہ کتاب بینی کے ذریعے سے انگریزی میں استعداد حاصل کرنا چاہتے ہیں (یاد رکھو کہ اخبار کا پڑھنا بھی داخلِ کتاب بینی ہے)! اکثر اُن سے ایک بڑی غلطی ہوتی ہے: وہ یہ کہ طرزِ عبارت سے قطع نظر کر کے محوِ مضامین ہو جاتے ہیں اور اُن کی محنت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مثلاً کئی گھنٹوں میں انھوں نے ایک اخبار پورا کیا۔ فارغ ہوئے تو اُن کو واقعات مستحفظ ہیں اور پیرایہ عبارت کسی ایک مضمون کا بھی یاد نہیں۔ اُن کی مثال ڈفالیوں کی سی ہے کہ ساری عمر گاتے بجاتے رہے اور تال اور سُر نہ جانا۔'' (ص:۱۹۶)

■ ''انگریزی جاننا فی الحقیقت ہم لوگوں کے حق میں الگ مصیبت ہے۔ میں

نے بڑے بھائی کا بنوایا ہوا مکان دیکھا اور انگریزی خیالات کے مطابق ناپسند کیا۔ مکان خوش قطع ہے، محکم ہے اور تھوڑی سی جگہ میں گنجائش بھی خاصی ہے۔ ضرورت کی کُل چیزیں ہیں یہاں تک کہ دو چور تہہ خانے بھی ہیں مگر وِنٹی لیشن کا نام نہیں۔ ہَوا جو کوٹھریوں کے پاٹتے وقت بند کی گئی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بے دون پمپ کے کیوں کر بدلی جا سکتی ہے۔ اس مکان کی زمین اس قدر مرتفع تھی کہ اگر مکان روشن اور ہوادار ہوتا تو بالا خانے کی کچھ ضرورت نہ تھی مگر ہوادار نہ ہونے سے گرمی کی رات اور موسم برسات کے قابل نہیں، ناچار بالا خانہ بنوانا پڑا۔" (ص:۱۸۶)

ڈپٹی نذیر احمد نے یہ خطوط یوں تو نہایت محدود مقاصد سے تحریر کیے۔ بیٹے کو اپنے احوال رقم کرتے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ اس کے جواب میں بچّے کی خیریت وصول ہو جائے۔ تمام والدین ایسا ہی کرتے ہیں لیکن نذیر احمد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دلّی کالج سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت میں آ گئے اور ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے جگہ جگہ گھومتے رہے۔ بے مثل عالم تھے، اس لیے لڑکے اور لڑکیوں کے مکتب اور مدارس یا اُن میں پڑھائی جا رہی کتابوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب ادارے اور ان کی درسی کتابیں قابلِ اطمینان نہیں۔ انھوں نے اپنے بچّوں کی تعلیمی ضرورتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے کتابیں لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اسی مرحلے میں دیکھتے دیکھتے وہ ناول نگار بن گئے۔ بعد میں وہ منصوبہ بند انداز میں اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی منہمک ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نذیر احمد سرتاپا استاد تھے۔ اپنے بچّوں کی غیر رسمی تربیت کے دوران اُن کی استادی کی صلاحیت میں ایسا نکھار آیا جس نے اُن کی شخصیت کا ایک علاحدہ لیکن نہایت پختہ رنگ باندھا۔ تصنیف و تالیف تک بھی وہ تدریس کے دروازے ہی سے پہنچے تھے۔ اس کام کی اساسی اہمیت سے وہ واقف تھے جس کی وجہ سے اپنے بچّے کو خیر و عافیت کی اطلاع دینے کے ساتھ پورے نظامِ تعلیم کی اصلاح کے اصول بھی وضع کرتے رہے۔ اپنے عملی تجربوں سے ان خطوط کو انھوں نے اتنا مالا مال کیا ہے جس کا سرسری مطالعے سے شاید کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ نذیر احمد کھلی آنکھوں سے دنیا دیکھنے والے آدمی تھے۔ دہلی کالج کی تعلیم نے انھیں ہر بات کی تہہ میں اُترنے اور وسیع دائرۂ کار میں نتائج اخذ کرنے کا شعور عطا کر دیا

تھا۔ ملازمت کے دوران جہاں گردی اور انگریز افسروں کی ہم نشینی نے انھیں یکسر بدل دیا تھا۔ ان سب سے مل کر اُن کی ایک نئی شخصیت قائم ہوئی جو عرفِ عام میں مجموعۂ اضداد کہی جاسکتی تھی لیکن یہ تھی شخصیت مولوی نذیر احمد کی جسے اس کی رنگارنگی اور بوقلمونی کے حوالے سے بہت بعد میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے پہچانا تھا۔ 'موعظۂ حسنہ' کے تمام خطوط سے جو نذیر احمد ابھرتے ہیں، وہ مولوی بھی ہیں اور جنٹل مین بھی؛ عربی بھی سکھانا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ انگریزی بھی سر چڑھ کر بولے۔ اُن کی خواہش ہے کہ ان کی اولاد کی نگاہ گہری اور باریک بیں ہو لیکن اس کی نظر وسیع اور پھیلی ہوئی بھی ہو۔ کردار کا بھی سچا چاہیے اور کاروبارِ دنیا کی مہارت بھی انھیں درکار ہے۔

نذیر احمد اسکول اور کالج میں بچّے کو بھیجتے ضرور ہیں لیکن انھیں معلوم ہے کہ یہ تعلیمی ادارے کارگر نہیں۔ جن اساتذہ کے سہارے یہ تعلیمی نظام قائم ہے؛ اُن کی استعداد پر انھیں کامل یقین نہیں لیکن اپنی اولاد کو جدید تعلیم سے انھیں لازماً آراستہ بھی کرنا ہے۔ یہ خطوط درس گاہوں کے لیے کُمک کا درجہ رکھتے ہیں۔ طالب علم اور اساتذہ دونوں نے مل جل کر جتنا سیکھنا سکھانا تھا، وہ تو کیا ہی لیکن جب مولوی نذیر احمد جیسا سرپرست ہو تو صرف اساتذہ کے بھروسے سب کچھ چھوڑ دینا ممکن نہیں تھا۔ تعلیمی اداروں کی صفوں میں جہاں جس پہلو سے کمی یا ابتری دیکھی، نذیر احمد نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے فوری طور پر علمی رسد مہیا کرا کر ادارہ جاتی تعلیم کو استحکام عطا کیا۔

نذیر احمد کے ذہن میں تعلیم کا ایک مبسوط تصور ہے۔ ڈگری یافتگی یا ملازمت ایک بات ہے اور بحرِ علم میں غوطہ زنی مختلف شے۔ علم کی پیاس اور اس کی گہرائی کو نذیر احمد تعلیم و تدریس کی معراج مانتے ہیں۔ اپنے فن میں کامل ہوئے بغیر کوئی طالب علم واقعتاً منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ نذیر احمد اپنی اولاد کو خود اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ شاید اپنے سے زیادہ بہتر کی انھیں تمنا ہے۔ اسی لیے زمانے کی روش کو دیکھتے ہوئے مغربی تعلیم میں وہ اپنی اولاد کو زیادہ پختہ کار اور کامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ نذیر احمد کے خطوط میں تعلیم کی اہمیت اور اس میں مہارت کے مدارج اتنے سلسلے وار انداز میں بیان کیے گئے ہیں جس سے نذیر احمد کا نقطۂ نظر آئینہ ہوجاتا ہے۔ انگریزی تعلیم کی مرکزیت کے سلسلے سے نذیر احمد کے خیالات گذشتہ سطور میں ہمیں معلوم ہو چکے ہیں، ان باتوں کے علاوہ نذیر احمد کے ایسے خیالات بھی قابلِ توجہ ہیں جب وہ زبان کی اہمیت اور تعلیم و تدریس کے ضمن میں ان پر خصوصی توجہ کی بات کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

■ ''عربی عبارت کی شرح بھی کبھی کبھی لکھ بھیجا کرو تا کہ مجھ کو معلوم ہو کہ تم کچھ کرتے ہو۔'' (ص:۲۲)

■ ''ایک زبان میں عمدہ معلومات ہوں تو دوسری زبانوں کے حاصل کرنے میں ضرور مدد ملتی ہے۔'' (ص:۶۱)

■ ''سب پر مقدم ادب ہے۔ جس کو انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں، یعنی زبان دانی۔ کمال زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہلِ زبان کی سی قدرت حاصل ہو۔'' (ص:۲)

■ ''جس طرح کے خیال اور مضمون کو جس پیرایے میں اہلِ زبان نے ادا کیا ہے، اس کی تقلید اور اس کی نقل کرنی چاہیے۔'' (ص:۲-۳)

■ ''سوائے زبان دانی دوسرا کوئی علم نہیں جس میں آدمی ساری عمر مشغول رہے۔'' (ص:۳)

■ ''زبان دانی کی استعداد بے شک کتابوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے مگر اہلِ زبان سے گفتگو بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے۔'' (ص:۴)

■ ''زبان دانی بے تسوید یعنی کمپوزیشن کے نہیں آتی اور اس خصوص میں تم نے میرے نزدیک غفلت کی، اور کرتے ہو۔'' (ص:۱۰۹-۱۰۸)

زبان دانی ایک جوہر ہے اور ایک ساتھ کئی زبانوں کا جاننا ہماری صلاحیت کو بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ ہمارے زمانے میں عالم کاری نے کثیر لسانی صورتِ حال کو زندگی کا لازمہ بنا دیا ہے لیکن آج سے سوا سو برس پہلے نذیر احمد اپنے دور میں ان باتوں سے پورے طور پر واقف تھے۔ اس راستے کی آسانیوں کو تو وہ سمجھتے ہی تھے لیکن اس سفر کے مشکل مراحل پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ زبان کی تعلیم کے بارے میں کامل ہونے کی بات وہ سو طرح سے اپنی اولاد کے دل میں بسا دینا چاہتے تھے۔ علم میں کرید اور ایک ایک لفظ کی تحقیق ان کا بتایا ہوا ایسا اصول ہے جسے شاید قیامت تک بدلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ وہ کہتے ہیں:

■ ''کامیابی کی تدبیرِ یقینی یہ ہے کہ جو پڑھا بہ تحقیق اور جتنا نظر سے گزرا یاد۔'' (ص:۶۱)

- ''کمالِ فن میں عجیب قدرت اور قوت ہے۔'' (ص:۶۱)
- ''جس تحقیق سے تم مجھ سے عربی پڑھتے تھے کہ ہر ہر لفظ کا مادّہ اور ماخذ اور صیغہ اور ترکیب کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی۔ یہی تحقیق فارسی اور انگریزی کل زبانوں میں ہے۔'' (ص:۳)
- ''جب کسی کتاب کا سبق لے کر بیٹھو، خود لفظ لفظ پر نظر کرتے جاؤ۔'' (ص:۳)
- ''ہر لفظ میں بال کی کھال نکال لیا کرو؛ مادّہ اور صیغہ اور ترکیب اور معنی اور مطلب۔'' (ص:۷)

مرزا فرحت اللہ بیگ نے صحیح علم کے متلاشی طلبہ کے بارے میں نذیر احمد کی پسندیدگی کا ذکر اپنے خاکے میں کیا ہے۔ نذیر احمد ان خطوط میں بھی اپنے بیٹے کو ایسا ہی طالب علم بنانا چاہتے ہیں جو روز آگے کی طرف بڑھتا جائے۔ علم کے پَروں سے طالب علم اُڑے اور اُن منزلوں تک پہنچے جہاں دوسروں کے لیے پہنچنا ایک خواب ہو۔ ذیل کے اقتباسات میں یہ بات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ نذیر احمد کس طرح تعلیمی ترغیب علمی اور مہارتِ تامّہ پیدا کرنا چاہتے ہیں:

- ''خوش خطی بھی عجیب ہنر ہے، خواہ مخواہ اچھا خط دل کو بھلا لگتا ہے۔ اگر کالج میں خط کو درست نہ کرو تو خیر، بگڑنے دینا بھی عقل کی بات نہیں۔ چندے بنا کر، ہاتھ روک کر لکھو، پھر تو گھسیٹ بھی اچھی ہوگی۔'' (ص:۱۳)
- ''بے شک کلاس میں ۴۰ر طلبہ ہیں اور سب پر سبقت لے جانا مشکل ہے لیکن آخر کوئی تو اوّل ہوگا؟ کیا وجہ کہ وہ 'کوئی' تم نہ ہو اور دوسرا ہو۔ ابھی چالیس دیکھ کر ڈرے؛ اجی حضرت، یونی ورسٹی کے امتحان میں ہزاروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔'' (ص:۶۰)
- ''کتابیں تمھارے پاس بہت ہیں مگر سب رکھنے کی ہیں۔ اگر اِن کتابوں پر نظر محققانہ ہو تو آدمی عالم ہو جائے۔'' (ص:۸)
- ''محنت سے جان چُرانا تو طالب علم کا کام نہیں ہے اور پھر یہ بھی کوئی محنت

ہے کہ خدا کے فضل سے ہر طرح کے آرام کے ساتھ گھر میں رہنا اور پڑھنا۔ وہ بھی بندگانِ خدا ہیں جو دن بھر کلھاڑی چلاتے، سڑک کوٹتے، دوڑتے، راتوں کو جاگتے، بوجھ ڈھوتے؛ ہزاروں شکر ہے کہ شاقہ محنت میں مبتلا نہیں کیے گئے۔ محنت ایک امر اضافی ہے، اس کا مفہوم متعین نہیں۔ ایک کام زید کے واسطے محنت کا ہے مگر شاید خالد کے حق میں وہ کامل آسائش کا موجب ہے۔ پس جس کو تم نے محنت سمجھا کیا تم جیسے اور تم سے بہتر ہزاروں لاکھوں اُس کو نہیں کرتے۔ افسوس ہے کہ تم اس کو محنت کہو۔ ارے بابا! اگر یہ محنت بھی ہے تو ساری عمر کا آرام، ساری عمر کی خوش حالی، ساری عمر کی آبرو اس محنت کے طفیل سے حاصل ہوگی۔'' (ص:۲۲-۱۲۱)

نذیر احمد یہاں اخلاق اور نصیحت پر گفتگو کی بنیاد نہیں رکھتے ہیں بلکہ منطقی استدلال کے سہارے اپنی باتیں پیش کرتے ہیں۔ تجربہ اور علم کے گہرے سمندروں سے متھ کر دلیلیں نکالی گئی ہیں۔ اسی لیے وہ وقت کا بہترین مصرف لینے کی تاکید کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کی اولاد نے اپنے اوقات کا سلیقہ مند اور کارآمد استعمال نہیں کیا تو اس کی مٹھی سے وقت کی چڑیا نکل جائے گی۔ وقت کا بہتر استعمال ہمارے لیے ترقی کے راستے کھولتا ہے۔ نذیر احمد نے کیا خوب کہا ہے:

- ''وقت کو انتظام کے ساتھ صَرف کرنے میں عجب برکت ہے۔ تھوڑا تھوڑا روز حاصل کرتے کرتے ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔'' (ص:۱۰۹)
- ''روز کا کام روز کرنا ضرور ہے۔ جو سبق پڑھا، اچھی طرح اُس کو سمجھ کر قابو میں کرلیا۔ غافل لڑکے سبق جمع کرتے جاتے ہیں اور امتحان کے زمانے میں انبار مصیبت ہو جاتا ہے۔'' (ص:۷)
- ''اپنے باہر کے اوقات منضبط کرلو کہ فلاں وقت یہ کام کریں گے اور جب اپنے کُل اوقات منضبط کر چکو، مجھ کو بھی اطلاع دو۔ اس انتظام میں اس کا بڑا خیال رکھو کہ طبیعت پر اتنا بوجھ نہ پڑنے پائے کہ گھبرا جائے۔ جب تک خوش دلی ہے، سب کام اچھا ہوتا ہے؛ بے دلی پیدا ہوئی اور کام بگڑا۔'' (ص:۷)

نذیر احمد خود ایک مکمل استاد تھے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ خطوط لکھتے وقت وہ اپنے اس کام سے پیچھے ہٹ جائیں۔ ذرا دیکھیے کہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا عربی زبان کا استاد کس طرح زبان اور علم کے نئے نئے پہلو روشن کرتا چلتا ہے:

■ ''مختصر اور گول 'ۃ' کے قاعدے کو زیادہ صاف کر ڈالیں۔ واضح ہو کہ سوائے الفاظ عربی کے گول 'ۃ' لکھنی روا نہیں کیوں کہ یہ رسم خط عربی کی ہے اور بس۔ عجمی الفاظ میں ہمیشہ لمبی 'ت' لکھنی ہوگی۔ جیسے بُت، دست، آتش پرست، مست، ہمالیہ پربت، سورت، مورت۔ عربی میں صرف چار قسم کی لمبی 'ت' لکھی جاتی ہے۔۔۔ ان چار قسموں کے علاوہ جتنی تیکیں ہیں، سب کو مختصر یا گول لکھنا ہوگا۔'' (ص: ٦٧)

■ ''کیوں جی، خیریت کیا لفظ ہے؟ ضرور عربی ہے۔ خیر وشر ایک دوسرے کی ضد ہیں؛ پس 'ی' اور 'ت' مصدری ہوگی جیسے قابلیت، جاہلیت۔ 'ی' اور 'ت' لگا کر صرف صفت کے صیغوں کو مصدر بناتے ہیں، یعنی اسم فاعل، اسم مفعول، صفت مشبہ: چنانچہ لفظ خیر اسم اور صفت دونوں ہے۔ 'بھلائی' اور 'بھلا' تو خیریت ٹھہرا لیکن در حالے کہ لفظ خیر خود مصدر ہے، گو اس کو 'ی'، 'ت' لگا کر مصدر بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ چناں چہ خیر وعافیت کہتے ہیں: پس آئندہ سے صرف خیر یا خیر وعافیت لکھا کرو۔'' (ص: ٨٧)

■ ''تمھارے خطوط میں بہت سی غلطیاں سہل انگاری سے رہ جاتی ہیں۔ اگر بہ تامل نظر ثانی کر لیا کرو تو ضرور تم خود اُن کو درست کر لیا کرو۔'' (ص: ١٠٨)

■ ''تم نے صرف ونحو فارسی میں پڑھا کہ زبانِ فارسی میں 'ذ' نہیں تو 'گذارش' نہیں، 'گزارش' چاہیے۔'' (ص: ١٣٠)

■ ''میرے پاس اس مقام پر لغت کی کوئی کتاب نہیں اور تم نے عبارت سابقہ ولاحقہ لکھی نہیں کہ اس کے سہارے سے جواب دوں۔ پس جہاں تک اس وقت معلوم ہے، تمھارے مستفسرات کا جواب لکھتا ہوں۔ جن کا جواب شافی اس وقت نہیں

دے سکتا، یا تو وہاں حل کرا لو یا یہیں سے قبلِ امتحان حل کر کے بھیج دوں گا۔''

(ص:۱۱۰)

حصولِ علم کے لیے وقتاً فوقتاً رسمی اداروں سے دور چلے جانا بھی لازمی ہوتا ہے۔ نذیر احمد تعلیم کی غیر رسمی فصیلوں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حصولِ علم کی منزل اور ذرائع دونوں لامحدود ہیں، اس لیے اس کی تلاش میں جو نکلے، اسے بھی اتنی تمنا، شوق اور جسارتیں ساتھ رکھنی چاہئیں۔ ایک سرپرست اور استاد کا یہ فرض ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والے کو اگلی منزل کے لیے بھی راستہ دکھائے۔ وہ کہتے ہیں:

- ''میں تم کو عام اجازت دیتا ہوں کہ تحصیلِ علم و استعداد کے لیے صَرفِ زر میں مطلق تامل مت کرو۔ میں اس خرچ کو خوشی سے ادا کروں گا۔'' (ص:۱۰)
- ''میں اس کو زیادہ پسند کرتا کہ تم تعطیل میں علی گڑھ جاتے اور سید احمد خاں صاحب کے پاس رہ کر استفادہ کرتے۔ تمہارے خیالات کو اُن سے بہت نفع ہوتا۔'' (ص:۱۶۹)

نذیر احمد کے ان خطوط میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی جہاں دیدنی بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اس جہاں دیدنی میں اپنے علم یا مشاہدے کا اظہار مقصود نہیں بلکہ دورانِ گفتگو کوئی ایسی بات آ گئی ہے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کے مشاہدات درکِ کاملہ کا ثبوت ہیں۔ ذیل کے جملے تجربات کی بھٹی میں تپ کر مستقبل کی دیواروں پر کندہ عبارتوں کے پڑھتے ہوئے رقم ہوئے ہیں:

- ''مدراس شہر کا ہے کو ہے، آدمیوں کا جنگل ہے۔ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ کلکتہ چھوڑ کر ہندستان کے کُل شہروں سے بڑا ہے۔ انگریزی کا اس قدر رواج ہے کہ بی۔ اے۔ سوداگروں کے یہاں دس دس روپے بلکہ اس سے کم پر چٹھی نویسی کرتے ہیں۔ مدراس، بنگلور دیکھنے سے مجھ کو یقین ہوا کہ اب سے ستر یا غایت درجہ سو برس بعد بہ شرط بقائے عمل داریِ انگریزی ہماری ملکی زبان انگریزی ہو جائے گی۔ ان دو شہروں میں انگریزی کی یہ کثرت ہے اور ضرور یہی حال کلکتے اور بمبئی کا ہوگا کہ بازاری کنجڑے، بھٹیارے انگریزی بولتے ہیں۔'' (ص:۱۶۹)

■ ''لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک کردے گی لیکن علی الرغم التوقع چند سال سے دیکھتے ہیں کہ دونوں قوموں میں الٹی ایک طرح کی مخاصمت سی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اگر یہ مخاصمت صرف طرفین کے عوام میں ہوتو کچھ پروا کی بات نہیں مگر افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ اور اعلا کمنڈ لوگوں کے دلوں میں تکدّر آگیا ہے۔ یہ باہمی نفاق اگر جڑ پکڑ گیا، ممکن نہیں کہ ملک کو پنپنے دے۔ اس فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے تاریخوں نے جو سرکاری مدارس کے کورس میں داخل ہیں۔'' (ص:۲۰۲)

■ ''یہ ایک مشہور بات ہے کہ آدمی جس شہر میں رہے، وہاں کے طبیب اور کوتوال سے دوستی پیدا کرے۔ تم بھی اس کا خیال رکھو۔'' (ص:۱۱)

نذیر احمد ہندستان کے بدلتے نظامِ تعلیم کے پروردہ تھے۔ وہ مدارس سے نکل کر کالج کی سیڑھیوں پر چڑھے اور پھر انگلش انتظامیہ کا حصہ بنے۔ اپنی اولاد کو اس سے آگے کی منزل تک وہ لے جانا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے تعلیم کو ایک نظام کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ سسٹم کی بنیادی خوبی اور خامی پر نظر نہ رکھی جائے تو اس نظام سے اچھا حاصل کرنا مشکل ہے۔ وہ سرسیّد کی طرح انگریزی تعلیم کے یک رخے عاشق نہیں ہیں، اسی لیے جہاں وہ جدید تعلیمی اداروں کا احتساب ان لفظوں میں کرتے ہیں:

■ ''پڑھائی کم، تعطیلیں زیادہ، استاد نامہربان، ہم سبق شیطان۔'' (ص:۳۰)

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مدارس کی تعلیم کی ایک خاص بات وہ اس طرح روشن کرتے ہیں:

■ ''مدارس کی تعلیم میں اگر پسندیدگی ہے تو یہی کہ مختلف علوم اور حصۂ د فنون ایک ساتھ سکھاتے ہیں۔ اگر ایک ہی چیز کو آدمی دن بھر رَٹا کرے تو طبیعت اُکتا جاتی ہے لیکن اگر کئی چیزیں پیشِ نظر ہوں اور باری باری سے دیکھے تو سارا دن پڑھتا رہے اور مطلق جی نہ گھبرائے۔'' (ص:۱۰۹)

اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ یہ ذاتی خطوط عوامی اپیل رکھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نذیر احمد نے اس میں ایسی کوئی بات شامل ہی نہیں کی جسے ایک باپ کو اپنے بیٹے سے کہنا چاہیے تھا۔ اگر یہ بات سچ ہو

جائے تو ان خطوط پر نئے زاویے سے بحث قائم ہونے لگے گی۔ وہ زمانہ قومی فیضان میں خود کو لُٹا دینے کا تھا۔ سرسید ہی نہیں، ان کے تمام رفقا اپنی ذات سے زیادہ قوم کی فکر میں سرگرداں رہے۔ اس لیے اگر اولاد بھی بہ طور مخاطب سامنے ہو، تب بھی موضوع کی بنیادی تان قوم پر ٹوٹے گی۔ ان خطوط میں بھی نذیر احمد کا یہی انداز ہے۔ لیکن جگہ جگہ باپ کے دھڑکتے ہوئے دل کی صدائیں بھی عود کر آتی ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ یہ باپ بھی قومی اور تعلیمی ذی روح زیادہ ہے۔ چند جملے ملاحظہ کیجیے:

■ ''تم بھائی بہن مل کر ماں کو تسلّی دو اور سمجھاؤ۔ غموں کے مارے اُن کا بدن بہت تحلیل ہو گیا ہے۔۔۔۔ چند روز کے لیے ایسا التزام کرو کہ اکثر اپنی ماں کے پاس بیٹھا کرو تا کہ ان کو ایذادہ تصوّرات کا موقع نہ ملے۔'' (ص:٦٨)

■ ''اب تم کو اپنا انتظام خود کرنا پڑے گا۔ اس کو سمجھ لو کہ لوگوں پر ہمارے حقوق کچھ نہیں اور ایسے نفوسِ قدسی جو دوسروں کو بے وجہ منفعت پہنچائیں، کم ہیں۔ پس اگر کوئی بے اعتنائی کرے تو افسردہ خاطر نہ ہونا چاہیے۔'' (ص:۹)

■ ''ذرا کھانے پینے میں احتیاط رکھا کرو؛ وہ احتیاط یہ ہے کہ اوقات منضبط؛ خلاف وقت مت کھایا کرو اور اقسام اطعمہ بھی مضر ہیں۔ ایک غذا سے جو جی کو بھائے، پیٹ بھر لینا ضامن تندرستی ہے۔'' (ص:٢٧)

■ ''ایک تمھارے دوست اور تشریف لائے۔ یہ وہ لڑکا ہے جو اعظم گڑھ بھی گیا تھا۔ غالب ہے کہ اس نے تم سے میرا پتا پایا اور دہلی میں تمھارے پاس رہا یا ٹھہرا۔ اگر تم ایسے نالائق اور بدوضع لڑکوں سے تعارف اور ملاقات رکھتے ہو تو بھلے مانس رہ نہیں سکتے۔ بشیر، ذرا احتیاط کرو۔ قرآن میں آیا ہے کہ 'من الجنۃ والناس'۔ اس طرح کے آدمیوں پر شیطان کا اطلاق کیا گیا ہے۔'' (ص:١٣٩)

■ ''صفائی سے رہو مگر زینت جو تمہید بدوضعی و آوارگی ہے، خبردار، مت اختیار کرو۔'' (ص:١١-١٠)

سرسید کی تعلیمی فکر اور مہم جوئی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ان کے معاصرین میں اس درجے تک شاید ہی کوئی

پہنچتا ہو لیکن ادارہ سازی میں انہماک کے سبب سرسیّد کی مدرّسانہ حیثیت کا کوئی بڑا نقش ہمارے سامنے نہیں آتا۔ ان کی تحریر اور تقریر میں ہمیشہ ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچنے کا جو جوش ہے، وہ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ رنگ قیادت کرنے والوں کا ہے لیکن ایک استاد یا مدرّس کو قومی قیادت جیسی باتوں سے کس قدر سروکار ہوتا ہے؟ استاد کو ایک مختصر سی جماعت، چند طالب علم اور کتابیں چاہئیں؛ اس کی زندگی بسر ہو جائے گی۔ نذیر احمد بھلے انتظامیہ کے افسر اور اپنے زمانے کے منتخب خطیب اور عالمِ دین تھے لیکن اصلاً وہ تھے مدرّس ہی۔ ان کے ناولوں پر بھی سب سے بڑا اعتراض جس مُبلّغانہ عنصر کی وجہ سے قائم ہوتا ہے، وہ فی الحقیقت ایک استاد کی عمومی شان ہے۔ نذیر احمد کے خطوط اس درجے کے ہیں جنھیں ہم ۱۳۵ برس بعد بھی ایک ایسا تعلیمی منشور قرار دے سکتے ہیں جس میں نئی تعلیم اور مستقبل کے نظامِ تعلیم کا عمومی خاکہ موجود ہے۔

ہمارے زمانے میں تعلیم کی ہمہ گیری اور کارآمد بننے بنانے کی بات ہر ماہرِ تعلیم کرتا ہے لیکن یہ بھی سامنے آتا رہتا ہے کہ اعلا تعلیم کے معیار میں گراوٹ آرہی ہے۔ فکرمندی اس بات پر ہے کہ اتنے وسیع تعلیمی ڈھانچے کے باوجود ملک میں نہ کوئی نوبیل ایوارڈ مل رہا ہے اور نہ ہی علمی سطح پر ہمارے فارغین کی عالمی شناخت قائم ہو رہی ہے۔ ایسی حالت میں نذیر احمد کے ان خطوط میں وہ نسخۂ کیمیا موجود ہے جس سے ہم آج بھی اس نظام میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ نذیر احمد کی فکر ہے کہ لیاقت اعلا پائے کی نہ ہو تو تعلیم کس لیے ہے؟ کالج اور یونی ورسٹیوں سے نذیر احمد علم کے سب سے اونچے، گھنے اور باثمر پیڑوں کے متلاشی ہیں۔ وہ درس گاہوں سے نکلنے والی ایسی جماعت کا خواب دیکھتے تھے جو اپنے انہماک، ارتکاز، عمق اور وسعت کے ساتھ ساتھ 'دردوسوز آرزومندی' کا طلب گار ہو۔ اپنی اولاد کی تعلیمی پیش رفت سے وہ بار بار مایوس ہوتے ہیں تو اس کی بنیاد میں ایک ایسی عظیم توقع ہے جو کم و بیش مثالی کہی جا سکتی ہے۔ آج جن صاحبانِ علم کے دل میں یہ تمنا ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں اور کالجوں سے اعلا ذہن اور دماغ کے افراد پیدا ہوں، انھیں نذیر احمد کی اس کتاب کے ورق ورق میں پیوست تعلیم و تدریس کے اصولوں سے واقف ہو لینا چاہیے۔ نذیر احمد کو صرف ایک ناول نگار یا عالمِ دین سمجھ کر تعلیمی دائرے سے باہر کا فرد سمجھنا ہماری بڑی بھول ہوگی۔

(2013)

خاندانِ شروانی کے ایک فرزند کی زندگی کی

''دھوپ چھاؤں''

برِّ صغیر ہند و پاک کے ادبی منظر نامے پر گوناگوں علمی سرگرمیوں اور مختلف دلچسپیوں کے ساتھ جو ایک سرگرم معمّر نسل دکھائی دے رہی ہے، اس میں خانوادۂ صدیق مکرم حبیب الرحمان شروانی کی زندہ یادگار ریاض الرحمان شروانی واقعتاً ہمارے لیے باقیات الصالحات کا درجہ رکھتے ہیں۔ سو کی عمر میں دس بارہ ہی بچے ہیں لیکن اُن کے مضامین، کتابیں اور علی گڑھ کانفرنس گزٹ کا تواتر سے شائع ہونا اسی طرح قائم ہے۔ کمال یہ کہ تازہ ترین ضروری کتابوں پر وہ خود تبصرہ کریں گے اور دوسروں کے مضامین یا خطوط کے سلسلے سے ضروری حواشی سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ صحت و تندرستی کے ساتھ جاہ و منصب کے عروج پر موجود افراد بالعموم ان سرگرمیوں کا دسواں حصّہ بھی انجام نہیں دے پاتے۔ کمالِ احتیاط یہ ہے کہ ریاض الرحمان شروانی صرف انھی موضوعات پر قلم اُٹھاتے ہیں جن پر اُن کی گہری نظر ہے۔ وہ عمومی موضوعات کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔

ریاض الرحمان شروانی یوں تو ماہرِ ابوالکلام آزاد ہیں اور اپنی مشہور کتاب ''میرِ کارواں'' کی وجہ سے امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں لیکن پچھلے دنوں ان کی ایک مختصر خودنوشت ''دھوپ چھاؤں'' عنوان سے شائع ہوئی جس میں ان کی زندگی کے محض آٹھ برس (۴۹-۱۹۴۱ء) کے مختلف واقعات شامل ہیں۔ مصنف اگر دوسرے لوگوں کی طرح علمی ہوس کاری میں مبتلا ہوتا تو تھوڑے بہت اور حالات شامل کر کے دوسروں کی طرح ایک مکمل خودنوشت کا دعوا پیش کر دیتا۔ لیکن یہاں اپنی زندگی کے مختصر وقفے کی چند باتیں پیش کر کے شاید مصنف کچھ دوسرا ہی مقصد طے کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ عہد مصنف کی یونی ورسٹی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قبل از وقت

ہوگا کہ مصنف علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی تعلیمی زندگی کو ہی اس خودنوشت میں محور بنانا چاہتا ہے۔ لیکن ہمیں یاد ہونا چاہیے کہ ریاض الرحمان شیروانی کی اس تعلیمی زندگی میں ۴۸۔۱۹۴۶ء کا وہ نازک زمانہ بھی شامل ہے جس نے برِ صغیر کا نئے سرے سے مقصد طے کیا اور قتل وخون کے جانے کتنے خوفناک سلسلے سامنے آئے۔ ریاض الرحمان شروانی خود بھی اس طوفان کے تھپیڑوں میں زندگی کی ننگی سچائیاں دیکھنے کے لیے بے بس تھے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور تقسیمِ ملک کے واقعات کی وجہ سے اس خودنوشت کا دائرۂ کار بہت وسیع ہوجاتا ہے۔ انھی امور کے پیشِ نظر مصنف نے اپنی زندگی کے آٹھ نو برس اس خودنوشت کے لیے منتخب کیے ہیں۔

سب سے پہلے ریاض الرحمان خاں شروانی نے اپنے خاندان کے واقعات کو اختصار کے ساتھ بہ طورِ پس منظر پیش کیا ہے۔ ۳۸ صفحات میں کئی سو برسوں کے کرداروں کو سمیٹتے ہوئے حقیقت پسندانہ انداز کو روا رکھا گیا ہے۔ بادشاہوں سے اپنے خاندان کے تعلق کو بتاتے ہوئے انھوں نے غیر ضروری طور پر اسلاف کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر نہیں پیش کیا۔ عام طور پر خودنوشتوں میں جھوٹ سچ کا پلندہ تیار کر کے ہر آدمی اپنے خاندان اور اسلاف کی ٹوپی اونچی رکھنے میں حقیقت سے پرے جانے میں جھجکتا نہیں، جس سے اکثر خودنوشتیں تنازعات کا شکار ہوتی ہیں اور اُن میں بیان کردہ صداقت کی تصدیق وتوثیق دوسرے ذرائع سے لازم ہوجاتی ہے۔ ریاض الرحمان شروانی نے اپنے خاندان کے جن کرداروں کو پیش کیا ہے، ان کے بعض اوقات نہایت دلکش مرقعے بھی سامنے آگئے ہیں۔ تفصیل سے گریز کا حیرت انگیز عمل یہاں دیکھنے کو ملتا ہے جس کی وجہ سے چار پانچ سو برس کی تاریخ اور بہت سارے افرادِ خاندان کے واقعات فلم کی ریل کی طرح آنکھوں کے سامنے آتے ہیں اور اپنی جھلک دکھا کر رخصت ہوجاتے ہیں۔

ریاض الرحمان شروانی نے خاندانی پس منظر اور واقعات کی پیش کش میں اپنے ممدوح ابوالکلام آزاد کا اتباع نہیں کیا ورنہ 'تذکرہ' کی طرح ایک مکمل جلد تو اسلاف کی شان میں مکمل ہوہی جاتی۔ ریاض الرحمان صاحب کو یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ بادشاہوں اور امرا کی زندگی میں تو یوں بھی سچے جھوٹے واقعات بھرے رہتے ہیں۔ ایسے قصوں کے گڑھنے والے ماہرین بھی دربار میں موجود ہوتے ہیں جس کے سبب واقعات کے اصلی اور نقلی پہلو خودرَو پودے کی طرح بڑھتے جاتے ہیں۔ ریاض الرحمان شروانی نے اپنے اسلاف کے بارے میں جو بتایا، اس میں اسلاف کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی نگاہ رکھی۔ خوبیوں کے بیان میں کبھی بھی یہ صورت نہیں

پیدا ہونے دی جس سے محسوس ہو کہ وہ اپنے اسلاف کو چاند ستاروں کی جگہ دلانا چاہتے ہیں۔

کسی بھی خودنوشت میں مصنف ہیرو ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنی شخصیت کے تار و پود کچھ اس طرح سے گڑھتے ہیں جس سے یہ التباس قایم ہو کہ اگر وہ پیدا نہیں ہوتے تو قومی زندگی کا نظام بگڑ جاتا۔ ریاض الرحمان شروانی نے خودنوشت لکھنے کے باوجود خود کو ایسی مرکزیت بخشنے میں دلچسپی نہیں لی۔ اس خودنوشت کا یہ ایسا جمہوری مزاج ہے جس پر دوسرے معاصرین کی ہزار ڈینگیں قربان ہو جائیں۔ اپنے آبا و اجداد اور اہلِ خاندان کے بارے میں ریاض الرحمان شروانی نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چند اقتباسات بہ طورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

(۱) ''دوسرے ایک بیٹے بٹن کی ایک بیٹی بی بی متو تھیں۔ ان کا تعلق علاقہ غور کے سید شاہ حسین سے ہو گیا اور اس کے نتیجے میں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام غل زئی رکھا گیا (یعنی چور کی اولاد)۔ بعد ازاں بی بی متو اور شاہ حسین کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد دو بیٹے پیدا ہوئے، لودی (بہ معنی کلاں) اور سروانی۔ کثرتِ استعمال سے سروانی بدل کر شروانی ہو گیا۔'' (ص:۱۱)

(۲) ''نواب مزمل اللہ خاں شروانی نے ۱۹۲۷ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی گولڈن جوبلی کے موقعے پر اُسے ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم چندے میں دی اور خود اپنے خرچ سے مسلم یونی ورسٹی میں مزمل ہوسٹل تعمیر کرایا جو وقار الملک ہال کا حصہ ہے۔ ان کی داد و دہش کی مسلم یونی ورسٹی میں اور بھی کئی یادگاریں ہیں۔ مثلاً آفتاب ہوسٹل کا ڈائننگ ہال اور اولڈ بوائز لاج کا مرکزی ہال۔ مسلم یونی ورسٹی کے مختلف امتحانات میں مختلف مضامین میں اوّل آنے والے طلبہ و طالبات کو اُن کی طرف سے آج تک سونے کے تمغے ملتے ہیں۔ ان کی داد و دہش مسلم یونی ورسٹی تک محدود نہیں تھی۔ انھوں نے بنارس ہندو یونی ورسٹی کو بھی ایک بڑی رقم چندے میں دی تھی۔ ان کا ایک بڑا اعزاز یہ ہے کہ حرم مکّہ میں بجلی کا انجن سب سے پہلے انھوں نے لگوایا تھا، اس سے قبل وہاں بجلی نہیں تھی۔'' (ص:۱۸)

(۳) ''مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کا ایک بڑا کارنامہ حبیب گنج کا کتب

خانہ ہے،جس میں بالخصوص فارسی اور عربی کے بیش بہا مخطوطات ہیں۔اب یہ کتب خانہ مولانا آزاد لائبریری،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی زینت ہے۔اس کی وصیت خود انھوں نے اپنے وقف نامے میں کی تھی۔اگر کبھی حبیب گنج میں کتب خانے کی حفاظت کا مناسب انتظام نہ رہے یا اس کی افادیت علی گڑھ منتقل کیے جانے کی صورت میں بڑھ جانے کی توقع ہو تو اِسے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو دے دیا جائے۔اس وصیت کی تکمیل ان کے صاحب زادے اور جانشیں مولوی عبیدالرحمان خاں شروانی نے ۱۹۶۱ء میں کی۔ قلق اس کا ہے کہ جب تک کتب خانہ حبیب گنج میں رہا،ہر چیز ہر طرح محفوظ رہی لیکن مسلم یونی ورسٹی میں آجانے کے بعد وہاں سے مرزا غالب کی نایاب تصویر چوری ہوگئی۔ بعض اور تصاویر کی بھی چوری ہوئی تھی جن میں جہاں گیر کے مصوّر منصور کی بنائی ہوئی گلِ لالہ کی بیش بہا تصویر بھی شامل تھی لیکن اللہ مغفرت فرمائے،اس وقت کے وزیرِ تعلیم،حکومت ہند ڈاکٹر سیّد نورالحسن کو جن کی خصوصی توجہ سے یہ چوری پکڑی گئی اور سب تصاویر بر آمد ہوگئیں۔ اورنگ زیب کے ذاتی استعمال کی تلوار،جو تکیۂ اورنگ زیب کے نام سے مشہور تھی،اس کتب خانے کی ایک اور نادر یادگار ہے۔"(ص:۴۸-۴۷)

(۴) "بعض ایسے بنگی بھی ہیں جو اس کے برعکس شروانی کہلانا پسند نہیں کرتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ پٹھانوں میں بنگی سب سے افضل ہیں۔یہ سب جاہلی تصوّرات ہیں۔افسوس ہے کہ ان سے ابھی تک ہمیں چھٹکارا نہیں ملا ہے۔"(ص:۴۳)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ریاض الرحمان شروانی نے اپنے خاندان اور افرادِ خاندان کے بارے میں بتاتے ہوئے ممکن حد تک معروضی نقطۂ نظر اور ترقی پسندانہ اندازِ فکر کو محور بنایا ہے۔ بادشاہت،امرا اور رؤسا کا بھی جہاں ذکر ہے،وہاں ایک عوامی رنگ آگیا ہے اور بدلتی ہوئی زندگی میں فلاحی اور جمہوری آدابِ سلطنت کی دھمک صاف صاف سنائی دے رہی ہے۔اس سے مختصراً ہندستان کی قومی بیداری یا قومی

تحریک کے عمومی اثرات کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ماحول اور ذہنی فضا میں ریاض الرحمان شروانی کی پرورش ہوئی جس کے نتیجے میں وہ قومی سیاست میں نیشنلسٹ (Nationalist) اندازِ فکر کے ترجمان بن کر اُبھرے۔

'رودادِ حیات' میں تقریباً سو صفحات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی وابستگی کے اظہار کے لیے وقف ہیں۔ ان میں بالعموم اپنے حلقۂ احباب کے افراد سب سے روشن ہیں۔ چند اساتذہ اور کچھ وائس چانسلر صاحبان کی تصویریں اجاگر ہو رہی ہیں۔ اُس زمانے کی بعض سیاسی اور سماجی شخصیات کی جگہ جگہ جھلکیاں بھی دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ افراد کے اوصاف بیان کرنے کے مرحلے میں ریاض الرحمان شروانی اس عہد، سیاست اور سماج کے بدلتے مناظر کے رنگ و بو بھی ساتھ ساتھ سمیٹتے چلتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ خودنوشت بھانت بھانت کے لوگوں کا اصطبل بن جاتی۔ لیکن اکثر کردار اپنے زمانے کے چند مخصوص رویّوں کا ترجمان بن کر ہمیں جزو میں کل کا لطف فراہم کرتے ہیں۔

یہ خودنوشت مصنف کی یونی ورسٹی کی زندگی سے متعلق ہے، اس لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کتاب کے ہر صفحے پر نمایاں ہے۔ 'پس منظر' میں بھی اور 'رودادِ حیات' میں بھی؛ اور یہاں تک کہ تقسیم ملک کے فسادات، کیمپ میں قیام اور مہلوکین کے ساتھ لاہور کی ہجرت، پھر لاہور میں نئے سرے سے زندگی کی تعمیر و تشکیل اور وہاں سے ہندستان واپسی؛ کسی بھی مرحلے میں مصنف علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے افراد اور معاملات کے تذکرے سے غافل نہیں ہوتا۔ اُس زمانے میں قومی سطح پر اسلامیانِ ہند کی دانش ورانہ قیادت کا بڑا حصّہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے فرزندان سے منسلک ہوگا۔ ان آٹھ نو برسوں میں یونی ورسٹی کی زندگی میں کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور کن افراد سے وہاں فائدہ یا نقصان پہنچا، ان سب کا گوشوارہ سلسلے وار طریقے سے اس کتاب کی مدد سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب باتیں افراد کی خصوصیات بیان کرنے کے دوران اپنے آپ چلی آئی ہیں۔ مصنف نے ایک جملہ بھی الگ سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی تاریخ پیش کرنے میں خرچ نہیں کیا۔

ریاض الرحمان شروانی نے اس عہد کے ان اساتذہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جنھوں نے گھر یا مسلم یونی ورسٹی میں انھیں پڑھایا تھا۔ سات دہائیوں کے بعد اب کے اساتذہ سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے حوصلہ افزا صورت حال نہیں پیدا ہوتی۔ اس زمانے میں بھی کچھ بُرے اور فرض ناشناس اساتذہ سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی خالی نہیں تھی۔ چند جملوں میں شروانی صاحب نے اپنے بعض اساتذہ کے ایسے مرقعے پیش کر دیے ہیں

جن سے ایک ساتھ تاریخ، ادب، تعلیم و تدریس اور دیگر امور اپنے آپ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ عربی کے اپنے اساتذہ میمن اور مفتی عبداللطیف صاحبان کے بارے میں مشاہدات ملاحظہ کیجیے:

■ ''وہ کتاب کے معنی و مفہوم تو بتاتے ہی تھے، اپنے شاگردوں میں ادبِ عربی کے ذوق کی بھی نشو و نما فرماتے تھے۔ نہایت سادہ مزاج بزرگ تھے۔ حافظہ بلا کا ملا تھا۔ ایک شعر آیا اور میمن صاحب نے اس کے ہم معنی دس شعر سنا دیے اور ہر شعر کی باریکیاں بتا دیں یا جس قصیدے کا شعر ہے، وہ پورا قصیدہ پڑھ کر سنا دیا۔ ان کا ایک پسندیدہ لفظ 'ہول ناک' تھا: فلاں ادیب ہول ناک قابلیت کا مالک ہے اور فلاں کتاب ہول ناک عظمت کی حامل ہے۔'' (ص:۱۳۱)

■ ''یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ان (مولانا مفتی عبداللطیف) جیسا فاضل، روشن خیال اور شفیق استاد پڑھانے کو ملا۔ میں نے حبیب گنج سے قاہرہ تک اپنی ۴۴ سالہ رسمی تعلیم کے دوران کتاب میں ڈوب کر پڑھانے والے استاد صرف دو ہی دیکھے: مفتی صاحب مرحوم اور انگریزی کے استاد سیّد مختار حامد علی صاحب۔۔۔ مفتی عبداللطیف صاحب سے دینی علوم کا حصول میری زندگی کا ایک بہت اہم اور خوش گوار موڑ ہے۔ میں نے مفتی صاحب سے بعض ناگزیر ناغوں کے ساتھ دو قسطوں میں نو برس تحصیلِ علم کی، ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک اور پھر ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء۔ میں نے ۱۹۵۳ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ عربی میں لکچرر ہو جانے کے بعد ہی مفتی صاحب سے پڑھنا چھوڑا۔'' (ص:۸۱۔۸۰)

ریاض الرحمان شروانی بجا طور پر نازاں ہیں کہ انھیں لائق اساتذہ ملے جنھوں نے ان کی علمی زندگی کی ایسی ٹھوس بنیاد رکھی جس کے سہارے وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ اپنی خودنوشت میں ریاض الرحمان شروانی نے مزید دو اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ پہلے انگریزی کے نجی استاد سیّد مظہر علیم اور دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر برکت علی قریشی۔ مظہر علیم نے انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی، اردو، مذہبی ادب، تاریخ کی تدریس کے ساتھ ساتھ انھیں تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا۔ برکت علی قریشی نے شروانی صاحب کو تقسیمِ ملک کے

بعد لاہور میں ایم۔اے فائنل میں عربی پڑھائی۔دونوں اساتذہ کے طریقۂ تدریس پر ریاض الرحمان شروانی نے اپنے جو مشاہدات درج کیے ہیں، وہ نہایت قیمتی ہیں اور ہمارے لیے موجودہ عہد کی بے ہنری میں آہِ سرد کھینچنے کی مجبوری ہے۔دونوں اساتذہ کا تذکرہ ریاض الرحمان شروانی کی زبانی سُنیے:

(۱) ''مجھے پڑھنے کی لَت اُسی وقت سے تھی جب مجھے پڑھنا آیا لیکن ابھی یہ امتیاز پیدا نہیں ہوا تھا کہ کیا پڑھنا چاہیے اور کیا نہیں۔اس معاملے میں میری رہ نمائی میرے انگریزی کے نجی استاد سیّد مظہر علیم صاحب فرید آبادی نے کی۔کہنے کو وہ انگریزی کے استاد تھے لیکن انھوں نے ریاضی کے علاوہ سب مضامین پڑھائے۔یہاں تک کہ میری عربی ادب سے بھی ان ہی کے ذریعے شناسائی ہوئی تھی۔اب تک میں نے عربی کے نام پر صرف صَرف ونحو، فقہ، اصولِ فقہ اور منطق پڑھی تھی۔انھوں نے مجھے القرأۃ الرشیدہ کا سِٹ منگوا کر دیا اور اس کا پہلا حصّہ خود پڑھایا (وہ عربی سے بھی واقف تھے)۔ اس زمانے میں مَیں نے اُن کے مشورے سے جو کتابیں پڑھی تھیں، یاد آتا ہے، ان میں میں حالی کی 'حیاتِ سعدی'، اپنے دادا صاحب (مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی) کی تصانیف 'سیرۃ الصدیق' اور 'علمائے سلف'، سیّد احمد مرتضٰی کی 'صولتِ شیر شاہی' اور سیّد الطاف علی بریلوی کی 'حیاتِ حافظ رحمت خاں' سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میرے اندر مضمون نویسی کا شوق بھی انھوں نے ہی پیدا کیا تھا۔میرا پہلا مضمون ۱۹۳۸ء میں ہفت روزہ 'معین'، اجمیر میں شیر شاہ سوری پر شائع ہوا تھا۔لیکن اسکول میں آ کر میرا غیر تدریسی مطالعہ تقریباً ختم ہو گیا، ساری توجہ درسیات کی طرف تھی''۔(ص:۷۔۶)

(۲) ''پروفیسر برکت علی قریشی بہت سنجیدہ اور باوقار شخص تھے؛ نِک سِک سے درست رہتے تھے۔ان کا طرزِ تعلیم یہ تھا کہ باری باری مختلف طلبہ سے کتاب کی قرأت کراتے اور وہی طالب علم کتاب کا ترجمہ کرتا اور مطلب بتاتا۔اگر وہ کہیں رُکتا یا غلطی کرتا تو قریشی صاحب دوسرے طلبہ سے رجوع فرماتے۔ایسا شاذ ہوتا کہ مسئلہ حل نہ

ہو جاتا اور قریشی صاحب کو خود اصلاح کی ضرورت پیش آتی۔ اس طرزِ تدریس کا فائدہ
یہ تھا کہ سب طالب علم تیاری کر کے آتے اور مستعد رہتے، ان میں کوئی رقابت پیدا نہ
ہوتی اور نہ کسی طالب علم کو ادعائے برتری ہوتا۔ ہمارے سب ساتھی بہت اچھے تھے،
مِل جُل کر رہتے تھے، ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے"۔ (ص:۱۶۹)

اس خودنوشت کے ۴۰ صفحات تقسیمِ ملک کے نتائج پر حاوی ہیں۔ مصنف کی بہن علاج کے تعلق سے ہماچل کے کسولی میں اپنے خاندان کے بعض افراد کے ساتھ ایک خاص مدت تک مقیم تھیں۔ ایم۔ اے۔ سالِ اوّل کا امتحان دے کر ریاض الرحمان شروانی مئی ۱۹۴۷ء میں تیمارداری کی غرض سے کسولی پہنچے۔ رفتہ رفتہ سیاسی صورتِ حال بدلتی چلی گئی۔ فسادات اور جینے مرنے کے حالات وہاں بھی پیدا ہوتے گئے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو مریض اور تیماردار سب ملٹری ٹرک میں بٹھا کر کالکا کے لیے روانہ کردیے گئے جہاں رفیوجی کیمپ کھولا گیا تھا۔ نو دس دن مع خاندان کیمپ میں رہ کر پھر کالکا سے بہ ذریعۂ ریل انھیں لاہور بھیجا گیا۔ یہ قافلہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچا۔ وہاں پھر سے ادھوری تعلیم کی تکمیل کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی میں سالِ دوم میں داخلہ لیا۔ پھر مارچ ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ واپس پہنچے۔ اس دور کے عمومی واقعات تو انھوں نے نہیں بتائے لیکن اپنی زندگی سے جڑے ہوئے معاملات کی پیش کش کے دوران واقعات و مشاہدات کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جہاں ہندو پاک کی تاریخ کے سب سے مشکل دور کی کچھ آہیں، کچھ شکستِ خواب اور لرزیدہ تمنائیں زندگی کا حصّہ ہو گئی ہیں۔ یہاں ریاض الرحمان شروانی قومی تاریخ کے ایک نازک دور کا عمومی کردار بن جاتے ہیں جس کے سہارے اس قیامتِ صغرا کی آپ بیتی لہو رُلاتے ہوئے ہمارے سامنے ہوتی ہے۔

خودنوشت کے آخری حصّے میں واقعات کی پیش کش میں اختصار کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح واقعات کے بیان میں معروضیت کا طور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خودنوشت ظاہری طور پر الفاظ و صفحات کی قبا کے سبب مختصر ورنہ جہانِ معنی کی سیر کو مقصد تصوّر کریں تو یہ کتنی طول طویل، معلوماتی اور تجزیاتی کتابوں پر بھاری ہے۔ زندگی اور کائنات کے بہت سارے اچھوتے رنگ اس خودنوشت میں اس طرح ابھرتے، ڈوبتے دکھائی دیتے ہیں جیسے یہ معلوم ہو کہ مصنف قطرے میں دجلہ دکھانے کا ماہر ہے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں جلوے ہیں لیکن حقیقت کا سونا سب پر چڑھا ہوا ہے۔ اسی لیے کہیں بھی تعصب، کینہ، ابتذال،

مکر اور جھوٹ کا پلندہ نہیں تیار ہوا حالاں کہ بعض خود نوشتیں حقیقت کو مسمار کرنے کے لیے یا اپنے بُرے کاموں کی صفائی پیش کرنے کے مقاصد تک محدود ہوتی ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے قیام سے لے کر تقسیمِ ملک تک ہندستانی سیاست کے ایسے کئی باب ہیں جن کے بعض امور پر مصنف نے خاص طور پر غور و فکر سے کام لیا ہے۔ ریاض الرحمان شروانی نے تحریکِ آزادی اور تقسیم ملک کے معاملات میں کوئی لمبا چوڑا جائزہ تو نہیں لیا لیکن جگہ جگہ ایسے واقعات ضرور شامل کر دیے ہیں جن سے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ مسلم یونی ورسٹی کی فضا اُس زمانے میں دوراندیشانہ سیاست سے دور چلی گئی تھی جس کے سبب بعض ایسے مسائل پیدا ہوئے جو ہنوز حل نہیں کیے جا سکے۔ 'دھوپ چھاؤں' کے مطالعے کی ایک بنیادی جہت لازماً ہندستانی سیاست کی نازک کیفیت کا بیان ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کی آپسی چپقلش اس طور پر بڑھی ہوئی تھی جیسے اصل مسئلہ ملک کی آزادی نہیں بلکہ دونوں سیاسی پارٹیوں کی حصے داری ہے۔ ریاض الرحمان شروانی نے سیاست کے اس کھیل تماشے کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے حلقے میں پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ شروانی صاحب کا ماننا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی مسلم لیگ کے استحکام کا ایک ٹھوس ذریعہ بن گئی تھی۔ ریاض الرحمان شروانی کے مشاہدات اس اعتبار سے قیمتی ہیں کیوں کہ انھوں نے حالات اور واقعات کے سلسلے کو بدلتی ہوئی صورتِ حال میں پیوست کر کے ہندستانی سیاست اور ہماری درس گاہوں کے ناگفتہ بہ گٹھ جوڑ کو ثابت کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ چند مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں جو اس سلسلے سے ہماری آنکھیں کھول دیں گے:

■ ''علی گڑھ میں مسٹر محمد علی جناح کی سالانہ وزٹ ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ وہ بہ ظاہر یوں تو یونی ورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی دعوت پر تشریف لاتے تھے لیکن دو، تین دن پوری یونی ورسٹی ان کے اعزاز و اکرام میں لگی رہتی تھی۔ وہ مسلم یونی ورسٹی کو The arsenal of Muslim youth in India (ہندستانی مسلمانوں کا اسلحہ خانہ) کہتے تھے۔'' (ص:۱۱۹)

■ ''مسلم لیگ کی گرفت مسلم یونی ورسٹی پر اتنی مضبوط تھی کہ کوئی غیر مسلم لیگی الیکشن میں حصہ لینا تو علاحدہ رہا، یونین میں تقریر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونسٹ اور

کانگریسی دو بڑی گالیاں تھیں۔'' (ص:۲۱_۱۲۰)

■ ''اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کا انتخاب جناح صاحب فرماتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں شاہ محمد سلیمان اور ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ان کا ہی انتخاب تھے۔'' (ص:۱۴۷)

■ ''علی گڑھ میگزین (اردو) کے ایڈیٹر ایک صاحب عبدالقدیر رضوی تھے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کر لیا تھا، اب اردو میں ایم۔ اے۔ کر رہے تھے، میکڈانل ہوسٹل میں رہتے تھے۔ انھوں نے میگزین میں بہار کے فساد سے متعلق ایک بہت سخت اور اشتعال انگیز اداریہ لکھا۔ اس میں ایسی زبان استعمال کی گئی تھی جیسے کرپلانی کے سُور، گاندھی کے کتّے۔ (اچاریہ کرپلانی اس زمانے میں کانگریس کے صدر تھے)۔ ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن نے اس کا سخت نوٹس لیا۔ اب یو۔ پی۔ میں کانگریس کی حکومت تھی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سے کہا گیا کہ میگزین کے جو شمارے ابھی تقسیم نہیں ہوئے ہیں، انھیں یونی ورسٹی خلاف قانون قرار دے دے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک رات یونی ورسٹی کے دو اساتذہ کو رضوی صاحب کے کمرے پر بھیج کر وہ شمارے اُٹھوا لیے''۔ (ص:۱۳۵)

■ ''ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد کی طلبہ نے سخت بے حرمتی کی اور ان سے بالجبر استعفا لے لیا، استعفا غیور صاحب کے پاس آگیا۔ استعفے کا وہ کاغذ بے معنی تھا، اس میں کسی کو مخاطب نہیں کیا گیا تھا۔ بس ڈاکٹر صاحب نے اتنا لکھ دیا تھا کہ میں مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری سے مستعفی ہو جاتا ہوں۔ یہ وہ ڈاکٹر صاحب تھے جن کی سب سے بڑی کم زوری طالب علم تھے اور جن کی خاطر انھوں نے طرح طرح کے الزامات برداشت کیے تھے۔ آج کے طالب علم نہیں تھے؛ موجودہ طالب علموں کے دادا، نانا بلکہ بعض صورتوں میں پَر دادا، پَر نانا کی نسل کے طالب علم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کے طالب علم بہت نالائق، غیر مہذب اور نافرمان ہیں۔ کیا میری نسل کے طالب علم ان

سے کسی معنی میں بھی بہتر تھے؟ مولانا ابوالکلام آزاد سے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد تک انھوں نے کس کس کے ساتھ کیا کیا گستاخی نہیں کی تھی۔ اس واقعے کا ڈاکٹر صاحب کے بعض مخالفوں نے بھی بہت اثر لیا۔ خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں یونی ورسٹی کے معاملات میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے سخت مخالف تھے۔ اب روتے تھے اور کہتے تھے کہ سرسید کے جانشیں کی توہین ناقابلِ برداشت ہے۔ اس سے قبل اور اس کے بعد کی نسل کے بزرگ وائس چانسلر کو سرسید کا جانشیں ہی قرار دیتے تھے''۔ (ص: ۳۶-۱۳۵)

■ ''اس دوران یونی ورسٹی میں کئی ایسے واقعات پیش آئے تھے جنھوں نے ہمیں تکلیف پہنچائی تھی اور ہم بہت اُداس اور دل برداشتہ تھے۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر طالب علموں کی ایک جماعت نے مولانا آزاد کے ساتھ جو بے ہودہ اور ناروا برتاو کیا تھا اور جو گستاخی اور ان کی جو توہین کی تھی، اس کی وجہ سے ہمارے سر پہلے ہی شرم سے جھکے ہوئے تھے...... مولانا آزاد کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کے چشم دید گواہ آج بھی ڈاکٹر رویندر خواجہ موجود ہیں۔ وہ دہلی سے اپنے والد عبدالمجید خواجہ صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ جب لڑکوں کی نظر خواجہ صاحب پر پڑی تو انھوں نے کہا کہ پہلے چھوٹے شکار سے نمٹ لیں، پھر بڑے شکار کی طرف جائیں گے اور اس کی خبر لیں گے...... مولانا آزاد کے چہرے پر ملال تھا لیکن غصہ نہیں تھا۔ اس واقعے کے بعد مولانا آزاد کو جس نے بھی اظہارِ ملال کا خط لکھا، انھوں نے ایک ہی جواب دیا۔ آپ ان لڑکوں کو معاف کر دیجیے۔ یہ نادان ہیں، انھیں بہکایا گیا ہے۔ خطا اُن کی نہیں ہے، ان کو بہکانے والوں کی ہے''۔ (ص: ۴۴-۱۴۳)

ایسا نہیں ہے کہ مسلم لیگ سے اپنی غیر وابستگی کی وجہ سے ریاض الرحمان شروانی نے ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ وہ اُس دور کی ہندستانی سیاست سے کیسا پُر درد رشتہ رکھتے ہیں، اسے جاننے کے لیے مصنف کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح سے ہے۔ وہ ایک بہترین مشاہد اور باخبر شہری کے طور پر اِن امور کا جائزہ لیتے ہیں۔ اسی لیے کمال حد تک معروضیت کا ساتھ ہوتا ہے۔ چند مختصر تصویریں ملاحظہ کیجیے جن سے یہ اندازہ لگانا

مشکل نہیں کہ اُس وقت کس طرح ہندستانی سیاست کانٹوں کی سیج بن گئی اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کے خواب کیسے چکنا چور ہونے لگے۔ ہندستانی سیاست دیکھتے دیکھتے کیسے فرقہ پرستانہ جنگل میں پہنچ گئی:

■ ''یہ اپریل ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ میرے قریبی بڑے بھائی عبدا لصبور خاں شروانی کے بیٹے ظل ا لصبور خاں (سلیم میاں) کے عقیقے کی دعوت تھی۔ بڑا مجمع تھا۔ پورے مجمعے میں شاید مولوی عبدالشاہد خاں شروانی اور میں دو ہی غیر مسلم لیگی تھے۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شہد کی مکھیاں ہم دونوں پر چاروں طرف سے ڈنک مار رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ہر خاندان اور ہر گھر میں اس نوعیت کے سیاسی اختلاف تھے اور مسلم لیگیوں کی طرف سے ان کا نہایت جارحانہ اظہار ہوتا تھا۔'' (ص:۱۰۷)

■ ''میری یہ قطعی رائے ہے کہ ملک کی تقسیم کی اصلی ذمّے داری مسٹر محمد علی جناح کے حُبِ جاہ (ambition) اور ناعاقبت اندیشی اور مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی جذباتیت پر عائد ہوتی ہے۔ برادرانِ وطن کے ایک طبقے کی تنگ نظری بلکہ مسلم دشمنی اور کانگریسی لیڈرشپ کی آزادی کے لیے جلد بازی، ان سب امور نے تقسیم کو ممکن بنایا لیکن اس کے لیے تحریک مسلم لیگ نے چلائی تھی اور اس نے اس تحریک میں اتنی شدت پیدا کر دی تھی کہ جو اُس کا حامی نہیں تھا، اگر غیر مسلم تھا تو دشمن تھا اور اگر مسلم تھا تو غدار تھا۔ بس ایک طبقہ آنکھ اٹھا کر اور سینہ تان کر کہہ سکتا ہے کہ وہ اس خود غرضی اور کوتاہ اندیشی سے قطعاً مبرّا ہے اور اس کا دامن تقسیمِ ملک سے پاک ہے: وہ ہیں ہم نیشنلسٹ مسلمان۔'' (ص:۱۱۵)

■ ''مولانا حفظ الرحمان کا یہ جملہ دل پر نقش ہو گیا ہے: ''ملک کی تقسیم ہمارے آج تک کے کام پر پانی پھیر دے گی۔'' اور اس نے پانی پھیر دیا۔'' (ص:۱۳۹)

■ ''(تقسیمِ ملک پر) میرا پہلا ردِ عمل اپنے لیڈروں کے خلاف غصّے کا تھا کہ انھوں نے پاکستان کیوں قبول کیا؟ مسلم لیگ تو پاکستان چاہتی تھی اور وہ اُسے مل

گیا تھا۔اس سے کیا شکایت ہوسکتی تھی۔شکایت تو اُن لوگوں سے تھی جو کہتے تھے پاکستان میری لاش پر بنے گا (گاندھی جی) یا پاکستان قطعاً ایک غیر منطقی اور غیر عملی تصور ہے (پنڈت نہرو)۔سوائے نیشنلسٹ مسلمانوں کے،کون کہہ سکتا ہے کہ تقسیمِ ہند کی حصہ داری سے یک سر سبک دوش ہے''۔(ص:۴۹-۱۴۸)

■ ''جب ماؤنٹ بٹن نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس کے سوائے مسائل کا کوئی حل نہیں تھا۔کیبنٹ مشن پلان بہترین حل تھا لیکن چوں کہ اس پر عمل نہیں ہوسکا،اب مجبوراً اس پلان کو منظور کرنا پڑ رہا ہے۔اس کے بعد سردار پٹیل کی تقریر ہوئی،انھوں نے مولانا آزاد کی تردید کی اور کہا کہ کیبنٹ مشن پلان کی صورت میں ہمارے سر پر تلوار لٹکی رہتی،اب ہمارے ہاتھ کھل گئے ہیں،ہم ملک کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے۔''اپنی مرضی'' کا جو مطلب تھا،وہ واضح ہے اور ملک اسی نہج پر چل رہا ہے،پھر رونا کس بات کا؟ جو مسلم فرقہ پرست چاہتے تھے،وہ ہوا؛ جو ہندو فرقہ پرست چاہتے تھے،وہ ہوا بھی،اور ہو بھی رہا ہے۔''(ص:۱۴۹)

ریاض الرحمان شروانی نے فرقہ واریت اور اس کے جنون کی آنکھوں دیکھی تصویریں بھی اس کتاب میں پیش کردی ہیں۔اُن کی زندگی نے ایسی کروٹ لی کہ آزادی سے پہلے ہی فرقہ وارانہ ماحول نے ان کو اس طرح شکنجے میں لے لیا کہ کہاں مسلم لیگ اور تقسیمِ ملک کا مخالف اور کہاں بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان کی طرف رفیوجی بن کر پہنچ جانا۔اس خودنوشت میں ریاض الرحمان شروانی نے اپنی زندگی کے اس حصے کو بلاشبہ جسم و جگر سے لہو نکال کر رقم کیا ہے۔اشارے اور واقعات مختصر ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا اور چشم کشا ہیں۔ملاحظہ ہو:

■ ''اگر نوا کھالی میں جان و مال اور عزت و آبرو کا زیادہ نقصان ہندوؤں کا ہوا تھا تو گڑھ مکتیشر اور بہار میں مسلمانوں کا اتلا اضعافاً مضاعفہ ہوا۔''(ص:۱۳۳)

■ ''عبوری حکومت کی تشکیل کے بعد مسلم لیگ نے یومِ راست عمل منایا۔ بنگال کے وزیرِ اعلا حسین سہروردی نے تعطیلِ عام کا اعلان کردیا۔کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔یہ ایسے فسادات تھے جیسے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے اور ان

فسادات نے ملک میں ایسی روایت قائم کی کہ ان کے بعد جہاں جو فساد ہوا، پہلے سے زیادہ سنگین ہوا۔ روزنامہ اسٹیٹس مین، نئی دہلی، جس کا نظم اس وقت انگریزوں کے ہاتھ میں تھا، نے اسے (Great Calcutta Killing) کلکتہ کا عظیم قتل وغارت) لکھا تھا۔ یہ فساد کلکتہ سے نوا کھالی، وہاں سے بہار، بہار سے یوپی میں گڑھ مکتیشر ضلع میرٹھ پہنچا اور پھر کچھ وقفے کے بعد اس نے پنجاب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ابھی یہ فساد کلکتہ سے نکل کر نوا کھالی ہی پہنچا تھا کہ اس کی دھمک پنجاب میں پہنچ گئی۔ کسولی سینی ٹوریم میں ایک بنگالی ڈاکٹر متمکن تھے، ان کے ہم سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ فساد کے دوران اُن کے بعض اعزہ کو نوا کھالی چھوڑنی پڑی تھی اور انھوں نے کسی دوسرے شہر میں پناہ لی تھی۔ یہ اس خطرے کی پہلی گھنٹی تھی جس نے ۱۹۴۷ء میں پورے پنجاب کو تہ وبالا کر دیا اور ہمیں بھی ایسے طوفان سے گزرنا پڑا جس نے ہماری ، اور خاص طور سے میری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔" (ص:۱۳۰)

■ "یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ہندستان کو آزادی جمعۃ الوداع کو ملی تھی اور اس کے دو، تین دن بعد ہی عید تھی۔ ہمیں آنے والی تباہی کی چتاؤنی رمضان آتے ہی مل گئی تھی۔ کچھ عجیب اتفاق تھا جس وقت ہم ایلزیم ہال میں نماز تراویح پڑھ رہے ہوتے ہیں، اُس کی چھت پر اینٹوں کی بارش ہونے لگتی۔ پہاڑوں پر چھتیں ٹین کی ہوتی ہیں، بہت شور ہوتا، نماز پڑھنا دشوار ہو جاتا۔ اس صورتِ حال سے محب الرحمان بہت پریشان تھے، وہ زیادہ تر مسلمانوں کی مانند مسلم لیگی ہی تھے اور قیامِ پاکستان کے اعلان سے بہت خوش تھے لیکن اس نئی افتاد سے پریشان بھی وہی سب سے زیادہ تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: کیا ہم سب یہیں مر جائیں گے؟ میں نے جواب دیا: جو اللہ کا حکم ہوگا، وہ ہو کر رہے گا۔ انھوں نے کہا: نہیں، ایسے تو نہیں مرنا چاہیے۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔" (ص:۱۵۰)

■ ''جب ہم عید کی نماز پڑھنے کے لیے گئے تو سارا ماحول اپنا دشمن نظر آتا تھا۔ سکھوں کی تیوریاں خاص طور سے چڑھی ہوئی تھیں۔ پھر تو حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ جس کوٹھی میں ہم رہ رہے تھے، وہ ایک سکھ ہی کی کوٹھی تھی۔ اس کے مالک کا جوان بیٹا، جو تقریباً میرا ہم عمر تھا، ہر مہینے کی شروعات میں کرایہ لینے کے لیے آتا تھا۔ ستمبر کے شروع میں آیا تو اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ کہنے لگا: نئی سرحد کے اُس پار داڑھی والے (سکھ) کتنے بلّیوں کی طرح مارے جا رہے ہیں اور تم یہاں اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہو۔ بالآخر ہم بھی بیٹھے نہیں رہ سکے اور جلدی ہی ہمیں بھی آگ کا دریا پار کرنا پڑا۔'' (ص:۱۵۲)

■ ''اس وقت پنجاب میں اصلی مقابلہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تھا، ہندو پیچھے تھے۔ ان میں سے بعض یقیناً اس صورتِ حال سے محظوظ ہو رہے تھے اور سکھوں کو شہ دے رہے تھے لیکن خود میدان میں بہت کم تھے۔ سینی ٹوریم کا کیشیر، جس سے ہمارا رات دن کا واسطہ تھا، کیسے پُرتمسخر انداز میں کہتا تھا کہ بے چارے بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ یہاں رہیں تو موت، یہاں سے جائیں تو موت، کیا کریں۔'' (ص:۱۵۵)

مسلم لیگ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، تقسیمِ ملک کی سیاست اور فرقہ وارانہ فسادات کے آگ اور خون کو سمجھنے کے پس منظر کے طور پر مہاجر کیمپ اور کاکا سے لاہور تک ٹرین کے سفر کے تھوڑے واقعات اس کتاب سے براہِ راست پڑھ لیے جائیں تو موضوعاتی دائرۂ کار مکمل ہو جائے گا۔ اس دوران انسانیت اور انسانی مقدر کے بیچ ایک چونکھ ٹکراؤ کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی انسانیت ہارتی ہے تو کبھی حیوانیت کی بھیڑ سے کوئی فرشتہ نکل آتا ہے اور زندگی دھوپ اور چھاؤں کا ناقابلِ بیان تماشا بنی رہتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''کاکا کا رفیوجی کیمپ کینٹ میں کھولا گیا تھا۔ ٹرک کھڑے کرنے کا طویل شیڈ خالی کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں طرف سے کھلا ہوا تھا، بس سر پر ٹین کی چھت تھی۔ کہا گیا کہ عورتیں، بچے، مریض اور بوڑھے اس میں رہیں گے اور جوان اور توانا مرد کھلے

میدان میں۔ ہم سرِ شام وہاں پہنچے تھے اور کھلے میدان میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ پیر
سڑ صاحب نے فرمایا: کل اس وقت لاہور میں نان اور سیخ کے کباب کھا رہے ہوں
گے۔ ایک اور صاحب اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے: پاکستان جا کر سونے چاندی کے
لڈو پیڑے کھانے کو ملیں گے۔ اتنے میں گھٹا اُٹھی اور زوردار بارش ہونے لگی تو نہ کسی کو
نان کباب یاد رہے اور نہ سونے چاندی کے لڈو پیڑے۔ کہاں جائیں اور کہاں سمائیں،
سب اُٹھ کر ادھر اُدھر بھاگے۔ لوگوں کو زیادہ تر پیڑوں کے سائے کی تلاش تھی لیکن اس
میدان میں پیڑ بہت کم تھے۔ ہمیں کہیں سے ایک چٹائی ہاتھ آگئی۔ محب الرحمٰن اور میں
اپنے سروں پر اُسے تان کر کھڑے ہوگئے۔ ایسی راتیں متواتر آئیں۔ ایک رات میں
زیادہ ضبط نہیں کر سکا تو شیڈ میں جا کر والدہ کو اُٹھایا کہ اب آپ جاگیں، میں سوؤں گا۔
کیمپ میں راشن کا انتظام تھا، جن کے پاس پیسے تھے انھیں قیمتاً ملتا تھا، باقی پناہ گزینوں کو
مفت۔ اب محب الرحمٰن خاں چیت گئے تھے اور یہ سب انتظام وہی کرتے تھے۔ راشن مل
گیا، میدان میں اینٹوں کا چولھا جلایا گیا، ہانڈی چڑھا دی گئی کہ ایک دم آسمان سے نزول
رحمت ہونے لگا، چولھا سرد اور ہم کھانے کے منتظر۔ خوانچے والے آنے لگے، شروع میں
لوگوں کو تامّل تھا کہ ان سے خرید کر کیسے کھائیں، زہر نہ ملا دیا ہو لیکن بھوک بُری بلا ہے،
خرید کر کھانے لگے مگر کوئی مَرا نہیں۔ بھلا مسلمان اور گوشت نہیں کھائے۔ گوشت کی
خواہش کا جگہ جگہ سے اظہار ہونے لگا۔ ہماری نگرانی پر بلوچی فوج متعین تھی، وہ گوشت
کی سب سے زیادہ شوقین۔ پناہ گزینوں میں مقامی قصائی بھی تھے۔ انھوں نے کہا: ہم
اپنے جانور اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے سپرد کر آئے ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ فوج کا سپاہی
جائے تو ہم گوشت بنا کر لائیں۔ سپاہی گیا، گوشت آیا اور کھایا گیا۔ بواجی کو پیچش
ہوگئی۔ فوجی ڈاکٹر سکھ تھا، اس کی دی ہوئی دوا کیسے کھاتیں، نہ معلوم دوا دے گا یا زہر۔ خیر
خدا نے فضل کیا اور بغیر علاج ہی کے شفا ہوگئی"۔ (۵۶-۱۵۵)

اس خودنوشت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ حالات اور واقعات کی پیش کش میں مصنف نے نہایت

غوروفکر سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کتاب میں مصنف کی ایک علاحدہ دانش ورانہ حیثیت اُجاگر ہوتی ہے۔ اشخاص کا جائزہ لیتے ہوئے وہ کسی جذباتی لہر میں نہیں بہتے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس شخصیت کے مجموعی کارناموں کے تناظر میں اپنی رائے قائم کریں۔ اس معاملے میں وہ علمی اور قومی طور پر افادہ بخش ہونے کو معیار بناتے ہیں۔ اشخاص کے بارے میں ان کے تبصرے بے لاگ اور وسیع تناظر میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

- ''نواب بہادر یار جنگ میں جملہ بعض دیگر خصوصیات اور اوصاف مثلاً جوشِ ایمانی اور جرأت و مردانگی کے، بے مثل خطیب تھے۔ میں نے اردو میں ان سے بہتر تقریر آج تک کسی سے نہیں سُنی ہے۔.... کشمیر گئے تھے۔ وہاں مہاراجا ہری سنگھ کی حکومت نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ جب رہا ہوئے تو حیدرآباد جاتے ہوئے علی گڑھ تشریف لائے۔ اسٹوڈنٹس یونین ہال میں تقریر ہوئی۔ تقریر کشمیر ہی کی صورتِ حال پر تھی۔ تقریر کیا کرتے تھے، کہیں پھول برساتے تھے اور کہیں شعلے بھڑکاتے تھے۔ دورانِ تقریر اُٹھ کر جانا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ہر شخص مبہوت بنا ان کی تقریر سنتا رہتا تھا۔'' (ص:۸۸)

- ''ذاکر صاحب نے فرمایا: آپ (ضیاء الحسن فاروقی، سعید اختر اور ریاض الرحمان شروانی) ایم۔اے کر کے جامعہ ملّیہ آجایئے۔ زیادہ تو نہیں، جامعہ آپ کو ایک سو روپے ماہوار دے گی۔ وہاں رہ کر تحقیق کیجیے اور اپنی تحقیق کے نتائج سے طلبہ کو واقف کرایئے۔ یہ آخری بات کوئی ماہرِ تعلیم ہی کہہ سکتا تھا۔ یہ غور طلب ہے کہ کیا آج بھی ہماری تحقیق اور تدریس کے درمیان واقعی کوئی رشتہ ہے۔ خیر ہم تو جامعہ کیا جاتے، حالات نے ایسی خوش گوار کروٹ لی کہ ذاکر صاحب خود ہی علی گڑھ تشریف لے آئے لیکن یہ بعد کی داستان ہے۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ ہم (یا کم سے کم میں) اپنے پورے زمانۂ طالب علمی میں جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے لیے کسی مثالی وائس چانسلر کا تصور کرتے تھے تو ہمارے پردۂ ذہن پر ہمیشہ ڈاکٹر ذاکر

حسین کی تصویر اُبھرتی تھی۔ (ص:۱۴۵-۱۴۴)

■ ''اور آج کی کانگریس اور آج کی مرکزی حکومت تو وہ ہے ہی نہیں جس کا خواب انھوں نے (جواہرلال نہرو) اور ان کے ساتھیوں نے دیکھا تھا اور خواب ہی نہیں دیکھا تھا، اپنے رہتے اس کی تعبیر بھی تلاش کی تھی۔ ان کے اصولوں سے سب سے پہلے ان کی بیٹی نے انحراف کیا۔ پنڈت جی جوتشیوں کا مذاق اُڑاتے تھے، وہ ہَوَن کراتی تھیں، ساعتِ سعید معلوم کر کے قدم اُٹھاتی تھیں۔ پنڈت جی سب سے بڑھ کر امن دوست اور جمہوریت پسند تھے، اندراجی عملی سیاست (Pragmatism) میں عقیدہ رکھتی تھیں اور اصولوں کی پاس داری کی قائل نہیں تھیں۔ جمہوریت پسند نہرو کی بیٹی نے جمہوریت کا گلا گھونٹ دینے میں کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ہندستان کی حالیہ سیاست کا سب سے منحوس سال ۱۹۹۱ء ہے جب نرسمہا راو جی وزیر اعظم اور منموہن سنگھ جی وزیرِ خزانہ ہوئے۔ سوشلزم زیرِ زمین دفن ہو گیا، سرمایہ داری کی بہار آئی''۔ (ص:۱۳۴)

ایسی خودنوشتیں جن کے مصنفین کی زندگی زمانے کے سرد و گرم سے اچھی خاصی تپی تپائی ہوئی ہو، ان میں زندگی اور کائنات کے بارے میں چند ایسے مشاہدات ضرور درج ہوں گے جن سے ہماری قومی زندگی کے کچھ نادیدہ پہلو اپنے آپ سامنے آجائیں گے۔ ریاض الرحمان شروانی نے یہ خودنوشت اپنی عمر کی آٹھویں دہائی کے بعد مکمل کی ہے، جس کی وجہ سے زندگی کی کئی ایسی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں جو نہ صرف اُن کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ وہ ہماری قومی زندگی کا اٹوٹ حصّہ ہیں۔ تاریخ اور تہذیب کے ایسے گم شدہ راز کسی واقعے کے بطن سے اس طرح ہمارے سامنے آتے ہیں جیسے ہم نے ان باتوں پر غور ہی نہیں کیا۔ چند ملے جلے موضوعات پر شروانی صاحب کے مشاہدات پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

■ ''اس زمانے میں ہمارے یہاں یونانی علاج ہوتا تھا۔ یونانی اطبا کے پاس امراض کی دوائیں بہت کم تھیں، جس کا بدل اُن کے نزدیک شدید پرہیز تھا اور وہ مریض کو اور زیادہ کمزور کر دیتا تھا اور وہ مختلف عوارض کا شکار بن جاتا تھا۔'' (ص:۸۴)

■ ''۱۹۴۵ء آتے آتے ذاکرہ خاتون کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ انھیں ٹی۔ بی۔ تجویز کردی گئی تھی جو اُس زمانے میں مہلک مرض مانا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ جوانوں کے لیے ٹی۔ بی۔ اور بوڑھوں کے لیے فالج سب سے زیادہ مہلک مرض ہیں۔ ہارٹ اٹیک شاذ ہوتا تھا اور ہوتا تھا تو عام لوگ اس پر یقین نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ کسی نے جادو کردیا یا زہر دے دیا۔ کینسر (سرطان) کا نام اور بھی کم سننے میں آتا تھا لیکن تھا اس وقت بھی موذی اور مہلک مرض۔ بعض خاص موسموں میں بعض وبائی امراض ملیریا، چیچک، ہیضہ اور بعض علاقوں میں طاعون اکثر پھوٹ پڑتے تھے اور بہت جانوں کا اتلاف ہوتا تھا۔ بچّوں کی پیدائش میں بھی بہت اموات ہوتی تھیں اور بچّے چھوٹی عمر میں مرتے بھی بہت تھے۔ اسّی برس کی عمر کے لوگ اتفاق ہی سے دیکھنے میں آتے تھے۔ میرے بچپن میں جس شخص کی عمر اسّی برس کی ہوتی تھی، وہ کہتا تھا: میں نے ''غدر'' دیکھا ہے اور اس کے قصّے سناتا تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں ایسے دو، تین اشخاص سے زیادہ نہیں دیکھے۔'' (ص: ۵-۱۰۴)

■ ''اس زمانے میں انھوں نے (حبیب الرحمان خاں شروانی نے) اپنی منقولہ اور غیر منقولہ کُل جائداد علی الاولاد فی سبیل اللہ کردی۔ اپنے بعد متوتی اپنے بڑے بیٹے کو بنایا اور پھر ہر بڑے بیٹے کے بڑے بیٹے میں منتقل ہونا تجویز فرمایا۔ وقف نامہ خان بہادر شیخ عبداللہ نے ترتیب دیا ہے۔ اس کے آخر میں درج ہے کہ نسل کا سلسلہ منقطع ہوجانے پر کل جائداد مسلم یونی ورسٹی کو مل جائے گی۔ اس زمانے میں بعض اور مسلمانوں نے بھی اپنے وقف ناموں میں یہی لکھا تھا۔ یہ ان کی مسلم یونی ورسٹی سے محبت کا بیّن ثبوت ہے۔'' (ص: ۱۰۶)

■ ''علی گڑھ جاتے آتے ہوئے دہلی میں ان کا قیام مولانا آزاد کے ساتھ رہتا تھا۔ کہتے تھے کہ آج کل رات کو مولانا سو نہیں سکتے ہیں، ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کی فکر انھیں سونے نہیں دیتی ہے۔'' (ص: ۱۷۱)

■ ''ایک دن بی۔اے۔خاں صاحب انگریزی کا کلاس لے رہے تھے۔ پڑھاتے ہوئے کتاب میں لفظ Utopia آیا۔بی۔اے۔خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: جیسے آپ کا تصور پاکستان۔بس پھر کیا تھا۔گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا یا شہد کی مکھیوں کو چھیڑ دیا۔طالب علموں کی اکثریت اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بی۔اے۔خاں صاحب سے تو تو،مَیں مَیں کرنے لگی لیکن انھوں نے پرواہ نہیں کی،آگے بڑھ گئے۔''(ص:۱۲۷)

■ ''ایلزیم ہال میں صبحِ آزادی کا استقبال فائقہ خاتون (مصنف کی ہم شیرہ) نے اور میں نے مل کر اس طرح کیا تھا کہ جب سحری کے لیے اُٹھے تو اس کوٹھی کے دروازے پر قومی جھنڈا لہرایا۔سب کچھ بھول کر یہ احساس کیسا روح پرور اور جاں فزا تھا کہ جب ہم رات کو سونے کے لیے لیٹے تھے تو غلام تھے اور اب آزاد ہیں۔بہ قولِ جوش: بہار پھر بہار ہے۔بہار پھر بہار ہے۔اُجالا کیسا ہی داغ دار ہو اور سحر کیسی ہی شب گزیدہ ہو،ہے تو بہر حال اُجالا اور ہے تو بہر کیف سحر۔غلامی کی شب تار کا آزادی کی صبحِ روشن سے کیا مقابلہ؟''(ص:۱۵۱)

ریاض الرحمان شروانی اردو،فارسی،عربی اور انگریزی زبانوں سے مکمل آشنا صاحب تصنیف ادیب ہیں۔ابوالکلام آزاد سے بے پناہ متاثر ہونے کے باوجود زبان کی آرائش کو انھوں نے اپنے لیے راہ نما نہیں بنایا۔سادہ زبان میں صاف صاف کہنے کا ہنر اتنا دل نشین اور دل پذیر ہے،جس سادگی پر واقعی رنگینی قربان ہو سکتی ہے۔یوں بھی خودنوشت میں حقائق پر ارتکاز اتنا زور آور ہوتا ہے کہ زبان کی بندش اور سجانے سنوارنے کے اضافی کاموں سے مصنف اپنے آپ دور ہوجاتا ہے۔حقیقت کے بیان میں سادگی و پُرکاری ،بے خودی وہشیاری کی جلوہ سامانیاں دھوپ چھاؤں کی طرح ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔رفیوجی کیمپ سے نکل کر پاکستان روانہ ہونے اور پھر لاہور پہنچنے کے لمحات کیسے پُر اثر انداز میں احاطۂ تحریر میں آئے ہیں،ملاحظہ ہو:

■ ''جب ٹرین پلیٹ فارم سے رینگی تو آسمان پر سویرا جھلک رہا تھا اور ہم حسرت ویاس سے اپنے وطن ہی کو نہیں،اپنے سامان کو بھی الوداع کہہ رہے

تھے۔" (ص:۱۵۸)

■ "۲۴رستمبر کو ابھی ستارے جھلملا رہے تھے کہ کسی نے کہا: ٹرین پاکستان کی سرحد میں داخل ہوگئی۔ مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور کہا: تب ہی ستاروں میں وہ چمک نہیں رہی۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا: سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا، ستاروں میں چمک کہاں ہوتی۔" (ص:۱۵۹)

ریاض الرحمان شروانی کی یہ خودنوشت بلاشبہ ایسی کتابوں میں شمار ہوگی جنھیں لفظ بہ لفظ پڑھنا چاہیے۔ فرانسس بیکن نے کتابوں کے سلسلے سے یہ لکھا ہے کہ بعض کتابیں چبا چبا کر پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ قدما کی تحریروں کے بارے میں یہ پتا چلتا ہے کہ کسی نے 'آبِ حیات' پچیس اور پچاس بار پڑھی، 'نیرنگِ خیال'، 'باغ و بہار' اور 'غبارِ خاطر' کے بارے میں بھی ان کتابوں کے عاشق بار بار پڑھنے کی بات کہتے ہیں۔ 'یادگارِ غالب' اور 'حیاتِ جاوید' جیسی کتابیں بھی لوگوں نے نہ جانے کتنی بار پڑھیں۔ کلیم الدین احمد نے افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کو یہ مشورہ دیا کہ ان کی راتیں اور دن خطوطِ غالب کے ساتھ بسر ہونی چاہئیں۔ ریاض الرحمان شروانی نے متعدد علمی کام کیے۔ 'میرِ کارواں' جیسی پُر مغز کتاب تحریر کی لیکن اپنی زندگی کے آٹھ برسوں کو خونِ جگر کے ساتھ پاکیزگی اور ایمان کی بھٹی میں تپا کر جو خودنوشت لکھی، وہ روز روز لکھی جانے والی کتابوں جیسی نہیں۔ مختصر سا دائرۂ کار ہے، واقعات کی پیش کش میں کوئی طول بیانی بھی نہیں۔ رنگ آمیزی سے تو انھیں دور کا سروکار نہیں۔ کسی پر اتہام، بہتان اور الزام تراشی کا بھی شوقِ بے جا انھوں نے نہیں پالا لیکن قومی زندگی اور اپنے خوابوں کے زوال کے کچھ مناظر اس طرح سے یہاں جمع ہوگئے ہیں جیسے لگتا ہو کہ یہ خودنوشت نہیں، ہماری قومی زندگی کی شکستِ خواب کا کوئی نوحہ ہے۔ کتاب ختم کرتے کرتے پڑھنے والا 'متاعِ بے بہا ہے دردو سوزِ آرزومندی' کی صبر آزما منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ خدا ریاض الرحمان شروانی کی عمر بڑھائے اور اس خود نوشت کے دوسرے اجزا بھی انھیں قلم بند کرنے کا موقع عنایت کرے۔ آمین۔

(2012)

متعلقاتِ احمد جمال پاشا
ایک مثالی دستاویز

رشید حسن خاں، حنیف نقوی، نثار احمد فاروقی کے بعد کی نسل کے محققین میں ظفر کمالی نے اپنے معترق تحقیقی مضامین کی وجہ سے دھیرے دھیرے قومی سطح پر ایک اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ طنز و ظرافت، ڈراما نگاری اور احمد جمال پاشا ان کی تحقیق کے خاص محور رہے ہیں۔ دو دہائی قبل گیان چند جین کے تعلق سے ان کے دو طویل مضامین "شاعر" (بمبئی) اور "زبان و ادب" (پٹنہ) میں شایع ہوئے تو لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بزرگوں نے داد دی اور نوجوانوں نے رشک سے اس علمی انہماک کو ملاحظہ کیا۔ اسی بیچ اُن کی ظریفانہ شاعری بھی رسائل کی زینت بننے لگی اور پورا مجموعہ "ظرافت نامہ" کے عنوان سے منظرِ عام پر آ گیا۔ اس کے بعد 'ڈنک' اور 'نمک دان' کے نام سے ظریفانہ شاعری کے دو مزید مجموعے سامنے آ چکے ہیں۔ شاعری میں وہ یہیں نہیں رُکے، انھوں نے ادبِ اطفال کی طرف بھی نگاہ دوڑائی اور پھر کیا تھا، "بچّوں کا باغ" مجموعہ بھی شایع ہو گیا۔ 'رباعیاں' اور 'رباعیاتِ ظفر' کے عنوانات سے رباعیات کے بھی دو مجموعے شایع ہو چکے۔ ان دنوں ان کی شاعری کا زور قائم ہے اور تحقیق و تنقید کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ خدا ایسی علمی سرگرمی سے ہر اہلِ علم کو نوازے۔

احمد جمال پاشا ظفر کمالی کے استاد رہے ہیں اور انھوں (ظفر کمالی) نے پی ایچ۔ ڈی (Ph. D.) کے لیے احمد جمال پاشا ہی کو اپنا موضوع بنایا۔ شاگردی اور حیاتِ احمد جمال پاشا دونوں کی میعاد کم رہی لیکن ظفر کمالی نے اپنی تحقیقی و تنقیدی جستجو سے بات یہاں تک بڑھا دی کہ احمد جمال پاشا کی حیات و خدمات سے متعلق چار پانچ جلدیں تو ضرور سامنے آ جائیں گی۔ اس موضوع کو اس تفصیل سے ظفر کمالی نے پیش کرنے کا سلسلہ قائم کیا ہے، جس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آگے دس بیس برس تک نئی نئی چیزیں سامنے آتی رہیں گی۔

پچھلے دنوں جب ان کی کتاب ''معلقاتِ احمد جمال پاشا'' (۲۰۰۶ء، شمشاد علی فاؤنڈیشن، سیوان) شائع ہوئی تو اس میں ناشر کی طرف سے یہ بتایا گیا کہ احمد جمال پاشا کے سلسلے کی تحقیق میں پیشِ نظر تصنیف کی حیثیت محض تمہیدی ہے۔ اب اگر دو سو آٹھ (۲۰۸) صفحے کی کتاب تمہید ہو، تشبیب ہو تو مدح کے لیے چار چھے جلدیں ہونی ہی چاہئیں۔ اس کتاب میں جو چیزیں شامل کی گئی ہیں، رسائل میں ان کی اشاعت کا زمانہ دیکھیں تب اندازہ ہوگا کہ ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کے حصۂ اجزا ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۹ء اور ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف عجلت میں نہیں ہے اور موجودہ زمانے کی روش 'کاتا اور لے دوڑی' کے انداز سے کتابیں بنانے کا قائل نہیں ہے ورنہ مضامین کی اشاعت کے اٹھارہ سال بعد کتابی شکل اختیار کرنا معمولی صبر کا کام نہیں ہے۔ یہ انداز اردو معاشرے میں ہمارے سابقین کا رہا ہے، جنھوں نے تحقیق کے معیار کو بلند تر کیا تھا۔ قاضی عبدالودود سے لے کر رشید حسن خاں تک ایک ٹھوس سلسلہ ملتا ہے جہاں دہائیوں تک کسی ایک موضوع کے تعلق سے چھان بین اور جستجو کی کوشش کا پتا چلتا ہے۔ رشید حسن خاں نے ''باغ و بہار'' کی ترتیب کا پہلا کام ۱۹۶۲ء میں مکمل کیا تھا اور اس نسخے کی اشاعت بھی مکتبہ جامعہ سے اسی سال ہو چکی تھی لیکن موضوع ان کے ذہن و دل پر چھایا رہا جس کا نتیجہ ۱۹۹۲ء میں شائع شدہ انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام ''باغ و بہار'' کا نسخہ ہے جسے بلاشبہ ترتیب و تدوین کا ایک قاموسی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ محققین کی صفِ اوّل کے رفتہ رفتہ اٹھتے جانے کے باوجود ساٹھ سے کم عمر کے محققین کا ایک کارواں قائم ہوتا جا رہا ہے جنھیں پتّا ماری کی چاٹ لگی ہوئی ہے اور جن کے پاس تحقیق کا بے پایاں حوصلہ ہے۔ یقیناً ظفر کمالی ہمارے اسلاف کے مذکورہ سلسلے کی زندۂ جاوید کڑی ہیں۔

''معلقاتِ احمد جمال پاشا'' میں احمد جمال پاشا کے حالاتِ زندگی اور شخصیت سے متعلق ۵۶ صفحات پر مشتمل ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کی وفات اور تجہیز و تکفین کی تفصیلات کے لیے ایک مکمل رپورتاژ ''احمد جمال پاشا کا آخری سفر'' کے عنوان سے کتاب میں موجود ہے۔ احمد جمال پاشا نے اپنی ادارت میں 'اودھ پنچ' پھر سے شروع کیا تھا۔ ظفر کمالی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے مطبوعہ شماروں کا اشاریہ بھی شائع کر دیا ہے۔ ظفر کمالی کے نام احمد جمال پاشا کے لکھے گئے ستائیس خطوط مع تفصیلی حواشی بھی اس کتاب کا حصّہ ہیں۔ احمد جمال پاشا کے نام خطوط جو معدودے لوگوں نے انھیں لکھے، ان کی تفصیلات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس اشاریے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکتوب الیہ حضرات کی تعداد چار سو چوہتر (۴۷۴) تک پہنچتی ہے۔ اس طرح

ان خطوط کی تعداد یقینی طور پر ہزار سے اوپر ہو جاتی ہے۔ مصنف نے خود ۱۹۸۶ء میں موت سے تقریباً ایک برس پہلے احمد جمال پاشا سے ایک تفصیلی انٹرویو لیا تھا۔ اس کا پورا متن پہلی بار اس کتاب میں درج ہے۔ منظوم خراج عقیدت کے تحت بارہ غزلیں اور ایک مرثیہ احمد جمال پاشا کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کتاب میں شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب احمد جمال پاشا کی شخصیت، حیات اور خدمات کا پورے طور پر احاطہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

''معتلقات احمد جمال پاشا'' کا اساسی مضمون ''احمد جمال پاشا: حالاتِ زندگی اور شخصیت'' کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ مشاہیر کی حیات و شخصیت پر کس انداز سے لکھا جانا چاہیے، اس کے لیے یہ مضمون ماڈل کے طور پر استعمال میں لایا جانا چاہیے۔ غالبؔ نے ذوقؔ کے سامنے چیلنج کے طور پر یہ مصرع پیش کیا تھا: 'دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا'۔ ظفر کمالی نے بھی اس مضمون سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ احمد جمال پاشا کی حیات اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کا مضمون لازمی اور آخری ہے۔ تحقیق کا اعلا معیار، بہترین وکلا کی طرح جرح کرنا، محکمۂ سراغ رسانی اور شعبۂ تفتیش کے افراد کی طرح گم شدہ حقائق کو ڈھونڈ نکالنا، ممدوح کے تئیں بے پایاں خلوص اور اپنائیت؛ ہر لحہ معروضیت اور انصاف پسندی کو رہنما سمجھنا ----- ایسی بنیادی خصوصیات ہیں جن کی بہ دولت یہ مضمون بے پناہ علمی وقار حاصل کرتا ہے۔ یہ مضمون یوں تو ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن کی تکمیل میں مصنف کو دو دہائیوں سے زیادہ وقت صَرف کرنا پڑا ہے۔ تحقیق کو اگر بچّوں کا کھیل نہیں مانا جاتا ہے تو یہ یوں ہی نہیں اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں سے لے کر ظفر کمالی تک ایک مکمل سلسلہ قائم ہے۔

اس مضمون کا حصۂ اوّل 'آباو اجداد' کے بارے میں اطلاعات فراہم کرانے کے لیے وقف ہے۔ ساڑھے گیارہ صفحات کے اس حصے اور ڈھائی صفحات کے حواشی کو توجہ سے پڑھیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ مصنف نے تحقیق کے لیے ایک ایک اینٹ جوڑ کر یہ عمارت تیار کی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس حصے میں پہلے سے تیار شدہ کوئی چیز ایسی ظفر کمالی کے ہاتھ نہیں آ سکتی تھی جسے بنیاد مان کر آگے کے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ ضروری ماخذات کو کس طرح اپنی مٹھی میں سمیٹا جاتا ہے، اس کی ادا ملاحظہ کرنے کے لیے اس مضمون کا ابتدائی حصہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس مضمون میں گذشتہ دو سو برسوں کے اندر خاندانِ پاشا کے حالات نے کس طرح کروٹ بدلی، اس کی واضح جھلک دکھا دی گئی ہے۔ اس سلسلے سے جرح کرتے ہوئے احمد جمال پاشا کی بعض

تحریروں سے ظفر کمالی نے اختلاف بھی کیا ہے اور کچھ باتوں کے بارے میں پاشا صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات کو تسلیم کرنے سے معذرت کرلی ہے۔ ان کے خاندان کے تعلق سے ظفر کمالی کے نتائج یہ ہیں :

■ ''پاشا صاحب خاندانی شجرے کے مطابق اپنا سلسلۂ نسب سلاطینِ عثمانیہ سے ملاتے ہیں لیکن وہ اس سلسلے میں کسی طرح کی کوئی تفصیل نہیں پیش کرتے۔ ان کا خاندانی شجرہ تو موجود تھا لیکن انھوں نے خود اُسے دیکھا نہیں تھا۔ ایسی حالت میں ان کے بیان پر یقین کرنا مشکل ہے۔'' (ص: ۱۰-۹)

■ ''تذکروں کی مدد سے نسب نامہ تیار کرنے میں ان سے چوک ہوئی ہے۔ لہٰذا جب تک ان کا گم شدہ خاندانی شجرہ دستیاب نہ ہو جائے، موجودہ صورت میں ان کے بیانات پر بھروسا کرنا تحقیقی اصولوں کے منافی ہوگا۔'' (ص: ۱۰)

ان اقتباسات سے ظفر کمالی کے تحقیقی نقطۂ نظر اور ان کی معروضیت و دیانت داری کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ماخذات کی عدم دستیابی کے سبب انیسویں صدی کے پہلے کے احوال زیادہ تفصیل سے نہیں لکھے جاسکے ہیں لیکن احمد جمال پاشا کے پُر دادا نجف علی سے جو تذکرہ شروع ہوتا ہے، اس میں تفصیل بہ تدریج بڑھتی جاتی ہے۔ نجف علی کے صاحب زادے ولایت علی کی زندگی تقریباً دو صفحات میں پیش کی گئی ہے۔ آگرہ، کلکتہ، عظیم آباد اور گورکھ پور کی خاک چھانتے ہوئے وہ کوٹا بوندی میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔ میر ولایت علی سے آغا ولایت حسین بننے کا معاملہ بھی کم دلچسپ نہیں اور زندگی کے اُتار چڑھاو کو واضح کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ولایت علی کی زندگی کیسے بدل دی، اس کی تفصیل ظفر کمالی ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں :

''۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں میر ولایت علی نے بھی حصّہ لیا اور کئی انگریزوں کو مار ڈالا۔ سقوطِ عظیم آباد کے بعد انھوں نے اناج کی بوریوں میں اپنا قیمتی اثاثہ بھروایا اور بوریوں کو کشتی پر اس طرح چنوادیا کہ نیچے جگہ بن جائے۔ اس میں وہ اور ان کی اہلیہ دُبک کر بیٹھ گئے۔ یہ دریائی سفر خدا کے بھروسے جاری تھا۔ ناو کھینے والے ملاح نہیں بلکہ نمک خوار اور خاندانی ملازم ماہی گیروں کے بھیس میں تھے۔ ہر طرف تلنگوں کا زور تھا۔ انھوں نے ناو کئی جگہ روکی، پھر جانے دیا۔ گنگا سے راپتی تک کا یہ سفر جب بے خبر

دخوبی تمام ہوا تو میر ولایت علی نے انگریزوں کے خوف سے اپنا نام بدل کر آغا ولایت حسین رکھ لیا اور یہ سید سے مغل بن گئے۔" (ص:۱۱)

ظفر کمالی نے ولایت علی کی زندگی کی بوالعجبیوں سے متعلق مزید اطلاعات بھی دی ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور پہلے ذرّہ تخلص کرتے تھے، بعد میں خاور گورکھ پوری ہو گئے۔ گورکھ پور میں غلّے کی آڑھت کا کام انھوں نے شروع کیا۔ بعد میں عدالت میں انھوں نے مختاری کا کام کیا۔ تھوڑے وقتوں کے بعد وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہو گئے۔ ولایت علی کی بیوی لطیفا بی بی اور خود ولایت علی بہت خوب صورت تھے۔ گورکھ پور میں انھیں انگریز مسلمان کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ان کا گھر شاعروں ادیبوں کے لیے مہمان خانہ تھا۔ اکبرالہ آبادی اور ریاض خیرآبادی بھی ایک مدّت کے لیے خاورؔ کے یہاں مقیم ہوئے۔ انھی کے صاحب زادے شجاعت حسین قانون کی اعلا تعلیم کے لیے لندن گئے لیکن واپسی کے بعد مستقل طور پر وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کر سکے۔ منصفی کا امتحان پاس کیا اور مختلف مقامات پر ایڈیشنل جج ہو کر کام کرتے رہے۔ پھر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہو گئے۔ انگریزوں نے انھیں سیاسی ایجنٹ بنایا اور مختلف مقامات پر بھیجا۔ بعد میں وہ مذہبی آدمی ہو گئے اور انھوں نے پیری ومریدی کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ وہ نثر نگار اور شاعر دونوں تھے اور ان کا کلام اردو اور فارسی میں موجود ہے۔ ان کا تخلص سائیں تھا۔ ظفر کمالی نے بتایا ہے کہ ان کے مُریدوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ تھی۔ خلافت تحریک کے اثر سے انھوں نے اپنے بچّوں کے نام میں پاشا کا اضافہ کیا اور آغا کے لقب کو ترک کرنے کی ہدایت دی۔ شجاعت حسین کی دوسری اہلیہ سروری خاتون کے بطن سے احمد جمال پاشا پیدا ہوئے۔

ظفر کمالی نے خاندانِ احمد جمال پاشا کی تفصیلات بیان کرنے میں ایک طرف اختصار کو ضروری سمجھا تو دوسری طرف ان کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ ان افراد پر زیادہ روشنی ڈالیں جن کا احمد جمال پاشا کی زندگی سے سب سے گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے پاشا کے دادا اور والد کے بارے میں انھوں نے صراحت سے کام لیا اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز، بعض دل چسپ واقعات اور ان کے مزاج کے انوکھے پن سے بھی پڑھنے والوں کو آشنا کرایا۔ انھوں نے احمد جمال پاشا کے بھائی بہنوں کے تعلق سے بھی اختصار کے ساتھ اطلاعات پیش کر دی ہیں۔ ان میں کون پاکستان چلا گیا اور عورتیں کن کن سے بیاہی گئیں یا اب تک کون اصحاب کہاں ہیں؛ ان سب کے بارے میں اختصار سے ظفر کمالی نے اطلاعات فراہم کر دی ہیں۔

خاندانِ پاشا سے متعلق اطلاعات فراہم کردینے کے بعد محقق کی حیثیت سے ظفر کمالی کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ احمد جمال پاشا کے بارے میں تمام ضروری باتوں کو ہمارے سامنے پیش کردیں۔ 'سوانحی حالات' کے تحت انھوں نے جو ذیلی باب لکھا ہے، اس میں تقریباً تین صفحات میں احمد جمال پاشا کی تاریخِ پیدایش کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ احمد جمال پاشا نے اپنے سوانحی کوائف لکھتے ہوئے مختلف مقامات پر ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۰ء سالِ ولادت بتائی ہے۔ ظفر کمالی نے خاندانی خطوط اور دیگر شہادتوں سے ان کی صحیح تاریخِ پیدایش کا تعین ۱۹۲۹ء کیا ہے۔ ان تین صفحات میں تحقیق کا نہ صرف اعلا معیار قائم ہوا ہے بلکہ محققین کو کس طرح کے رکارڈس شخصیات کے حوالے سے تحقیق کرتے ہوئے حاصل کرلینا چاہیے، اس پر بھی واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ قابلِ اتباع تحقیق کا ایک نمونہ ہے۔ دوسرے محققین کو بھی ظفر کمالی کی اس تحقیق سے سیکھنا چاہیے کہ کس طرح گم شدہ معلومات اور بکھری ہوئی چیزوں کو جوڑ کر بہترین تحقیقی کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ ظفر کمالی نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ مصنف اپنے بارے میں جو کچھ بتارہا ہے، اس کی بہر حال جانچ پرکھ ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر سچ کی تلاش کا کام ادھورا رہے گا۔ تاریخِ پیدایش کے سلسلے سے فٹ نوٹ میں ظفر کمالی نے ایک دلچسپ اطلاع بھی دی ہے۔ جس سے مصنفین کے مزاج اور اندازِ نظر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یہاں اس واقعے کا ذکر ضروری ہے کہ ثریا خاتون اور عزت پاشا کے مذکورہ بالا خطوط پاشا صاحب ہی نے مجھے عنایت کیے تھے۔ ان خطوط اور زبانی بیانات کی روشنی میں جب میں نے ان کی سنہ پیدایش کا تعین کیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی۔ اس وقت راقم حروف نے ان سے گزارش کی تھی کہ اگر آیندہ انھیں کہیں اپنی عمر لکھنا ہو تو صحیح لکھیں۔ مسکراتے ہوئے بولے: ''میاں، اگر میں صحیح لکھ دوں تو پھر آخر تم تحقیق کیا کروگے؟''
> اور ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کے بعد جب انھوں نے شیخ رحمان اکولوی کو انٹرویو دیا (شائع شدہ ''نیا دور''، لکھنؤ؛ جولائی ۱۹۹۰ء) تو اس میں اپنی تاریخِ پیدایش یکم جون ۱۹۳۰ء بتائی۔''

تاریخِ پیدایش کے سلسلے سے بحث کے بعد ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اطلاعات فراہم کی ہیں۔ اسی میں پاشا صاحب کے اُس زائچے کا بھی ذکر ہے جسے ڈاکٹر منجیت سنگھ جیسے مشہور نجومی نے تیار کیا تھا جس میں یہ پیشین گوئی موجود تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہوکر بڑا ڈاکو بنے گا یا کوئی بڑا آدمی بنے گا مگر ہر

حال میں نام پیدا کرے گا۔ پاشا صاحب کی شرارتوں پر اُن کے والد کی طرف سے دی جانے والی سخت سزا کے سلسلے سے ظفر کمالی کی یہ توجیہ بالکل درست ہے کہ اُن کے والد اِس پیشین گوئی کو نگاہ میں رکھتے تھے۔ ظفر کمالی کا ایک جملہ ہے: ''جمال صاحب کی بعض شرارتیں نیکی اور بدی کا امتزاج ہوتی تھیں''۔ اس سلسلے سے ظفر کمالی نے تین چار منتخب واقعات پیش کیے ہیں جن سے یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ احمد جمال پاشا کی شخصیت میں اتنی رنگا رنگی کیوں کر تھی؟ ساتھ ہی وہ حُسنِ اخلاق کا پیکر کس طرح ہوگئے تھے۔

بچپن میں احمد جمال پاشا فٹ پاتھ پر بکنے والی ڈاکوؤں، چوروں، لٹیروں اور ٹھگوں کی حیات پر تحریر کردہ کتابوں کے سحر میں بہت مبتلا رہے۔ اردو زبان کی تعلیم اصل میں انھی کتابوں کی معرفت ہوتی رہی۔ گھر سے پیسے چوری کر کے بھی وہ اس انداز کی اردو کتابیں فٹ پاتھ سے خریدتے رہے لیکن ہر تھوڑے وقفے پر گھر والے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی کتابیں نکال لیتے اور اجتماعی پٹائی کے ساتھ ان کتابوں کو نذرِ آتش کیا جاتا۔ احمد جمال پاشا کے چھوٹے بھائی اقبال پاشا کے مضمون سے ظفر کمالی نے جو اقتباس پیش کیا ہے، اس کے آخری حصے میں اس کیفیت کی تفصیل موجود ہے۔ ملاحظہ کریں:

> ''وہ منظر اس سے بھی زیادہ دل خراش ہوتا جب گھر بھر کی کمین گاہوں سے شب خوں مار کر اُن کی کتابیں ڈھونڈلی جاتیں اور اُن کتابوں کے ڈھیر کو کوڑے خانے پر جمع کر کے آگ لگائی جاتی۔ اس وقت جمال بھائی کی چیخیں آسمانوں کو لرزاتی تھیں۔ 'ارے خدا کے لیے میری کتابوں کو مت جلایئے۔ مجھے مار ڈالیے، میری جان لے لیجیے۔ زمین پر لوٹ جاتے، پچھاڑیں کھاتے، ہچکیاں بندھ جاتیں۔ انھیں مت جلایئے۔ انھیں مت جلایئے'۔''

اس سے احمد جمال پاشا کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر احمد جمال پاشا کی گھٹی میں شرارت اور زبانِ اردو کی شمولیت نہیں ہوتی، تب یہ کیسے ممکن ہوتا کہ اردو کا اتنا بانکا ظرافت نگار پیدا ہوجاتا۔ ظفر کمالی نے یہ اچھا کیا کہ ان تفصیلات کو غیر ضروری یا ممدوح کے لیے بُرائی کی بات سمجھ کر عام محققین کی طرح نصاب سے باہر نہیں کیا بلکہ اپنے مضمون میں تمام ضروری حصوں کو شامل کر کے ہمیں یہ موقع فراہم کیا کہ ہم احمد جمال پاشا کی شخصیت کے ارتقا کی کڑیوں کو آزادانہ طور پر جوڑ سکیں۔ ایک محقق کی حیثیت سے ظفر کمالی کا یہ بڑا اور جرأت مندانہ کارنامہ ہے۔

شخصیت کی تشکیل کے نشیب و فراز سے واقف کرا لینے کے بعد ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کی تعلیمی زندگی پر خود کو مرکوز کیا ہے۔ جس میں یہ اطلاع ہے کہ پاشا صاحب میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے۔ تینوں امتحانات میں تھرڈ کلاس رڈویژن سے کامیاب ہوئے۔ صرف ایم۔اے۔ میں سکنڈ کلاس نصیب ہو سکا۔ ظفر کمالی نے یہ اطلاع بھی شامل کی ہے کہ انٹرمیڈیٹ میں ابتداً وہ کامرس کے طالب علم تھے، جب اس میں فیل ہوئے تو آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ تعلیمی زندگی کے احوال مرتّب کرتے ہوئے جناب کمالی نے علی گڑھ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ احمد جمال پاشا وہاں دو برس سے زیادہ نہیں رہ سکے لیکن یہیں سے ان کی ادبی شخصیت کے اُبھرنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ظفر کمالی کے یہ جملے صد فی صد درست ہیں :

> "علی گڑھ کا قیام احمد جمال پاشا کے لیے بہت سودمند رہا۔ جید اور باصلاحیت اساتذہ کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھے لکھے اور بہترین احباب کی صحبت میسّر آئی۔ قدرداں اور گوہر شناس اساتذہ نے ان کی صلاحیتوں کو اُبھارا اور چمکایا۔"

احمد جمال پاشا کی حیات کی مختلف کڑیوں کو جوڑتے ہوئے ظفر کمالی نے ان کی دوسری شادی اور لکھنؤ سے سیوان کی منتقلی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ لیکن اس منتقلی سے احمد جمال پاشا پر کیا گزری، اس کیفیت کو بھی انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

> "کہاں لکھنؤ اور کہاں سیوان، جیسے کسی نے شہرِ نگاراں سے رخصت ہو کر شہرِ بے کساں میں پناہ لی ہو ---- پاشا صاحب نے چھوڑنے کو لکھنؤ چھوڑ دیا لیکن وہ ہمیشہ فرقتِ احباب میں ملول رہے۔"

اس کے باوجود ظفر کمالی کا ماننا ہے کہ سرور جمال سے شادی کے بعد ہی وہ ادبی کاموں میں زیادہ انہماک کے ساتھ مشغول ہو سکے۔ اسی طرح لکھنؤ اور 'قومی آواز' سے علاحدگی اور سیوان میں کالج میں بہ حیثیتِ استاد داخل ہونے کو ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کے لیے نیک شگون مانا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس سے احمد جمال پاشا کی زندگی میں زیادہ قرار آ گیا۔ ظفر کمالی کے نتائج ان لفظوں میں ان کی کتاب کا حصّہ ہیں :

> "اس طرح وہ صحافت سے درس و تدریس کے پیشے میں داخل ہوئے۔ یہ پیشہ ان کے مزاج سے پوری طرح مطابقت رکھتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں

پوری ذمّے داری کے ساتھ مشغول ہو گئے اور طلبہ واساتذہ دونوں کے درمیان کافی
مقبول ہوئے۔ کالج جوائن کرنے کے بعد روزانہ دو ایک لیکچر اور اس کے بعد ادب کا
مطالعہ ان کے روزمرّہ کا معمول بن گیا۔"

'ادبی زندگی کا آغاز' عنوان سے ظفر کمالی نے محض تین صفحات میں صورتِ واقعی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ادبی حلقے میں شمولیت اور پھر دوسروں کی دیکھا دیکھی لکھنے کی طرف راغب ہو جانا ----- احمد جمال پاشا کی اس خصوصیت کو ظفر کمالی نے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ دوست اور اساتذہ کس طرح اپنے حصّے کی خدمات دیتے رہے اور دیکھتے دیکھتے ایک نیا ظرافت نگار پیدا ہو گیا، اِس کا کم سے کم لفظوں میں مکمّل تصویر کشی کے ساتھ ظفر کمالی نے جائزہ لیا ہے۔ صحافت سے ان کی ظرافت نگاری کو کس طرح نقصان پہنچا اور درس و تدریس سے وابستگی نے پھر سے انھیں سنجیدگی سے ادب کی طرف موڑ دیا، اس پر بھی ظفر کمالی نے اپنی نپی تُلی باتیں کہی ہیں۔

'شخصیت، عادات واطوار' عنوان سے کُل بائیس (۲۲) صفحات مصنّف نے تحریر کیے ہیں۔ پہلے جملے میں ہی ظفر کمالی نے گویا خدا لگتی کہہ دی ہے: 'احمد جمال پاشا کی شخصیت بہت دل فریب تھی'۔ اس ایک لفظ 'دل فریب' کی تفصیل میں ظفر کمالی نے اپنی جان صَرف کر دی ہے۔ محبت، عقیدت اور تحقیقی معروضیت سے مل کر خونِ جگر کی شمولیت سے یہ تحریر وجود میں آئی ہے۔ ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کی شخصیت کو سمجھ کر جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ پہلے انھی کے لفظوں میں ملاحظہ کر لیں :

"احمد جمال پاشا فرشتہ نہیں تھے۔ ان میں بھی وہ بشری کمزوریاں موجود تھیں جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں لیکن وہ دُہرے کردار کے مالک نہیں تھے۔ جو اُن کے دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی رہتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جن کی خواب گاہوں میں مخملی بستر اور ڈرائنگ روم میں قیمتی قالین بچھے ہوتے ہیں لیکن دل کے دروازے پر نگاہ ڈالیے تو ٹاٹ کے پردے ٹنگے دکھائی دیں گے۔"

ظفر کمالی نے یہ جملے صرف عقیدت میں نہیں لکھے ہیں۔ احمد جمال پاشا کی زندگی سے متعدد واقعات پیش کر کے انھوں نے اپنے نتائج اخذ کیے ہیں۔ طالب علموں کو کس طرح ادب کی طرف راغب کرتے، اس کا بیان بہت دل چسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ ظفر کمالی نے لکھا ہے : 'کلاس میں جسے دیکھتے کہ ذرا ذہین

قاف درست ہے، اس کے پیچھے پڑ جاتے'۔ اس کے بعد اُسے گھر پر بلانا، طرح طرح کی کتابیں پڑھنے کے لیے دینا اور پھر کچھ کچا پکا لکھوا کر اُسے کسی رسالے میں شایع کرا دینا ---- گویا ادیب بنانے کا یہ مجرب نسخہ تھا۔ ظفر کمالی نے لکھا ہے: 'اکثر فرماتے کہ جس کی ایک چیز چھپ گئی، سمجھو وہ پھنس گیا'۔

احمد جمال پاشا مالی اعتبار سے کمزور طالب علموں کی خاموشی سے مدد کرتے تھے اور جو لڑکے کہیں باہر پڑھنے کے لیے جا چکے ہوتے، ان کے لیے ماہ در ماہ منی آرڈر کا انتظام بھی کرتے تھے۔ ظفر کمالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ منی آرڈر کی رسیدیں جلا دیتے تھے تاکہ کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کے کتابوں کے جمع کرنے کے شوق پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: 'کتابوں کی چوری کو جائز سمجھتے تھے...... اس ضمن میں وہ اپنے مختلف کارناموں کا ذکر مزے لے لے کر سناتے لیکن کتابیں بانٹنے میں بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے'۔

ظفر کمالی نے زندگی کی اہم اور غیر اہم درجنوں چیزوں کو سامنے رکھ کر احمد جمال پاشا کی شخصیت کی ایسی تصویر بنائی ہے جس سے صاف صاف ان کی دل فریبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ کسی کی شخصیت میں واقعتاً کیسا جادو ہوتا ہے، اسے جاننے کے لیے ظفر کمالی کے لکھے یہ دس بارہ صفحات صرف پڑھ لینا کافی ہے۔ انھوں نے طلسمِ پاشا کے خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں کی بہت سلیقے سے وضاحت کی ہے۔ الفاظ اور جملوں سے حقائق کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شخصیت کے تار و پود کھینچ دینا ظفر کمالی کا وہ کارنامہ ہے جسے عام طور پر کوئی محقق یا ناقد انجام نہیں دے سکتا۔ شخصیت سازی اور شخصیت شناسی میں ظفر کمالی کتنے گہرے ہیں، اسے جاننے کے لیے ذیل کا اقتباس ضرور دیکھنا چاہیے:

> "احمد جمال پاشا نے بھرپور زندگی گزاری۔ وہ مسرّت اور محبت کے خزانے جھولیاں بھر بھر کر لٹاتے رہے..... انھوں نے ظرافت کا ایسا لبادہ اوڑھ رکھا تھا کہ عام لوگ تو درکنار، اُن سے قریب رہنے والے بھی اُن کی اصل شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ انھیں ایک شوخ، بذلہ سنج اور زندہ دل انسان سمجھا جاتا رہا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ پاشا صاحب اندر سے بہت دُکھی انسان تھے۔ قدرت نے انھیں غموں سے نباہ کرنے کا حیرت انگیز ملکہ ودیعت کیا تھا۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کو خود سے اظہارِ ہمدردی کا موقع

بہت کم دیا۔ وہ دل کے مریض ہو گئے لیکن کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی"۔

ظفر کمالی کا یہ مضمون بلاشبہ قاموسی ہے۔ آج کل پانچ سو اور ہزار صفحات کی بھی کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کے لکھنے والے تحقیقات کے بے روح تجزیے سے چند قدم آگے نہیں نکل پاتے۔ کبھی کبھی پوری کتاب پڑھنے کے باوجود یہ سمجھ میں آنا مشکل ہوتا ہے کہ ممدوح کی اصل خوبیاں کون کون سی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی سے لے کر ریاستی اکادمیوں تک مونوگراف شایع کرنے کا اَب خوب خوب چلن ہے۔ ایسی کتابوں میں لکھنے والے ادبی اور تنقیدی اہمیت کا بہ صراحت بیان اپنا آخری کام سمجھتے ہیں۔ لیکن جب تک شخصیت سازی تحریر میں بدل نہ جائے، اُس وقت تک مونوگراف بے جان رہے گا۔ ظفر کمالی کا یہ مضمون 'احمد جمال پاشا : حالاتِ زندگی اور شخصیت' کسی مصنف کی زندگی پر تیار کیا گیا ایک مثالی مونوگراف ہے بھلے لکھنے والا اسے ایک مضمون سمجھتا ہے۔ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے ہوئے جس طرح سے ان کی ادبی خدمات کو متوازی طور پر پیش کیا گیا ہے، اس سے تحریر زیادہ قابلِ مطالعہ ہو گئی ہے۔ کاش ہمارے لکھنے والے ظفر کمالی کی اس تحریر کو سنجیدگی سے پڑھتے اور مونوگراف لکھنے کے لیے جو احساسِ تناسب اور توازن چاہیے، اس کی روشنی ظفر کمالی سے حاصل کر پاتے!

ظفر کمالی کی اس کتاب کا مضمون ''احمد جمال پاشا کا آخری سفر'' اصل میں ایک رپورتاژ ہے جس میں انھوں نے ۲۵ رستمبر ۱۹۸۷ء کو پٹنہ میں احمد جمال پاشا کی آمد سے لے کر دل کا دورہ پڑنے اور بالآخر وفات، جسدِ خاکی کا پٹنہ سے سیوان جانا اور پھر وہاں تجہیز و تکفین کی آنکھوں دیکھی تفصیل بیان کی ہے۔ ابتدا کے چودہ صفحات احمد جمال پاشا کی شخصیت کی طرح قہقہہ زار ہیں اور آخر کے دس صفحات خون کے آنسو رُلانے والے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ظفر کمالی کے ہاتھ میں کوئی کیمرہ ہے اور وہ تیزی سے تصویریں اتارتے چلتے ہیں۔ ان لفظی تصویروں میں احمد جمال پاشا ہی نہیں، عظیم آباد کی کئی ادبی شخصیات اور خود ظفر کمالی کبھی خوشی اور کبھی غم کے ترجمان بن کر اُبھرتے ہیں۔ اس رپورتاژ کے لکھنے سے پہلے مصنف نے ضبط سے کام لینے کا ارادہ کیا تھا لیکن آخر آخر تک ضبط کی دیوار منہدم ہو جاتی ہے۔ یہ رپورتاژ سب کچھ آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا اور ٹھیک احمد جمال پاشا کی شخصیت کی طرح اوّل تا آخر بے ساختہ ہے۔

ظفر کمالی فنِ رپورتاژ نگاری سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ انھوں نے کسی اضافی بات اور تفصیلِ محض کو اس مضمون میں شامل نہیں ہونے دیا۔ انھیں معلوم ہے کہ کیمرے کی آنکھ احمد جمال پاشا کی طرف رکھنی ہے۔ اُن

کی تصویر اُتارتے ہوئے ان کے ساتھ چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے اور روتے بلکتے جو چہرے آجائیں، انھیں بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ظفر کمالی چاہتے تو اپنا تذکرہ دوسرے مصنّفین کی طرح بیش از بیش شامل کرکے احمد جمال پاشا کے ساتھ ساتھ خود کو بھی نمایاں کردیتے لیکن ان کے یہاں حیرت انگیز طور پر توازن اور احتیاط موجود ہے جن کے پہرے میں انھوں نے یہ مضمون مکمّل کیا ہے۔ اردو میں رپورتاژوں کی کمی نہیں۔ ترقّی پسند مصنّفین نے تو اس صنف کو نئی بلندیاں عطا کیں۔ فی زمانہ ایسے زیادہ لوگ دکھائی نہیں دیتے جنھیں رپورتاژ نگاری سے دلی شغف ہو۔ جو رپورتاژیں شایع ہو رہی ہیں، ان میں مشاہدات اور تاثرات کے مقابلے تعصبات کا پرتو زیادہ ملتا ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے زمانے میں ظفر کمالی کا دَم غنیمت ہے۔ ان کے رپورتاژ کی ایک خوبی مزید لطف اور اثر پیدا کرتی ہے کہ قہقہے لگاتے لگاتے آپ کس طرح سے آہیں بھرنے لگے، یہ پتا ہی نہیں چلتا۔ پس منظر بدلنے کے مرحلے میں انھوں نے بیان کی رفتار کو اس قدر تیز کردیا ہے کہ یہ محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ ہماری ہنسی کس طرح ہوا ہوگئی اور ہم ماتم کناں ہوگئے۔ ظفر کمالی ایسی دو چار پختہ تحریریں اور پیش کردیں تو انھیں اردو کے بڑے رپورتاژ نگاروں میں یقینی طور پر شامل کیا جاسکے گا۔

موت کی خبریں اختصار یا تفصیل کے ساتھ بار بار شائع ہوتی ہی رہتی ہیں۔ یہ سلسلہ مشاہیر سے لے کر عام لوگوں تک قائم ہے۔ مشاہیر کی وفات کے سلسلے سے اردو میں اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے لیکن ہماری نظر سے ایسی کوئی بھرپور، تفصیلی اور اثر انگیز تحریر نہیں گزری جس میں کسی شخصیت کی موت کے آخری تین چار دنوں کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک دھڑکن لفظوں میں قید ہوگئے ہوں۔ ظفر کمالی نے سانسوں اور آہوں کو ہی قید نہیں کیا بلکہ احمد جمال پاشا کی پھلجھڑیوں کو بھی اس میں سمودیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سیوان سے احمد جمال پاشا ریڈیو پروگرام میں مجاز لکھنوی پر اپنے تاثرات 'آنکھیں ترستیاں ہیں' عنوان کے تحت ریکارڈ کرانے عظیم آباد پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن میں پروگرام افسر نے خط دیکھ کر بتایا کہ آپ کو ۲۶ ستمبر کو نہیں بلکہ ۲۶ اکتوبر کو ریکارڈنگ کرانی ہے۔ یعنی ایک ماہ قبل احمد جمال پاشا پٹنہ پہنچ گئے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر وہ انگریزی کتابوں کی دکان اور پھر ایک ہوٹل ہوتے ہوئے خدابخش لائبریری گئے۔ کچھ کتابیں بازار سے خرید کر منگوائیں پھر خدابخش کے پروگرام میں شریک ہوکر پروفیسر سیّد حسن کے سلسلے سے اظہارِ خیال کیا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد سبزی باغ کتابوں کی دکان تک پہنچے اور وہاں طبیعت کی خرابی کا ذرا سا احساس ہوا لیکن گھومتے پھرتے ظفر کمالی کے لاج تک واپس آئے۔ دیر رات تک دنیا جہان کی

باتیں کرتے رہے۔ صبح اُٹھ کر عام انداز میں ہی پروفیسر اعجاز علی ارشد کے یہاں گئے۔ وہاں اسرار جامعی بھی آ گئے۔ ظرافت نگاروں کا آپس میں ہنسنا بولنا اور قہقہہ لگانا جاری رہا۔ اسی دوران انھوں نے بلڈ پریشر کی شکایت کی اور پھر طبیعت اچانک بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر آئے اور فوراً اسپتال لے جانے کا حکم دیا، معلوم ہوا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔

احمد جمال پاشا اس آخری سفر میں پٹنہ اپنے عزیز طالب علم ظفر کمالی کے یہاں پہنچے اور انھی کے ساتھ طالب علموں کے لاج میں انھوں نے قیام کیا۔ پُر از شفقت قیام کا یہ سلسلہ بہت پہلے سے قائم تھا۔ اس وقت سے لے کر حیات و موت کی آخری کشمکش اور تدفین تک کا ایک ایک لمحہ ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا کے ساتھ گزارا۔ جس طرح ہنستے ہنساتے احمد جمال پاشا عظیم آباد آئے اور سب کو رلاتے ہوئے رخصت ہوئے، اسی طرح ظفر کمالی نے بھی یہ رپورتاژ قہقہہ بردوش شروع کیا لیکن اشک آمیز اور خوں بار ختم کیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں جن سے اس تحریر کی قوت اور اثر آفرینی کا اندازہ ہو سکتا ہے:

- ''باتیں کرتے ہوئے ارشد صاحب کے گھر پہنچے۔ وہ فوراً آئے۔ دونوں ایک دوسرے سے گلے ملے۔ پاشا صاحب نے چھوٹتے ہی ناشتے کی فرمائش کر دی اور کہا کہ ناشتہ پُر تکلف ہونا چاہیے۔ ارشد صاحب بولے: ''میں تو ناشتہ کر چکا۔ آپ تاخیر سے آئے''۔ انھوں نے فوراً پیشہ ور واعظ کی طرح مہمان کی تواضع اور خاطرداری سے متعلق تقریر شروع کر دی۔ پاشا صاحب پورے موڈ میں تھے۔ خوب خوب پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ٹھیک اُسی وقت علامہ اسرار جامعی داخل ہوئے۔ پاشا صاحب نے آہستہ سے ارشد صاحب سے کہا: ''آج علامہ کی کھنچائی ہونی چاہیے''۔ علامہ ابھی خاموش کھڑے ہی تھے کہ پاشا صاحب گویا ہوئے: ''ارے علامہ! یہ حملِ حرام کی طرح مُنہ پھلائے کیوں کھڑے ہیں، بیٹھیے تو سہی''۔ علامہ کچھ جھینپے اور ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی پاشا صاحب نے اُن پر پے بہ پے حملے شروع کر دیے۔ ''علامہ! آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟ فلاں سے کر لیجیے، ان سے نہیں تو فلاں بیوہ سے کر لیجیے۔ ویسے آپ بھی کسی بیوہ سے کم نہیں ہیں''۔ بعدہٗ انھیں مشاعروں میں کامیابی کے نسخے بتانے لگے۔ ہر دو جملے کے بعد چٹکی لینا نہ بھولتے۔

■ ''باتوں باتوں میں پاشا صاحب نے کہا: ''ارشد صاحب! کیا عظیم آباد کی عزت خاک میں ملانے کا ارادہ ہے؟ علامہ اتنی دیر سے بیٹھے ہیں اور آپ نے چاے تک نہیں منگائی۔'' جب چاے آئی تو اسے پینے سے پہلے باتھ روم جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گئے اور دو تین منٹ بعد واپس آئے تو میری بغل والی کرسی پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ ارشد صاحب سے کہا ''یار! یہ بلڈ پریشر کئی روز سے تنگ کر رہا ہے۔ ابھی اس کے مزاج درست کرتا ہوں''۔ مجھ سے بولے کہ بیگ سے وہ ٹکیہ نکالو اور اسے نصف کر کے دو''۔ میں نے ٹکیہ دی، فوراً کھائی لیکن جبیں پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ کرسیوں کے ساتھ لگے بستر پر آ کر لیٹ گئے۔ میں وہاں سے دوڑ کر دو ڈلی گھاٹ آیا کہ شاہد صاحب (ڈاکٹر) کو لے جا کر دکھادوں لیکن وہ اس وقت کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا واپس آیا تو دیکھا تہمد اور بنیان پہنے برآمدے میں لیٹے ہیں اور جیسے کسی نے انھیں پسینے میں نہلا دیا ہو۔ اتفاق سے بجلی بھی چلی گئی تھی۔ علامہ اپنی پوری طاقت سے پنکھا جھل رہے تھے۔ ارشد صاحب وہاں موجود نہ تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ شمشاد جہاں چھت کی سیڑھیوں پر کھڑی حیران پریشان یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے پیروں کو چھوا تو محسوس ہوا جیسے برف پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔ پاشا صاحب نے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور اُسے سہلانے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت ارشد صاحب ڈاکٹر واہب حسین صاحب اور ایک ٹمپو کو لے کر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا، دوا کھلائی، آہستہ سے کہا کہ دل کا دورہ ہے اور فوراً پی۔ ایم۔ سی۔ ایچ۔ لے جانے کا مشورہ دیا۔''

■ ''کئی بار نرس آئی۔ ڈاکٹر صاحب آئے، دیکھا، کچھ نوٹ کیا اور چلے گئے۔ میں نے حالت پوچھی تو کوئی جواب نہیں دیا۔ Cardiac Monitor میں ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۲ نمبر آ رہے تھے، جا رہے تھے۔ کچھ بولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی تذبذب میں ہیں۔ اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میرا کان اپنے منہ کے پاس کرتے ہوئے نہایت آہستہ ٹھہر ٹھہر کر نصیحتیں شروع کر دیں: مسیحائی

اور ایمان داری کے راستے پر چلنا؛ اس میں دشواریاں پیش آئیں گی، انھیں برداشت کرنا۔ زندگی بھر مطالعہ جاری رکھنا۔ فلاں سے بچ کر رہنا؛ وہ چونی کے لیے تمھارا قتل کر سکتا ہے۔ اسرار جامعی وقت اور حالات کے مارے ہوئے ہیں، ان کا خیال رکھنا۔ میں نے تمھیں جو پڑھایا اور بتایا ہے، اسے دوسروں تک پہنچا دینا۔ دیکھو علم کی یہ شمع بجھنے نہ پائے"۔ یہ کہتے کہتے آواز بھرّا گئی"۔

■ "پونے نو بجے کے قریب پاشا صاحب نے کچھ بے چینی محسوس کی۔ ہر منٹ کروٹ بدلنے لگے اور ہاتھ پانو اِدھر اُدھر پھینکنے لگے۔ بولے "مجھے بٹھا دو"۔ آہستہ سے بٹھایا تو بولے "لٹا دو"۔ اور پھر "لیٹوں گا، بیٹھوں گا، بیٹھوں گا لیٹوں گا" کی تکرار جاری رہی۔ اچانک مضطرب ہو کر بولے "میرے خدا، اب مر جاؤں گا"۔ ڈاکٹر اور نرس انھیں قابو میں کرنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے۔ Cardiac Monitor میں نمبر ۸۷۔۹۷ سے بڑھ کر سکنڈوں میں سو، تین سو، ساڑھے تین سو، ڈیڑھ سو، بیس، چالیس، دو سو، تین سو ہونے لگا۔ محراب نما شکلوں کے بجائے جیسے فوارے چھوٹ رہے ہوں۔ ہم سب دانتوں میں انگلی دبائے کھڑے تھے۔ متین صاحب نے بے چین ہو کر کہا کہ بیدار صاحب کو بلا لاؤ۔ میں بدحواسی کے عالم میں دوڑا۔ لیکن یہ کیا! پانو مَن مَن بھر کے ہو گئے۔ دوڑنا چاہتا تھا لیکن جیسے زمین نے پانو پکڑ لیے ہوں۔ ساجد بھائی روہانسے ہو کر بولے: "لگتا ہے، اب نہیں بچیں گے۔ آنکھیں اُبل پڑی تھیں۔ متین صاحب کلمہ پڑھا رہے تھے"۔ آیا تو دیکھا کہ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ بڑی بڑی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے ہم سب کو باہر کر دیا۔ باہر آئے بہ مشکل سے دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ کان میں آواز آئی "ایکسپائرڈ"۔

اس کتاب میں ایک مختصر حصّہ منظوم خراجِ عقیدت کا بھی ہے۔ بارہ غزلیں اور ایک مرثیہ احمد جمال پاشا کی وفاتِ حسرت آیات پر قلبی تاثرات کے بہ طور موجود ہیں۔ ظفر کمالی نے حالؔی کے مرثیۂ غالبؔ کی زمین کو قابلِ اتباع سمجھا۔ شاید ظفر کمالی نے اپنے لیے ایک ناقابلِ تسخیر نشانہ مقرر کیا تھا۔ حالؔی نے بھی اپنے استاد کی

وفات پر مرثیہ کہا اور ظفر کمالی نے بھی اپنے استاد احمد جمال پاشا کی موت کو اس مرثیے کا موضوع بنایا۔ حالیؔ نے غالبؔ کی عظمت بتاتے ہوئے 'خاک کو آسماں سے کیا نسبت' جیسا ضرب المثل مصرع کہا تھا۔ حالیؔ کے مقام اور مرتبے کو دیکھتے ہوئے ظفر کمالی طفلِ مکتب قرار دیے جائیں گے لیکن اس طفلِ مکتب کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے حالیؔ کے مرثیے کی ساری کیفیات اپنے مرثیے میں سمیٹ لی ہیں۔ یہاں احمد جمال پاشا کی شخصیت پورے طور پر اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ظفر کمالی کی محققانہ اور ناقدانہ حیثیات سے الگ، مرثیہ گوئی کے ضمن میں ان کا یہ کام عوام وخواص سے داد حاصل کر کے رہے گا۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے جن سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس مرثیے میں شاعر رفتہ رفتہ درد کی لے کس قدر بڑھاتا چلتا ہے :

زندگی کچھ نہیں سوائے مذاق — آب و دانہ فریب کھاتا ہے
کُلِّ نفسٍ کی گونجتی ہے صدا — آسماں کو زمیں پہ آنا ہے
رشتے ناتے فضول کی باتیں — اپنی میت ہے، اپنا شانا ہے

عمرِ فانی پہ جو بھی اترائے — چوٹ پر چوٹ مستقل کھائے
آسماں سے ستارہ ٹوٹ گیا — کون سی شمع گُل ہوئی ہائے
اس کو احمد جمال کہتے تھے
دستِ حق کا کمال کہتے تھے

کون دے گا اذانِ علم وادب — سوئے جنت بلال جاتا ہے
جس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے تھے — وہی شیریں مقال جاتا ہے
لکھنؤ جس کے دم سے تھا سیوان — ہاں وہی بے مثال جاتا ہے
پُر کشش کیا رہے گی یہ دنیا — آج سب کا جمال جاتا ہے

اُٹھ گئی آج ایسی شخصیت — تھی جو مخلوق کے لیے نعمت
ساری خلقت اُمڈ کے آئی ہے — آخری دید کی لیے حسرت
ناز ہوگا اسے بھی اپنے پر — جس کو تھوڑی بھی اس سے تھی نسبت

چل بسا دفعتاً وہ پیرِ ادب　　کس کے ہاتھوں پہ ہم کریں بیعت

مٹھیوں میں ہے راکھ یادوں کی　　آنکھ میں کچھ بہ جز غبار نہیں
جس پہ تھا اعتبار وہ تو گیا　　اب کسی پر بھی اعتبار نہیں

دوست اب کس کے میہماں ہوں گے　　جب کہ دنیا سے میزبان گیا
کون سا درد آج حد میں ہے
قصرِ تن زلزلے کی زد میں ہے

اپنی کاوش سے بن کے چمکا تھا　　آسمانِ ادب پہ ماہِ تمام
یوں دھواں اُٹھ رہا ہے سینے سے
دل ہے بے زار اور جینے سے

دستِ شفقت یتیم کے سر پر　　غم کے ماروں پہ مہر بانی تھی
بخش دی نیکیوں کو عمرِ دوام　　عمر مانا کہ اس کی فانی تھی
بعد مرنے کے یہ ہوا احساس　　قدر اُس کی نہ ہم نے جانی تھی

یوں تو دنیا سے لوگ جاتے ہیں　　اس کا جانا مگر قیامت کا
مدرسہ ہو کہ مے کدہ دونوں　　غم مناتے ہیں اس کی رحلت کا
جب فلاطون ہی خموش ہوا　　کیوں نہ ہو بند باب حکمت کا
خاک اڑاؤ جنازہ اٹھتا ہے　　آج شاہنشہِ ظرافت کا

دوست سب کا تھا جو بچھڑتا ہے
گھر بسا تھا وہی اجڑتا ہے
اب ہے تارِ نفس بھی بار ظفرؔ
جامۂ زندگی اُتار ظفرؔ

ان اشعار سے یہ اندازہ مشکل نہیں کہ ظفر کمالی نے اس مرثیے میں کس طرح خون کے آنسو بہائے ہیں۔ حالی کی طرح انھوں نے بھی اپنے بیان میں ضبط کی صورت قائم کی ہے اور احمد جمال پاشا کی شخصیت اور کارناموں کو اُجاگر کرنا مقصد رکھا۔ مرثیے میں آہ وزاری کو انھوں نے اساسی حیثیت نہیں دی۔ ایک ایک لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا دل بھرا ہوا ہے، آنکھیں لبریز ہیں اور شدتِ غم سے زندگی نڈھال ہے۔ یہی شخصی مرثیے کا فن ہے جسے ظفر کمالی نے یہاں آزما کر خود کو حالی کے کہیں پاس کھڑا ہونے کی سعادت حاصل کی ہے۔

اس مضمون میں شاید اس بات کی ضرورت نہ ہو کہ ظفر کمالی کے مرثیے کو حالی کے مرثیۂ غالب کے مقابل رکھ کر کوئی نتیجہ اخذ کیا جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فنِ مرثیہ اور ادبی روایت کا عروج یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احمد جمال پاشا زندگی بہ داماں اور بہ نفسِ نفیس ہمارے سامنے ہیں۔ حیات میں بھی یہ کیفیت ہے اور موت کے بعد بھی یہی صورت ہے۔ شاعری اور مرثیہ گوئی کے اعلا معیار کے ساتھ شخصیت اور کارناموں کو تنقید و تحقیق کے آداب کے ساتھ تسلسل میں پیش کرنا اس مرثیے کا سب سے اچھا پہلو ہے۔ ترتیب اور تنظیم کی وجہ سے یہ مرثیہ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔

منظوم خراجِ عقیدت کے تحت بارہ غزلوں کو بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ یہاں بھی ہر لمحہ اس کا خیال ہے کہ اشعار بَین نہیں بن جائیں۔ کمال یہ ہے کہ یہاں غزلوں کا لہجہ قائم ہے لیکن فضا ایسی بنی ہے کہ اپنے آپ الم ناکی ہمارے دلوں میں سما جاتی ہے۔ غزل کے مزاج سے ظفر کمالی پورے طور پر واقف ہیں۔ اسی لیے یہاں غزل کا انداز ہے اور یادِ احمد جمال پاشا کی کیفیت بھی اُبھر آئی ہے۔ چند اشعار سے ان باتوں کی وضاحت ہو جائے گی۔ ملاحظہ ہوں:

لے گیا جیسے کھلونا کوئی اُس کا چھین کر — ایک بچّے کی طرح مجھ میں سسکتا کون ہے

بسترِ غم پر ظفر ہولے سے جب لگتی ہے آنکھ — کھول کر بانہیں مری جانب لپکتا کون ہے

کیا بتلائیں کیسی بھڑکی ہے یادوں کی پیاس — ایسی پیاس کہ جس میں ایک سمندر ڈوب گیا

کیا بتاؤں ظفر کیسی آندھی چلی — اور تو اور حرفِ دعا بجھ گیا

تاحدِ نظر تپتی ہوئی ریت کا صحرا — لگتا ہے کہیں خطّۂ شاداب نہیں ہے

تیغِ ستم چلی ہے کہیں رات بھر ضرور — ایسی لہو لہان سحر کون دے گیا

جس کو گھنے درخت کے سایے کی تھی تلاش ‏ ‏ بے برگ و بار اس کو شجر کون دے گیا

جسے اُترنا ہو دریا میں شوق سے اُترے ‏ ‏ ہم اب سفینۂ ہستی جلائے بیٹھے ہیں

ہم ظفر جا کر کہاں ڈھونڈیں نشانِ کارواں ‏ ‏ ہے غبارِ کارواں گم، قافلہ سالار چپ

ظفر کمالی کی ہر غزل الگ سے ایک مرثیہ ہے۔ انھوں نے 'احمد جمال پاشا کا آخری سفر' لکھ کر نثر میں مرثیہ گوئی کی؛ پھر حالی کی زمین میں ایک سو اشعار کا مکمل مرثیہ لکھا۔ لیکن انھیں اردو کی سب سے محبوب صنف غزل کا خیال تھا اور وہ اس صنف میں بھی مرثیہ گوئی کے امکانات تلاش کر رہے تھے۔ میر انیس کے بعض مصرعوں یا بند پر نقادوں نے غزل کی لبھاونی پرچھائیں تلاش کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ظفر کمالی غالب کے مرثیۂ عارف کو پڑھ چکے تھے، اس لیے انھوں نے ایک دو نہیں بلکہ بارہ غزلیں احمد جمال پاشا کی نذر کیں۔ یہاں صرف خون کے آنسو ہی نہیں ہیں بلکہ ایک مشاق شاعر کی قدرتِ کلام کا مستحکم ثبوت بھی فراہم کیا گیا ہے۔ غزل کی صنف ہی ایسی ہے کہ ایک شعر سے دوسرے تک پہنچنے میں کیفیت بدلنے لگتی ہے۔ ریزہ خیالی کا الزام یوں ہی نہیں لگا تھا۔ لیکن ایک شاعر ہے جو الگ الگ بحر اور قوافی ردیف میں غزلیں مکمل کرتا ہے، لیکن تمام غزلیں اندر ہی اندر روحانی سطح پر ایسے مضبوط دھاگے سے بندھی ہوئی ہیں جس سے ہر غزل ایک آزاد مرثیہ بن جاتی ہے۔ تمام غزلوں کو ایک ساتھ پڑھیے تو پھر وہ اکائی بن کر مکمل مرثیے کا روپ لے لیتی ہیں۔ بڑے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں اصناف کی قید و بند اتنی نرم ہو جاتی ہے کہ لکھنے والا مرثیے سے غزل اور غزل سے مرثیے کا کام لے لے یا مثنوی میں قصیدہ سمٹ جائے۔ ظفر کمالی اس اعتبار سے بہترین شاعر کے طور پر ہمارے سامنے آئے ہیں۔

ایک مختصر مدت کے لیے احمد جمال پاشا نے ''اودھ پنچ'' کا لکھنؤ سے اجرا کیا جو اُس زمانے میں ظرافت نگاروں کا پلیٹ فارم بن گیا تھا۔ اس کے کُل تیرہ شمارے شائع ہوئے۔ ظفر کمالی نے ایک مختصر مضمون میں احمد جمال پاشا کی ادارت میں نکلنے والے اس رسالے کا تعارف پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے تمام شماروں کا اشاریہ بھی تیار کر دیا ہے جس سے پڑھنے والوں کی آنکھ کُھل جاتی ہے کہ محض تیرہ شماروں میں طنز و ظرافت سے متعلق تمام اہم شخصیات کو کس طرح سمیٹ لیا گیا ہے اور نتیجہ اخذ کرتے ہوئے طنز و ظرافت کی اصل اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے کس طرح ظفر کمالی کا نقطۂ نظر واضح ہے اور انصاف کے مسند سے وہ کبھی الگ نہیں ہونا چاہتے، اس کے ثبوت کے لیے ان کے مضمون کے آخری حصے سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

"'اودھ پنچ' کے تیسرے دور میں پہلے دور والی بات نظر نہیں آتی۔ منشی سجاد حسین نے 'اودھ پنچ' کا اجرا انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا تھا جس کا بیش تر حصہ انگریزوں کی پالیسیوں کا مذاق اڑانے میں صَرف ہوتا تھا۔ سجاد حسین کٹر کانگریسی تھے اور ان کے مزاج میں انتہا پسندی کو خاصا دخل تھا۔ انھوں نے ایک متعین پالیسی کے تحت 'اودھ پنچ' کو قوم کا ترجمان بنایا اور اس سے طنز و ظرافت کے پردے میں اصلاحِ معاشرت کا کام لیا۔ اُن کے مقاصد عظیم تھے اور دائرۂ کار وسیع۔ جب کہ تیسرے دور میں اس کا مقصد ظرافت کی ترقی تک محدود تھا۔ لیکن یہ چیز بہر حال قابلِ تعریف ہے کہ اس نے دورِ سوم میں ظرافت کے جو نمونے پیش کیے، ان کی اکثریت فن کی کسوٹی پر کھری اُترتی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ جب کہ دورِ اوّل میں ہمیں اچھے اور بُرے ہر طرح کے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں"۔

احمد جمال پاشا کے ستائیس مکتوبات جو ظفر کمالی کے نام مختلف اوقات میں لکھے گئے، ان کا متن ضروری حواشی کے ساتھ اس کتاب میں شامل ہے۔ ایک اشاریہ مکاتیب بھی اس کتاب میں موجود ہے، جس میں چار سو چوہتر (۴۷۴) افراد نے احمد جمال پاشا کے نام جو خطوط لکھے، ان کی ضروری تفصیل شامل ہے۔ احمد جمال پاشا کے نام لکھے گئے یہ خطوط بالعموم مشاہیر کے ہیں، اس لیے ان کے مطالعے سے بعض گم شدہ معلومات بھی ہم تک پہنچ سکتی ہیں۔ کتاب سے یہ پتا نہیں چلتا کہ خطوط کا یہ ذخیرہ کہاں محفوظ ہے۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ احمد جمال پاشا نے جس لائبریری اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا سلسلہ قائم کیا تھا، یہ خطوط اس میں محفوظ ہوں گے۔ ان خطوط کی مجموعی تعداد ۱۳۲۴ ہے جس میں احتشام حسین، ابوالحسن علی ندوی، باقر مہدی، خلیل الرحمان اعظمی، رشید حسن خاں، سہیل عظیم آبادی، امتیاز علی عرشی، گیان چند جین، مظہر امام، مشفق خواجہ، نشور واحدی، وامق جون پوری، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی اور یوسف ناظم جیسے اہم افراد کے خطوط بھی شامل ہیں۔

احمد جمال پاشا کے خطوط سے ان کے مزاج اور اندازِ نظر کو سمجھنا مشکل نہیں۔ اپنے عزیز شاگرد کی انھوں نے جس انداز سے خط و کتابت کے ذریعے تربیت کی ہے، وہ قابلِ اتباع ہے۔ رسمی باتوں میں بھی اپنے منصب کا خیال اور شاگرد کو کچھ فائدہ پہنچ جائے، ایسی اطلاع بہم پہنچانا احمد جمال پاشا نے اپنا مقصد سمجھ رکھا ہے۔ یہ خطوط

اکثر و بیش تر کاروباری، اطلاعاتی یا کام کی باتوں کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اس کے باوجود احمد جمال پاشا کی شخصیت اور ان کی ادبی حیثیت کو سمجھنے کے لیے یہاں بہت ساری چیزیں مل جاتی ہیں۔ احمد جمال پاشا کا تنقیدی ذہن کتنا تیکھا تھا، اس کا اندازہ کلیم الدین احمد کے سلسلے سے ایک خط میں لکھی ان کی چند سطروں سے کیا جا سکتا ہے :

> "کلیم الدین احمد اردو کے سب سے بڑے ناقد اس لیے ہیں کہ انھوں نے تمام اردو ناقدین کے مقابلے میں سب سے زیادہ اور سب سے بہتر عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ کلیم صاحب کی تنقید کے تمام کمزور پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے بھی وہ سب سے بڑے ناقد نظر آتے ہیں۔ ان کی کمزوری جھنجھلاہٹ ہے جو طنز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جھنجھلاہٹ انھیں مغرب سے لاعلمی، تنقید اور ادب کے اصولوں سے انحراف یا لاعلمی پر ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ سب سے بڑے طنز نگار ناقد ہیں کہ دوسرے ناقد Defensive اور کلیم صاحب اپنے علم کے بوتے پر Offensive رہتے ہیں۔"

کلیم الدین احمد کے بارے میں یہ بھر پور ناقدانہ تاثر ہے جو بر سبیل تذکرہ احمد جمال پاشا نے اپنے خط میں درج کر دیا ہے۔ ایک خط میں جب ظفر کمالی نے فائز دہلوی کے بارے میں چند معلومات حاصل کرنا چاہیں تو احمد جمال پاشا نے انھیں بیس کتابوں اور رسائل کی فہرست بھیج دی اور یہ ہدایت کی کہ یہ چیزیں خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ خطوط اگر چہ کاروباری نوعیت کے ہیں لیکن ان میں بھی اس انداز کے جملے موجود ہیں :

> "میں تمھیں کیا لکھوں کہ کن ذہنی الجھنوں میں ہوں جس کی وجہ سے زندگی میں ترتیب نہیں ہو پاتی۔ ایک قسم کے فرار کی زندگی گزار رہا ہوں اور یہ ہنستا ہوا آدمی اندر سے کس قدر ٹوٹ پھوٹ چکا ہے، اب تمھیں کیا بتاؤں۔"

سچ ہے کہ خطوط شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ کے دل کا حال کب لفظوں کے قالب میں سما جائے گا، کسی کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔

اس کتاب میں احمد جمال پاشا کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے جسے جون ۱۹۸۶ء میں ظفر کمالی نے لیا تھا۔ اردو ظرافت کی تاریخ یہاں موضوع بحث ہے۔ کبھی کبھی موضوع بدلتا ہے اور گریز کے بعد پھر سے طنز و ظرافت کی

بات آجاتی ہے۔ پاشا کے یہاں وسعت اور گہرائی دونوں ہیں، اس کی مکمل ترجمانی اس انٹرویو میں ہو رہی ہے۔ انشائیہ کے سلسلے سے بھی اس انٹرویو میں پاشا صاحب نے اپنے موقف کا اظہار کردیا ہے اور پاکستان کے ظرافت نگاروں کی اہمیت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ احمد جمال پاشا کے کئی انٹرویو چھپے لیکن اس انٹرویو کی حیثیت تقریباً آخری ہے۔ اس میں ان کی شخصیت کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے اور نہ ہی ان کی ظرافت کو۔ اس کی وجہ سے اس انٹرویو کا دائرۂ کار بڑھ گیا ہے اور اس کی تنقیدی اہمیت بھی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

ظفر کمالی کی یہ کتاب اگر ورق ورق نہ پڑھی جائے اور بعض نام نہاد مبصرین کی طرح صفحات پلٹ کر اس پر گفتگو کر لی جائے تب یہ بکھری ہوئی معلومات کا مجموعہ ہی کہی جائے گی لیکن گہرائی سے پڑھنے اور لفظوں کو کُریدنے کے بعد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ 'متعلقاتِ احمد جمال پاشا' کیسی سنجیدہ، غیر معمولی اور اپنے موضوع پر بیش قیمت دستاویز ہے۔ اس کتاب میں پیش کردہ مواد تحقیقی اعتبار سے صد فی صد مستند ہے۔ آج ایسی کتابیں کہاں جلدی سامنے آتی ہیں جن میں تاریخ اور واقعات کی غلطیاں موجود نہ ہوں۔ ساہتیہ اکادمی کی عظمت اپنی جگہ لیکن اس کے بہت سارے مونوگراف تو اغلاط کا ذخیرہ بن گئے ہیں۔ جب اتنے بڑے اداروں کا حال یہ ہو تو چھوٹے اداروں اور معمولی کوششوں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ ایسے ماحول میں ''متعلقاتِ احمد جمال پاشا'' علمی اعتبار سے اُمید کی ایک کرن ثابت ہوگی۔ ظفر کمالی نے دوسرے نقادوں یا محققوں کے مقابلے میں کم نہیں لکھا۔ رسائل میں بھی وقتاً فوقتاً ان کے طول طویل مضامین شایع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ حق دار تھے۔ ایک معنیٰ میں یہ اچھا یوں ہے کیوں کہ انھوں نے ہمارے پُرانے ادیبوں اور بے لوث خدمت گاروں کا انداز اپنار کھا ہے۔ ستائش اور صلے کے بغیر اپنے دلی جذبے سے لکھا ہے اور انعام واکرام کی ریوڑیاں بٹورنے یا رسائل وجرائد میں اپنے مضمون پر دس تعریفی خطوط شایع کرا لینے کے کام کو ظفر کمالی نے ذہنی نہیں سمجھا۔ انھیں صحیح طور پر معلوم ہے کہ خس وخاشاک اور برساتی مینڈکوں کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ ادب میں سنجیدہ اور سوجھ بوجھ والے عالموں کی ضرورت ہر زمانے میں رہے گی لیکن انھیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ ظفر کمالی نے شعروادب میں ہوس کی جگہ توکل کو گلے لگایا۔ اس لیے خدا نے شہرت سے زیادہ علم کی گہرائی عطا کی۔ ''متعلقاتِ احمد جمال پاشا'' ظفر کمالی کا ابتدائی کام ہے۔ آنے والے برسوں میں تنقیدی اور تحقیقی اعتبار سے اس سے بھی زیادہ گہرے اور بھرپور کارناموں کی ہمیں توقع ہے۔ (2008)

بہار کی ادبی تاریخ نویسی اور مظفر اقبال کی تحقیق

علاقائی تاریخ نویسی کا کام بالعموم مشکل تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ تحقیق کے بکھرے ذرّوں کو سمیٹ کر ایک ایسی عمارت قائم کرنی ہوتی ہے، جس کی تکمیل کے بعد ایک طرف یہ خطرہ رہتا ہے کہ صداقت کی جانچ پرکھ میں کہیں اسے غیر معیاری یا کم معیاری نہ سمجھ لیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ یہ تاریخ قومی دھارے کے ساتھ کس طرح سے جُڑ پائے تاکہ اسے mis-match نہ قرار دیا جائے۔ ایک اور مسئلہ یوں قائم ہوتا ہے کہ جو اصحاب نظر قومی تاریخ نویسی کے ماہرین کے بہ طور شمار ہوتے ہیں، ان کی نظر میں ایسے کام اکثر و بیش تر ہیچ، کم اعتبار اور زیادہ سے زیادہ raw materials ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ علاقائی تاریخ نویسی کی بنیادوں پر ہی قومی تاریخ نویسی کا فریضہ انجام پاسکتا ہے۔ بھلے علاقائی تاریخیں قومی تاریخ کا ایک باب یا ذیلی باب بن کر سامنے رہیں لیکن غالب جزو اور کل یا قطرہ اور دجلہ کی بحث میں بہت پہلے واضح کر چکے ہیں کہ قطرے میں ہی دجلہ دکھائی دیتا ہے مگر شرط دیدۂ بینا کی ہے۔ اس لیے علاقائی تاریخ نویسی کی اہمیت اور اعتبار سے گریز مناسب نہیں۔

ادبی تاریخ نویسی میں یوں تو شروع ہی سے علاقائی تاریخ لکھنے کا رجحان رہا ہے لیکن ایسی کتابوں کا زیادہ اعتبار قائم نہیں ہوا۔ 'پنجاب میں اردو' کو تاریخ کے بجائے لسانیاتی مباحث کے ذیل میں زیادہ یاد کیا جاتا ہے۔ دیگر علاقائی کتابوں کے احوال بھی زیادہ مناسب نہیں رہے۔ قومی تاریخیں ادھوری، نامکمل اور تشنہ ہیں لیکن اکثر و بیش تر قوم کا رجحان انھی کو اعتبار بخشتا ہے۔ اس لیے اردو میں علاقائی تاریخیں زبردست جبر کا شکار ہیں۔ اس کے باوجود یہ بھی سچائی ہے کہ ملک کے گوشے گوشے میں اردو کی علاقائی تاریخیں لکھی جاتی رہی ہیں اور اس سلسلے سے تحقیق کی بھی اچھی خاصی سرگرمی رہی ہے۔ فن تاریخ نویسی کے فروغ کے اعتبار سے

بھی یہ گہماگہمی ایک نیک شگون ہے۔

اردو زبان وادب کے تعلق سے صوبۂ بہار کی حد تک تاریخ نویسی کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں تو امید وبیم کی کیفیات ایک ساتھ ابھرتی ہیں۔ سب سے پہلے معین الدین دردائی نے 'بہار اور اردو شاعری' لکھ کر اس سلسلے سے اپنے تاثرات پیش کیے جسے تذکروں کی روایت کا اگلا قدم کہنا چاہیے۔ رسالہ "ندیم" کے بہار نمبر (۱۹۳۵ء) میں بھی بہار کے مختلف حصوں میں مجموعی طور پر اردو ادب کے فروغ وارتقا کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس سلسلے سے ۱۹۵۷ء میں جب پروفیسر اختر اورینوی کا مقالہ "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا" سامنے آیا تو اندازہ ہوا کہ اس موضوع پر ابھی خاصی تحقیق کے امکانات ہیں۔ اس کتاب میں ابتدائی عہد سے ۱۸۵۷ء تک کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ قاضی عبدالودود نے صراحت کے ساتھ اس کتاب کا ہر پہلو سے تحقیقی جائزہ لیا۔ آج بھی کسی سخت اور علمی اعتبار سے پختہ کار تبصرے کی مثال کے طور پر قاضی عبدالودود کی اُس تحریر کو یاد کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے اختر اورینوی کو محقق کے طور پر ناکام ثابت کیا تھا۔ اختر اورینوی کی کتاب اور قاضی صاحب کے تبصرے کو ایک ساتھ پڑھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس موضوع یعنی بہار کی ادبی تاریخ نویسی پر مزید تحقیق وجستجو کی ضرورت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اختر اورینوی محقق نہیں تھے لیکن ان کی ادبی حیثیت بڑی تھی جس کی وجہ سے ان کے موضوعِ تحقیق کو مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے باقی ماندہ پہلوؤں پر دوسرے محققین نے خصوصی توجہ کی۔ خاص طور سے یونی ورسٹیوں میں تحقیق کے لیے بھی معتدد اصحاب نے بہار کے حوالے سے زبان وادب کے ارتقا کی الگ الگ کڑیوں کو جوڑنے میں سرگرمی دکھائی۔ دیکھتے دیکھتے ناول نگاری (آصفہ واسع)، ڈراما نگاری (سید حسن)، سوانح نگاری (عبدالواسع)، مثنوی نگاری (احمد حسن دانش)، افسانہ نگاری (قیام نیّر)، تنقید (اعجاز علی ارشد) وغیرہ کے تعلق سے کتابیں وقفے وقفے سے چھپ کر سامنے آتی گئیں۔ معتدد لوگوں نے انتخابات بھی شائع کیے جن سے بہار کے ادبی ارتقا کے کچھ پڑاو سامنے آتے ہیں۔ ایسی تاریخوں کے پہلو بہ پہلو ضلع وار یا کمشنری کی حد تک بھی بعض کتابیں سامنے آئیں جن میں سے اکثر کی حیثیت تذکروں کی ہے۔ تذکرۂ بزمِ شمال (شاداں فاروقی)، مظفر پور: ایک علمی وادبی مرکز (محمد حامد علی خاں)، گل ہائے چمپا (ظفر مجیبی) وغیرہ خالص تذکرے ہیں۔ بعض کتابیں ادب اور تاریخ کے بین بین رہ کر بھی لکھی گئیں۔

بہار کے ادبی ارتقا کے سلسلے سے اس تفصیلی گوشوارے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے جب تحقیق اور تلاش و جستجو کے اعلا معیار کو پیمانہ بناتے ہیں تو مجموعی صورت حال کا احاطہ کرنے کے سلسلے سے سب سے معقول اور مستند تحقیق پروفیسر مظفر اقبال کی سمجھ میں آتی ہے جسے ''بہار میں اردو نثر کا ارتقا'' کے عنوان سے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کی ادبی تاریخ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ مقالۂ علیہ پروفیسر اختر اورینوی کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا جس کے ممتحنین میں کلیم الدین احمد، سید احتشام حسین اور خواجہ احمد فاروقی شامل تھے۔ آج کے تحقیق بے زار ماحول میں مظفر اقبال کی کتاب ایک مثالی نمونہ ہے اور کتاب کا ایک ایک صفحہ یا ہر باب یہ واضح کر رہا ہے کہ صاحب تحقیق اپنے موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہے اور بکھرے ہوئے مواد کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنے کا اہل ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں موضوع پر مصنف کی مکمل دسترس کا احساس نہیں ہوتا ہو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ پروفیسر مظفر اقبال نے چند متفرق مضامین کے علاوہ تصنیف و تالیف کے شعبے میں اس کتاب کے ماسوا مستقل اثاثہ نہیں چھوڑا جس کی وجہ سے علمی اور ادبی حلقے میں رفتہ رفتہ وہ گم نام ہوتے چلے گئے لیکن ان کی بہار شناسی کے تعلق سے واحد کتاب 'بہار میں اردو نثر کا ارتقا' اپنے معیار اور ٹھوس علمی بنیادوں کی وجہ سے اپنا اعتبار آپ قائم کر رہی ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ بہار کی ادبی تاریخ نویسی کے سلسلے سے یہی کتاب اپنے موضوع کے ساتھ پورے طور پر انصاف کرتی ہے۔

اس کتاب کا باب اوّل پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے جہاں بہار اور ہندستان میں اردو زبان اور بالخصوص نثر کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے زمانے پر حاوی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کے سلسلے سے اطلاعات فراہم کرنے میں مظفر اقبال نے اپنے نگراں اور استاد اختر اورینوی کی فراہم کردہ معلومات پر یکسر تکیہ نہیں کیا بلکہ جہاں جہاں ضروری معلوم ہوا، وہاں فروگذاشتوں کا تدارک بھی کیا ہے۔ اکثر و بیش تر انھوں نے قاضی عبدالودود کے تبصرے میں موجود معلومات کو اپنے لیے نشانِ راہ بنایا۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ علمی معاملوں میں بھی لوگ اپنے اساتذہ کی خامیوں کو ڈھونے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ مظفر اقبال کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی اضافی جملوں کا استعمال کیے بغیر صرف حقیقت کی شمولیت کو نگاہ میں رکھا اور اس خارزار سے بہ عافیت گزر گئے۔ ان کے مقالے کے ابتدائی پچاس صفحات بہت ساری اطلاعات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے نہایت کارآمد ہیں۔

مظفر اقبال نے اپنی تحقیق میں سب سے تفصیل سے مذہبی نثر کے نمونوں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ تقریباً ۹۰ صفحات پر حاوی ہے۔ موجودہ زمانے کی روشِ علمی کو نظر میں رکھ کر اس باب پر تبصرہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ محققین کو یہ موضوع از کار رفتہ اور غیر ضروری معلوم ہو لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد کی سماجی، سیاسی اور مذہبی صورت حال پر غور کریں تو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اس عہد میں حدد رجہ مذہبی اور ثقافتی افکار و نظریات کی ایسی آویزشیں چل رہی تھیں جن سے فرد اور معاشرے کی وابستگی ممکن ہی نہیں تھی۔ خیالات اور عقائد کی رسّہ کشی اور گھمسان کے درمیان ہماری زبان ہندستان کے طول و عرض میں مجادلے اور محاربے کا صحیح عکاس اور ترجمان بن کر اُبھری۔ تحریکِ اہلِ حدیث یا وہابی تحریک، تبلیغِ عیسائیت، آریہ سماج اور تحریکِ احمدیہ وغیرہ کے سلسلے سے جو کتب و رسائل منظرِ عام پر آئے، ان میں سب سے بڑا حصّہ اردو زبان کا تھا۔ اگر سرسیّد کی تحریک اور قومی تحریک کا اس میں اضافہ کر دیا جائے تو اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ غدر کے بعد کے زمانے میں اردو کس طرح ہمارے قومی افکار و نظریات کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اسی لیے مظفر اقبال نے یہ اچھا کیا کہ اس موضوع پر بہار کے حلقے میں جو ادب لکھا گیا، اسے کسی مسلکی تعصب کے بغیر ادبی نمونے کے طور پر اپنے جائزے کا حصّہ بنایا۔ اس حصّے میں جن تصانیف یا رسائل کا مظفر اقبال نے ذکر کیا ہے، ان کی تعداد دو سو سے کم نہیں ہے۔ یہ تعداد اس بات کی دلیل ہے کہ انیسویں صدی کے نصف دوم میں سماجی، سیاسی اور مذہبی تحریکات کا کس قدر زور تھا اور مذہبی و مسلکی اعتبار سے یہ قوم کتنی ذکی الحس تھی۔ مظفر اقبال نے ۹۰ر صفحات میں اختصار کے ساتھ جو اطلاعات دی ہیں، ان پر الگ سے تحقیق ہو اور اس زمانے کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کے تناظر میں مذہبی ادب کی اہمیت کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا علمی کام انجام پائے گا۔ مظفر اقبال کے دائرۂ کار میں یہ موضوع ضمنی تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اس ادب کو اپنے مطالعے میں خاطر خواہ جگہ دی اور صحیح تناظر میں ایسی تحریروں کو پیش کر کے مستقبل کے محققین کی رہنمائی کی۔

اس کتاب کے تیسرے باب میں صحافت اور متفرق نثری تحریروں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دیگر اصناف سے یہاں تاریخ، تذکرہ، سیرت، سوانح، آپ بیتی، سفرنامہ اور طب، قانون، جغرافیہ، ریاضت، سائنس، فلسفہ، اخلاق، تعلیم اور دیگر علوم و فنون سے متعلق بہار کے مصنفین کی مستقل بالذات تصنیفات کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔ متفرقات کے ذیل میں ۴۷ر مطبوعہ کتابوں کا پتا لگانا اور ان کے بارے

میں ضروری معلومات فراہم کرنا مظفر اقبال کا بڑا کارنامہ ہے۔ پنجاب، بنگال اور اتر پردیش جیسے صوبوں میں جو تصنیفی پیش رفت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے بیچ ہوئی، اس کا موازنہ اگر اس علمی سرمایے سے کیا جائے تو اہلِ بہار کا سر فخر سے اُٹھتا ہوا دکھائی دے گا۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات اپنی جگہ لیکن غیر تخلیقی ادب میں اس قدر بھرپور پیش رفت بلاشبہ حیرت انگیز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہار کے مصنفین اردو زبان کی تکنیکی جہات کو پورے طور پر سمجھ رہے تھے اور نئے نئے تعلیمی محاذ پر اپنی زبان کے دروازے کھول رہے تھے۔

اس کتاب کے تیسرے باب میں مظفر اقبال نے بہار کے ۶۲ اردو اخبارات و رسائل کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چار اخبارات ۱۸۵۷ء سے قبل نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ بہار سے پہلا اردو اخبار ''نورالانوار'' آرہ سے ۱۸۵۳ء میں جاری ہوا۔ اُس وقت سے ۱۹۱۴ء تک کے اہم اخبارات کی تاریخ پیش کرنا اور حسب ضرورت تفصیل درج کرنا، اور لازم ہو تب اصل اقتباسات کو بھی شامل کرنا ایک بڑا کام تھا۔ مظفر اقبال نے علمی اعتبار سے جس اخبار یا رسالے کی جو جگہ تھی، اسی اعتبار سے اس کے تذکرے کو وسعت بخشی۔ ان اخبارات کی تاریخ دیکھنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بہار کے بعض اخبارات کی اس زمانے میں قومی اعتبار سے پہچان قائم تھی۔ ان میں شائع شدہ ذخیرے کو ادبی تاریخ نویس حسبِ ذکاموں کے لیے بہ طور حوالہ استعمال کر سکتے ہیں۔ اس باب میں مظفر اقبال نے بعض تحریروں کے جو مختصر نمونے پیش کیے ہیں، ان کا اردو کے نثری اسلوب کے ارتقا کی کڑیوں کو جوڑنے میں زبردست مصرف لیا جا سکے گا۔

''بہار میں ادبی نثر'' عنوان سے مظفر اقبال نے اپنی تحقیق کا چوتھا باب مکمل کیا ہے۔ اس مقالے کا یہ بنیادی باب ہے، اسی لیے یہ سب سے طویل ہے۔ اس میں داستان، تمثیلی قصے، ناول، ڈراما اور تنقید کے علاوہ ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے بیچ مظفر اقبال نے ان اصناف کے تحت چالیس کتابیں تلاش کیں جن کا یہاں تعارف شامل ہے۔ ۱۳۲ رصفحات میں جن چالیس کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، وہ نہایت قیمتی ہیں اور اس دور کو بہار کے قدیم ادب کے عہدِ شباب سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس باب سے متصل حصہ ادبی اور لسانی تحقیقات کا ہے جہاں لغات، تاریخ ادب، ادبی تذکرے، ادیبوں کی سوانح عمریاں اور لسانیات و قواعد سے متعلق علاحدہ باب قائم کیا گیا ہے۔ یہاں دس لغات، چار تذکرے، دو سوانح عمری اور زبان و قواعد سے متعلق ۳۸ کتابوں کے سلسلے سے معلومات فراہم کی

گئی ہیں۔ قومی تناظر میں اس عہد کے ان موضوعات پر لکھنے والوں کا موازنہ کیا جائے تب یقین آ جائے گا کہ بہار میں اردو ادیبوں کی خدمات کس قدر وقیع ہیں۔

ادبی نثر کے جائزے میں مظفر اقبال نے جن کتابوں کو موضوعِ بحث بنایا ہے، ان میں 'اصلاح النسا'، 'کاشف الحقائق'، 'فرہنگِ آصفیہ'، 'محل خانہ'، 'صورۃ الخیال'، 'نقشِ طاؤس'، 'سجاد و سنبل'، 'زندگانی بے نظیر'، 'جلوۂ خضر' اور 'نوائے وطن' جیسی مشہور تصانیف شامل ہیں۔ مظفر اقبال نے ان کے مطبوعہ نسخوں پر گفتگو کرتے ہوئے لازمی طور پر دیگر محققین کے نتائج سے حسبِ ضرورت موازنہ اور مقابلہ کرایا ہے۔ اس مرحلے میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مصنف نے تمام ضروری مآخذات کی سیر کر لی ہے، اسی لیے یہاں کوئی مفروضہ یا اندازہ نہیں بلکہ ہر اطلاع اپنے اصل حوالے کے ساتھ شامل ہے۔ یہ وہی کتابیں ہیں جنھیں بہار کے تعلق سے قومی سطح پر نقاد اور محقق اپنے ادبی جائزے میں استعمال کرتے ہیں۔ مظفر اقبال کی کتاب کی افادیت یہی ہے کہ بہار کی ادبی تاریخ کے ان نمونوں کو پہلی بار محققانہ استناد کے ساتھ یہاں پیش کیا گیا ہے جن کے بغیر اردو ادب کی تاریخ ادھوری رہ سکتی تھی۔ یوں تو مظفر اقبال کا دائرہ کار ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء رہا ہے لیکن انھوں نے ہر باب کے آغاز میں اور اپنے مقالے کے بابِ اوّل میں ۱۸۵۷ء سے قبل کے عہد کی معلومات کو مصدقہ ذرائع کے ساتھ چھان پھٹک کرتے ہوئے پیش کر کے معلومات کا ایک اضافی ذخیرہ بھی جمع کر دیا۔ اس لیے کہنے کو یہ کتاب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے زمانے کو محیط ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ بہار کی اردو نثر کی مکمل تاریخ ۱۹۱۴ء تک اس میں سمٹ آئی ہے۔

عام طور سے اہلِ علم کا یہ شیوہ رہا ہے کہ کسی شاعر، ادیب، نقاد یا محقق کو اس کی مجموعی خدمات کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر کسی لکھنے والے کی تصنیف وتالیف کی عمر چالیس یا پچاس برس ہے، تب یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ لکھنے والا تسلسل میں علمی کاموں کو انجام دیتا رہے۔ شعرا یا دیگر تخلیق کاروں کے تعلق سے بار بار یہ الزام عائد ہوتا رہا ہے کہ فلاں زمانے کے بعد ان کا تخلیقی سوتا خشک ہو گیا لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اُن کے حاصل شدہ کارناموں پر قناعت کر کے ان کی قدر و قیمت کے تعین کو اوّلیت دینے میں کون سی پریشانی حائل ہوتی ہے؟ یورپ کے بہت سارے مصنفین ایسے ہیں جنھیں 'جز وقتی' تسلیم کیا جائے گا لیکن انھوں نے بڑے تخلیقی یا تنقیدی و تحقیقی کارنامے پیش کیے۔ کسی نے نوخیزی کے زمانے میں لکھا اور ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا۔ کسی

نے پختہ عمری میں ہی تصنیف وتالیف کی طرف توجہ کی اور ایک کتاب یا ایک مقالے کی وجہ سے ادب کا لافانی کردار بن کر زندۂ جاوید ہوگیا۔

لیکن ہماری مشرقی تہذیب فانی اللہ کے انداز میں فانی الادب کا تقاضہ رکھتی ہے کیوں کہ ہم نے یہ مان لیا ہے کہ جو ادب کے دائرے میں ایک بار داخل ہوگیا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادب اور ادبی تصنیفات کا اسیر ہوکر رہ جائے۔ آج کے صارفی عہد میں ایسے تقاضے دائرۂ خلوص سے بڑھ کر جبر کی حدوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کم نہیں کہ کسی نے جی جان لگا کر ایک تصنیف یادگار چھوڑی اور وہ زندگی کے دوسرے کاموں یعنی غیر ادبی کاموں میں اس طرح اُلجھا کہ دشتِ ادب میں اس کی واپسی ہی نہیں ہو سکی۔ مظفر اقبال کی اس واحد بھرپور تحقیق کے معیار و مرتبے کا تعین کرتے ہوئے مجھے اپنی زبان کا جبریہ اصول یاد آتا ہے ورنہ دو چار اچھی بُری اور فضول قسم کی کتابیں لکھ کر کارِ زیاں کرنے والوں کو تو ہم مستقل مصنف کے طور پر یاد کرتے ہیں لیکن مظفر اقبال جیسے معتبر، بھرپور اور علمی اعتبار سے گراں مایہ تحقیقی دستاویز پیش کرنے والے مصنف کو گم شدہ کے خانے میں ڈال کر یہ بھول جاتے ہیں کہ بہار کی ادبی تاریخ نویسی کا وہ سب سے معتبر حوالہ ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مظفر اقبال کی کتاب جو ایک طویل مدت سے نایاب ہے، اس کی اشاعتِ نو کا انتظام کیا جائے۔

(2012)

'حیاتِ اعلاحضرت'
فنِ سوانح نگاری کے آئینے میں

سوانح نگاری ظاہر میں مشکل کام نہیں ہے کیوں کہ کسی شخصیت کے بارے میں سلسلے وار طریقے سے حالات اور واقعات کو جمع کر دینا کیوں مشکل کام مانا جائے۔ آسانی کی ایک صورت اس معاملے میں اور پیدا ہو جاتی ہے جب سوانح نگار صاحب سوانح کے عہد کا ہوتا ہے اور اس کے تعلقات اور روابط بھی قائم رہتے ہیں۔ جسے آپ نے خود دیکھا اور سمجھا ہے یا جس کی شخصیت کے تار و پود سے سوانح نگار ایک قربت کے ساتھ آشنا ہے اور صاحب سوانح کی زندگی کے نشیب و فراز کے ہزاروں واقعات اس کی آنکھوں دیکھے ہیں، اس کے بارے میں کیوں لکھنا محال ہو؟

مولانا ظفر الدین بہاری کی کتاب "حیاتِ اعلاحضرت" کو سوانح نگاری کے مذکورہ زمرے میں رکھنے کے باوجود مختلف طرح کی آسانیوں کے مقابلے سوانح نگاری کی مشکلات کا بھی اندازہ کرنا چاہیے۔ اگر صاحب سوانح اور سوانح نگار کے بیچ براہِ راست ربط نہیں اور سوانح نگار نے مختلف ذرائع سے تحقیق کر کے حیات و خدمات کے سلسلے سے مواد جمع کر لیا ہے تو سوانح نگار کے لیے قطع و برید کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ کن واقعات کو شاملِ کتاب کرنا ہے اور کن واقعات کو سوانح میں جگہ نہیں دینی ہے، اس کا فیصلہ آسان ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب سوانح کی حیات کے ایک بڑے حصّے سے سوانح نگار بالمشافہ واقف ہے، اور مجلسی، غیر مجلسی، علمی اور نجی زندگی میں سوانح نگار ہزاروں موڑ پر صاحب سوانح کے ساتھ موجود ہے؛ ایسے میں سوانح نگار کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ کس طرح ہزاروں اور لاکھوں معلوم باتوں یا واقعات کو ترتیب و انتخاب کے مرحلے سے گزار کر آخری شکل عطا کرے۔ جس سے اس کی سوانح واقعات کی کھتونی نہیں معلوم ہو۔

اسی کے ساتھ سوانح نگار کے لیے ایک اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر صاحب سوانح سے تعلق کی

نوعیت عقیدت اور عقیدے سے ہے تو امتحان کی دوسری منزل سے گزرنا ہوگا۔ سوانح نگاری اگر ایک علمی کام ہے تو عقیدت کی رہنمائی میں واقعات اور حالات کی پیش کش میں یہ خدشہ شامل رہے گا کہ اہم اور غیر اہم کی تمیز جاتی رہے۔ نگاہِ عشق و مستی میں صاحب سوانح کا ہر ذرہ سوانح نگار کے لیے ستارہ معلوم ہوگا۔ صاحب سوانح کی کوئی بھی بات اس کے لیے چشمِ عقیدت میں غیر اہم کیوں کر ہوگی؟ اسی کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس سچائی سے کیسے انکار کیا جائے کہ سوانح بالعموم اُسی کی لکھی جاتی ہے جس کی عظمت اور بلندی اظہر من الشمس ہو۔ اسی لیے سوانح نگاروں پر بے جامدّاحی اور کبھی کبھی مدلل مدّاحی کے الزامات عائد ہوتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے کتبِ سوانح کو واقعات کی کھتونی کہہ کر بھی اعتراض کیا جاتا رہا ہے۔

مولانا ظفرالدین بہاری نے اعلاحضرت کی حیات اور خدمات کو قلم بند کرنا شروع کیا ہوگا تو واقعتاً مذکورہ مسائل ان کے پیشِ نظر ہوں گے۔ اردو کی حد تک غور کریں تو ان کے پیشِ نظر شبلی اور حالی کی سوانح عمریاں ضرور رہی ہوں گی۔ "حیاتِ جاوید" کے حوالہ جات اس سوانح میں موجود ہیں، اس لیے کم از کم اس بات کا یقین ہے کہ مولانا ظفرالدین بہاری نے "حیاتِ اعلاحضرت" لکھنے سے پہلے "حیاتِ جاوید" کے مشتملات پر غور کرلیا ہوگا۔ حالی، سرسید کو براہِ راست جانتے تھے اور ان کی زندگی اور کام سے ان کو عقیدت تھی۔ وہ سرسید کے شریکِ کار بھی تھے۔ مزید یہ کہ ان کا ذہن بھی تحقیقی تھا۔ اس کے علاوہ سرسید کے دوستوں اور دشمنوں دونوں کی سرسید کے سلسلے سے تحریروں سے وہ لفظ بہ لفظ واقف تھے۔

مولانا ظفرالدین بہاری کا معاملہ بھی یہی ہے کہ وہ اعلاحضرت سے بالمشافہ واقف ہیں۔ ان سے مولانا ظفرالدین بہاری کا رشتۂ تلمیذ بھی ہے جو برسوں تک قائم رہا اور بعد میں رفاقت میں تبدیل ہوا۔ اعلا حضرت سے انھیں صرف عقیدت نہیں بلکہ مولانا ظفرالدین بہاری تو یہ چاہتے ہیں کہ اعلاحضرت کے عقیدے کو تمام لوگ تسلیم کرلیں۔ مولانا ظفرالدین بہاری کو یہ فائدہ بھی حاصل ہے کہ وہ صرف اعلاحضرت کی زندگی اور کارناموں سے براہِ راست واقف نہیں بلکہ ان کے احباب، ہم عصر، شاگردان اور ہزاروں عقیدت مندوں کی تحریروں یا بیان کردہ واقعات سے بھی واقف ہیں۔ اسی لیے اعلاحضرت کا سوانح نگار کسے ہونا چاہیے، اس سوال پر غور کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا ظفرالدین بہاری نے یہ درست فیصلہ کیا کہ وہ یہ بڑی ذمے داری اپنے سر لیں۔ "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید"، حالی کو ہی لکھنی چاہیے تھی اور "حیاتِ شبلی" سیّد سلیمان ندوی

کے حصے میں ہی آنی چاہیے تھی۔ یہاں لازم وملزوم والی بات پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ اعلا حضرت کی حیات وخدمات کو سوانح نگاری کے اصولوں کے ساتھ برتنے کا مولانا ظفر الدین بہاری کا یہ مناسب ترین فیصلہ ہے اور اس کام کے لیے وہ سب سے زیادہ لائق افراد میں سے تھے۔

سوانح نگاری کو بعض افراد دو دھاری تلوار کہتے ہیں۔ ۹۹ رفی صد یہ سچائی ہے کہ صاحب سوانح سے جب تک عقیدت نہیں ہوگی، اس وقت تک یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص اس موضوع پر سو دو سو اور ہزار صفحات دل لگا کر قلم بند کرے گا۔ اس لیے یہ مان کر چلنا چاہیے کہ سوانح نگار چشمِ عقیدت کے ساتھ ہی صاحب سوانح کی زندگی اور کارناموں کو ملاحظہ کرے گا لیکن اسی کے ساتھ سوانح نگاری کا یہ اصول ہے کہ حالات اور واقعات کی پیش کش میں ایک معروضی نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ عقیدت میں سوانح نگار کو آنکھیں بند کر کے نہیں چلنا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جو واقعہ قلم بند کیا جائے، اس کے لیے دلیل اور حقائق بھی پیش کیے جائیں۔ واقعات کے اہم اور غیر اہم ہونے کی تمیز بھی سوانح نگار کے لیے بھاری پتھر ہے کیوں کہ پڑھنے والوں کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ آپ کے ہم خیال ہوں یا صاحب سوانح سے عقیدت رکھتے ہوں۔ ایک بڑا طبقہ اس لیے سوانح کا مطالعہ کرتا ہے کہ اسے معلوم ہو سکے کہ اپنے عہد کی بڑی شخصیات کی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں میں کون سی ایسی بات ہے جس پر روشنی نہیں پڑی ہے اور جسے جان کر اس کی معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ عظیم شخصیات کی زندگی کے طلسم کو بھی وہ سمجھنا چاہتے ہیں لیکن لازمی طور پر عقیدت کی رہنمائی کے بغیر۔

'حیاتِ اعلا حضرت' کے صفحات پر غور کرتے ہوئے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا ظفر الدین بہاری نے اس سوانح کو مستند، کارآمد اور علمی اعتبار سے گراں مایہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ واقعات اور خدمات کی پیش کش میں انھوں نے بات کو سمیٹنے میں زیادہ مہارت دکھائی اور پھیلانے سے اکثر مقامات پر گریز کیا جس کی وجہ سے اس سوانح کو کوئی واقعات کی کھتونی نہیں کہہ سکتا۔ معروضیت اور بیان میں احتیاط پسندی نے اس سوانح کو علمی اعتبار سے مزید محترم بنا دیا ہے۔ ''حیاتِ اعلا حضرت'' کی مختلف جلدوں کی طباعت کا معاملہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بعض تنازعات یا کوتاہیوں کے احوال اپنے بطن میں رکھتا ہے۔ ان مراحل کی تفصیل اور متنِ اوّل کے سلسلے سے گفتگو سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں ''حیاتِ اعلا حضرت'' کی الجامعۃ الرضویہ، پٹنہ کے اہتمام میں مفتی محمد مطیع الرحمان رضوی کی ترتیب دادہ تین جلدوں میں شائع شدہ متن پر ہی خود کو مرکوز رکھتا ہوں۔

تین جلدوں پر مشتمل اس کتاب کی جلد اوّل ہی اصل میں سوانح کے زمرے میں آتی ہے۔ جلد دوم اور سوم کا تعلق افادات اور انتخاب و تعارف سے ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں برِّصغیر کے مذہبی، علمی اور ادبی افق پر جن اصحاب کو ہم درخشندہ ستارے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں، ان میں اعلاحضرت کی اہمیت مسلّم ہے۔ وہ زمانہ مدارسِ اسلامیہ کے تعلیمی وزن و وقار کے عروج کا ہے۔ علّامہ شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، اعلاحضرت احمد رضا خاں، سید سلیمان ندوی وغیرہ کی مثالیں بہ یک نظر سامنے آتی ہیں جن کی علمی شخصیت کو اختلافِ مسلک و ملّت کے بغیر ہر کس و ناکس نے تسلیم کیا۔ مذکورہ چاروں اصحاب کی زندگی کا سفر عمومی ارتقا کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے۔ سب لوگ بیس برس کی عمر میں قومی منظر نامے پر اپنی شناخت قائم کر چکے تھے اور تیس برس تک پہنچتے پہنچتے استاذ الاساتذہ کی طرح سے زمانہ انھیں قبول کرنے لگا تھا۔ مولانا ظفر الدین بہاری نے اعلاحضرت کی حیات کو پیش کرنے میں سوانح نگاری کے عام اصولوں کو تو سامنے رکھا اور کوشش کی کہ واقعات سلسلے وار طریقے سے شاملِ کتاب ہو سکیں لیکن صاحبِ سوانح کی زندگی کے اس حیرت انگیز پہلو پر بھی نظر رکھی جہاں حصولِ علم کا عمومی سلسلہ قائم نہیں رہتا: یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

سوانح نگاری کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ صاحبِ سوانح کی زندگی کے انجانے پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کیے جائیں۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوانح پڑھتے ہوئے کسی نئے قاری کو بعض مخفی اور اہمیت کے اعتبار سے انوکھے واقعات معلوم ہو جاتے ہیں۔ اعلاحضرت کی حیات و خدمات پر مواد کی کمی نہیں۔ تحریر کے علاوہ عقیدت مندوں نے زبانی روایت کا ایک ٹھوس سلسلہ قائم کر رکھا ہے: جس کی وجہ سے اعلاحضرت پہلے ہی سے ہماری زندگی میں چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے باوجود مولانا محمد ظفر الدین بہاری کی اس کتاب میں اعلاحضرت کی زندگی کے کئی ایسے پہلوؤں پر نگاہ چلی جاتی ہے جو عام طور پر ذکر میں نہیں آتے۔ اس سوانح کے ۱۸، ۱۹ اور ۲۰ نمبر کے ابواب میں اعلاحضرت میں جس حسِ مزاح کو اجاگر کیا گیا ہے، وہ نہ عام بات تھی اور نہ ہی ان کی مذہبی اور علمی خدمات کے تناظر میں دوسرے لکھنے والے اس موضوع پر توجہ دے سکتے تھے۔ لیکن ظفر الدین بہاری نے ان پہلوؤں کو درجِ گزٹ کر کے اعلاحضرت کی شخصیت کے الگ اور انوکھے پہلو کی پیش کش میں کامیابی پائی ہے۔

اس سوانح میں اعلا حضرت کے علمی اور روحانی کمالات کے بیان کے مرحلے میں ارضی پہلوؤں پر بھی بھرپور توجہ دی گئی ہے۔ عام طور پر عقیدت مندوں کے ذریعہ لکھی گئی کتابوں میں ایسا توازن دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہ صحیح ہے کہ بڑی شخصیات میں حیرت انگیز صفات موجود ہیں گی اور سوانح نگار کو عقیدت ہو یا نہ ہو لیکن اس حقیقت کی پیش کش سے آزادی نہیں مل سکتی۔ لیکن اسی کے ساتھ سوانح نگار کا یہ فریضہ ہے کہ صاحب سوانح کے ان عام انسانی اور ارضی پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرائے جن کے بغیر صاحب سوانح ہی نہیں، کسی بھی انسان کی زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی عظیم شخصیات کی سوانح عمریوں کو ہم اس لیے بھی پڑھتے ہیں تا کہ یہ دیکھ سکیں کہ ہمارے بیچ کے لوگ عام حالات اور عمومی صورتِ حال کے باوجود کیسے کیسے عظیم کام کر چکے ہیں۔ اس کا افادی پہلو یہ بھی ہے کہ ہمیں ترغیب ملتی ہے کہ اپنی زندگی میں نئے خواب اور تمنائیں سجا سکیں۔ مولانا ظفر الدین بہاری نے اعلا حضرت کی سوانح لکھتے ہوئے ہر قدم پر اس بات کا خیال رکھا کہ اعلا حضرت کی زندگی ایک ڈھلی ڈھلائی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آئے بلکہ انھوں نے عمومی حالات میں ہی رہ کر اپنے وقت کا بہترین مصرف لیتے ہوئے وہ کارنامہ انجام دیا جو ہمارے لیے باعثِ ترغیب اور تقلید ہے۔

اس سوانح کا آخری باب ''اسفار'' کے عنوان سے شامل ہے، نہایت اختصار کے ساتھ سفر کے احوال بیان کرنے سے پہلے ماحول یا پیش بندی کی غرض سے ابتدا میں تین صفحات رقم کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد سلسلے وار طریقے سے اعلا حضرت کے درجنوں قریب اور دور کے اسفار کے خاص واقعات قلم بند ہوئے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' کے ہر دور میں شعرا کے حالات لکھنے سے قبل نہایت اختصار کے ساتھ پیش بندی کی غرض سے تمہیدیں لکھی ہیں۔ ان کی طوالت ایک صفحے سے ڈھائی صفحے کے درمیان ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سو صفحے میں جن شعرا کی تفصیلات رقم کی گئی ہیں، ان کی روح تمہید کے چند لفظوں میں اُتر آئی ہے۔ اسی طرح مولانا ظفر الدین نے اس باب میں ان تین صفحوں میں وہ تمام اصول پیش کر دیے ہیں جن کی تفصیل کے لیے آگے واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اس تمہید میں یہ بتایا گیا ہے کہ اعلا حضرت کو سفر سے کوفت ہوتی تھی اور اسی لیے شاید وہ کم سے کم اس کا قصد کرتے تھے۔ یہاں ایک اور بات سامنے آتی ہے کہ اعلا حضرت کی تحقیق یہ تھی کہ چلتی ہوئی ٹرین میں نماز درست نہیں۔ یہ بھی درج ہے کہ اعلا حضرت باجماعت نماز ادا کرنا نہایت ضروری خیال کرتے تھے۔ ایسی حالت میں اعلا حضرت کو جب بالعموم دینی ضرورتوں کے تحت طویل سفر کرنا پڑتا تو اس کے

مسائل کیا ہوں گے، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چلتی ہوئی ٹرین میں نماز درست نہیں اور نماز با جماعت پڑھنا ضروری ہے۔ اس کشمکش اور اس سے نجات کی ایک مختصر جھلک مولانا ظفرالدین کی زبانی ملاحظہ کریں:

''قبلِ روانگی جس گاڑی سے سفر کرنا ہوتا، اور جس سے واپسی کا قصد ہوتا، پانچوں نمازوں کا وقت جس اسٹیشن پر ہوتا، اور جس جس اسٹیشن تک رہتا، ان جگہوں پر نشانِ اوقات دے دیا جاتا، اور وقتوں کے نام لکھ دیے جاتے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ٹائم ٹیبل منگوا کر گاڑیوں کے رُکنے کے اوقات و مقامات معلوم کیے جاتے۔ پھر بہ قواعدِ علمِ ہیئت ان جگہوں کا طول و عرض معلوم کر کے اوقاتِ صلوٰۃ نکالے جاتے۔ جب اس طرح پورا اطمینان ہو جاتا کہ اس سفر میں سب نمازیں باجماعت وقت پر ادا ہو سکیں گی، تب قصدِ مصمم فرماتے، اور وعدہ کرتے اور اسی مقررہ نقشہ کے مطابق ایک دو اسٹیشن پہلے سے وضو وغیرہ کر کے سب تیار رہتے، اور جب وہ اسٹیشن آتا، جہاں نماز کا وقت لکھا ہے، جماعت کھڑی ہو جاتی۔''

مولانا نے لکھا ہے کہ اگر نماز کے وقت سے گاڑی کے ٹھہراو کا وقت متصادم ہوتا تو اعلا حضرت گاڑی چھوڑ دیتے اور اسٹیشن پر باجماعت نماز پڑھتے اور نماز کے بعد جو گاڑی ملتی، اس سے سفر پورا کرتے۔ نماز باجماعت دورانِ سفر ادا کرنے کا ایک واقعہ سوانح نگار نے اعلا حضرت کے آخری سفرِ حج کے موقعے سے لکھا ہے۔ اس زمانے میں بریلی شریف سے آگرہ میں گاڑی بدلنے اور آگے بمبئی کی طرف روانہ ہونے کے مرحلے میں نمازِ فجر کی ادائیگی میں دشواری ہو رہی تھی۔ اعلا حضرت نے اس زمانے میں دو سو پینتیس روپے تیرہ آنے میں ریل کے سکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ ریزرو (reserve) کرایا جو سیدھے بمبئی والی گاڑی میں جوڑ دیا جاتا تھا اور اس دوران فجر کی نماز کی باجماعت ادائیگی میں کوئی خلل نہیں پہنچتا تھا۔ مولانا ظفرالدین بہاری نے لکھا ہے:

''اس قدر کثیر رقم صَرف کر کے صرف نمازِ فجر باجماعت ادا کرنے کے لیے سکنڈ کلاس کا ایک ڈبہ بریلی شریف سے بمبئی reserve کر کے سفر اختیار فرمایا۔ جب آگرہ پہنچے اور حضور نے باجماعت نماز ادا فرمائی تو اسٹیشن ہی سے خط تحریر فرمایا کہ الحمد للہ نماز باجماعت ادا ہو گئی، میرے روپے وصول ہو گئے، آگے مفت میں جا رہا ہوں۔''

سوانح نگار کا ایک بڑا فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ صاحبِ سوانح کی زندگی کے اُن پہلوؤں کی طرف خاص طور سے اشارہ کرے جو اصولی اور اساسی اہمیت رکھتے ہوں۔ مولانا ظفر الدین بہاری نے تین صفحات میں اعلاحضرت کی شخصیت کے استحکام اور عمل کے معاملے میں حد درجہ سالمیت کو جس طرح بغیر کسی اعلان، دعوا یا تشریح کے پیش کیا ہے، وہ سوانح نگار کی حیثیت سے ان کا بہترین کارنامہ ہے۔

اعلاحضرت کی شخصیت اور ان کی زندگی کے واقعات بالعموم عوام وخواص میں معروف ہیں۔ اس وجہ سے سوانح نگار کے لیے یہ امتحان کی بات ہوتی کہ کیا وہ معلوم اور مشہور واقعات کے تھکا دینے والے سلسلے سے قارئین کو ہم آشنا کرائے یا صاحبِ سوانح کی شہرت اور عظمت کے باوجود انجانے لیکن نمایندہ پہلوؤں کو واشگاف کرتا چلے۔ سوانح نگار نے اس معاملے میں واقعتاً کامیابی پائی ہے۔ اعلاحضرت کی زندگی کے روشن تر گوشوں کو نہایت اختصار یا چند جملوں میں پیش کر دیا لیکن انوکھے، اَن ہونے اور نئے گوشوں کی طرف بہ صراحت توجہ کی ہے۔ اعلاحضرت کی قوتِ حافظہ کے بارے میں سینکڑوں سچے واقعات عام ہیں۔ ان کے فتاوے اس کا بھرپور ثبوت ہیں۔ سوانح نگار نے مولوی محمد حسین کا ایک بیان نقل کیا ہے۔ اس وقت اعلاحضرت کی طبیعت ناساز چل رہی تھی اور عمومی ملاقات کا سلسلہ بند تھا۔ ایک نشست میں مختلف موضوعات پر اور محض دو مذہبی امور کے سلسلے سے سوالوں کے جوابات جس طرح مختلف اصحاب کو املا کرائے گئے، اس کی تفصیل خود سوانح نگار کی زبانی ملاحظہ کریں:

> ''اعلاحضرت نے ایک گڈی خطوط کی مولانا امجد علی صاحب کو دے کر فرمایا: آج تیس خط آئے تھے، ایک میں نے کھول لیا ہے۔ یہ انتیس گن لیجیے۔ انھوں نے انتیس گن کر ایک لفافہ کھولا، جس میں کئی ورق پر جو سوالات تھے، وہ سب سنائے۔ حضرت نے پہلے سوال کے جواب میں ایک فقرہ فرما دیا۔ وہ لکھنے لگے، اور لکھ کر عرض کی: حضور! کہتے۔ وہ سلسلہ وار اُس کے آگے کا فقرہ فرما دیا کرتے۔ اور دوسرے صاحب نے حضور کہنے کے درمیان میں اپنا خط سنانا شروع کیا۔ جب یہ حضور! کہتے، وہ رُک جاتے۔ اور جب یہ فقرہ سن کر لکھنے لگتے، تو وہ اپنا خط سنانے لگتے۔ اسی طرح انھوں نے اپنا خط ختم کیا، اور ان کو بھی ان کے پہلے سوال کے متعلق جو فقرہ مناسب تھا، وہ ارشاد فرما دیا۔ اب دونوں صاحب اپنا اپنا فقرہ ختم کرنے کے

بعد حضور! کہتے اور جواب ملنے پر لکھنا شروع کرتے۔ اسی حالت میں ان دو حضور حضور سے جتنا وقت بچتا، اس میں تیسرے صاحب نے اپنا خط سنانا شروع کیا۔ اور اسی طرح ختم کر کے جواب لکھنا شروع کیا۔ اب چوتھے صاحب نے ان تین حضور حضور کے درمیان جو وقت بچتا، اپنا خط سنانا شروع کیا۔ اور اسی طرح ختم کر کے جواب لکھنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حقیقتاً پسینہ آ گیا۔ اور ایک صاحب جو میرے قریب بیٹھے تھے، اسی حالت میں کچھ مسئلے پوچھے، جنھیں سن کر مجھے بہت ملال اور غصہ ہوا کہ اس شخص کو ایسی حالت میں سوال کرنے کا کچھ خیال نہیں مگر اعلا حضرت نے ذرہ بھر بھی ملال نہ فرمایا، اور بہت اطمینان سے اُن کو بھی برابر جواب دیے۔''

محض ایک مثال سے سوانح نگار نے اعلا حضرت کی اُس حیرت انگیز قوتِ حافظہ کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ ایک ساتھ چار اور پانچ لوگوں کو الگ الگ سوالوں کے جواب املا کرانے کا سلسلہ ہے۔ کہیں ایک کی بات دوسرے میں ضم نہیں ہوتی اور تیسرے کے لیے مقرر جملہ چوتھے کے متن میں سما نہیں جاتا۔ صلاحیتِ خداداد اسے ہی کہتے ہیں۔ اختصار کے ساتھ سوانح نگار نے مختلف علوم و فنون میں اعلا حضرت کی مہارتِ علمی کا ذکر کیا ہے۔ ریاضی دانی، علمِ ہیئت، تاریخ گوئی اور فتویٰ نویسی کے باب میں جستہ جستہ واقعات پیش کر کے مولانا محمد ظفر الدین بہاری نے اعلا حضرت کی فقید المثال شخصیت کی ایک جھلک صاف صاف پیش کر دی ہے۔

اس سوانح کے تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں باب میں اعلا حضرت کی شخصیت کے ارضی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ قول اور فعل میں یکسانیت اور ہم واری کی درجنوں مثالیں اعلا حضرت کی زندگی کے واقعات پیش کرتے ہوئے سوانح نگار نے فراہم کی ہیں۔ شریعتِ اسلامی کی ہر حال میں اور صدفی صد پابندی اور ایک عام آدمی یا امتِ مسلمہ کے عام فرد کی طرح اعلا حضرت کی زندگی کے واقعات کا روشن ہونا اس سوانح کا سب سے کامیاب حصہ ہے۔ سوانح نگار نے نمونے کے طور پر جو واقعات پیش کیے ہیں، وہ صد درجہ نمایندہ ہیں۔ درجنوں واقعات خود اُن کی آنکھوں دیکھے بھی ہیں۔ لیکن ایک اچھے سوانح نگار کی طرح انھوں نے سینکڑوں دوسری شہادتوں اور راویوں کی تحریروں یا بیان کردہ اطلاعات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سے اس سوانح کی معروضیت اور حقیقت پسندی میں اضافہ ہوتا ہے۔

واقعات کے بیان میں مولانا بہاری نے اتنا بہتر انتخاب کیا ہے کہ سو اور ہزار باتوں میں سے صرف وہی لمحہ اپنے بیان کے لیے مخصوص کیا جس سے اعلا حضرت کی شخصیت کا ایک علاحدہ زاویہ اُبھر کر سامنے آتا۔ اخلاق اور مروّت کے سلسلے سے اعلا حضرت کے امتیازات روشن کرتے ہوئے سوانح نگار نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ اعلا حضرت کے نام کسی بد عقیدہ کی گالی سے بھرے خط پر جب ایک مرید خاص نے مقدمہ دائر کرنے اور سزا دلوانے کی تجویز پیش کی تو اعلا حضرت نے اس کا جواب اس طرح اپنے عمل سے فراہم کیا: ''اعلا حضرت نے فرمایا کہ تشریف رکھیے۔ اندر تشریف لے گئے اور دس پندرہ خطوط دستِ مبارک میں لیے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا کہ ان کو پڑھیے۔ ہم لوگ متحیر تھے کہ کس قسم کے خطوط ہیں؟ خیال ہوا کہ شاید اسی قسم کے گالی نامے ہوں گے جن کو پڑھوانے سے یہ مقصود ہوگا کہ اس قسم کے خط آج کوئی نئی بات نہیں، بلکہ زمانے سے آرہے ہیں۔ میں اس کا عادی ہوں لیکن خط پڑھتے جاتے تھے اور ان صاحب کا چہرہ خوشی سے دمکتا جاتا تھا۔ آخر جب سب خط پڑھ چکے، تو اعلا حضرت نے فرمایا:

> ''پہلے ان تعریف کرنے والوں بلکہ تعریف کا پُل باندھنے والوں کو انعام واکرام، جاگیر وعطیات سے مالا مال کر دیجیے، پھر گالی دینے والوں کو سزا دلوانے کی فکر کیجیے گا۔ انھوں نے اپنی مجبوری ومعذوری ظاہر کی اور کہا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ان سب کو اتنا انعام واکرام دیا جائے کہ نہ صرف ان کو بلکہ ان کے پُشت ہا پُشت کو کافی ہوگا۔ مگر میری وسعت سے باہر ہے۔ فرمایا: جب آپ مخلص کو نفع نہیں پہنچا سکتے تو مخالف کو نقصان بھی نہ پہنچائیے۔''

ایسے واقعات اس کتاب میں شامل کر کے سوانح نگار نے اسلامی کردار کا وہ مثالی نمونہ پیش کیا ہے جس کے لیے عام طور پر لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کا سلسلہ اس سوانح کی تیسری جلد کے چھٹے باب میں پھر قائم ہوتا ہے جہاں تقریباً سو صفحات میں اعلا حضرت کی حصۂ کرامتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر جگہ ثبوت کے لیے راوی ومشاہدین کے اسمائے گرامی بھی درج ہیں۔ مولانا بہاری نے ایک بھی جگہ رنگ آمیزی یا رقّت وعقیدت کے بجا مظاہرے سے بھی گریز کیا ہے۔ سوانح نگار کی حیثیت سے یہ اُن پر لازم تھا کہ کسی بھی واقعہ پر اصرار یا بلند بانگ دعوا نہیں پیش کیا جائے۔ سوانح نگار واقعہ پیش کر دیتا ہے، اسے قبول کرنے والے خود غور وفکر کر لیں۔

اس سوانح کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی سوانح نگار صاحب سوانح سے غافل

نہیں رہتا۔ معاصرین یا ہم عصر واقعات کی پیش کش میں سوانح نگار نے اعلا حضرت کی زندگی کی مرکزیت سے تھوڑے وقت کے لیے بھی گریز نہیں کیا جس کی وجہ سے سوانح نگار کی حیرت انگیز گرفت کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ اعلا حضرت کی زندگی کے مشہور اور ضروری گوشوں کو بھی توجہ کے ساتھ پیش کیا۔ ان کے علمی اور روحانی کمالات کے بارے میں جستہ جستہ جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان سے ان کی قدِ آدم شبیہہ واضح ہوتی ہے۔

مولانا محمد ظفر الدین بہاری کی سوانح نگاری کا ایک پہلو اور بھی لائق توجہ ہے۔ ہم ابتدا میں یہ بات ظاہر کر چکے ہیں کہ اعلا حضرت سے انھیں شرف تلمذ بھی حاصل تھا اور وہ ان کی بارگاہ میں طویل مدت تک حاضر رہے۔ اس کا سوانح نگار نے مختلف واقعات اور حالات کے ذکر میں مقدور بھر استعمال کیا ہے جس سے سوانح کا پایۂ استناد مزید مستحکم ہوتا ہے اور کتاب کے واقعات زندگی بہ داماں معلوم ہوتے ہیں۔ حالؔی کی سوانح عمریوں میں غالب اور سر سیّد اپنی حقیقی شکل میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ سوانح میں اعلا حضرت ایک زندہ جاوید شخصیت کے بہ طور سامنے آتے ہیں۔ حیات اور خدمات کے عمومی جائزے کے بعد مولانا ظفر الدین بہاری نے یہ لکھا کیا کہ اعلا حضرت کی تصنیفات سے اقتباسات کے لیے علاحدہ جلدیں تیار کردیں۔ جو کوئی سوانح کے علاوہ خدمات کے لیے گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہے گا، اس کے لیے یہ آسانی پیدا ہو جائے گی کہ حیاتِ اعلا حضرت کی دوسری اور تیسری جلد پر بہ نظر غائر توجہ کرے۔ اردو ادب کے ایک عام طالب علم کے طور پر اس سوانح کو ایک مکمل اور کارآمد کتاب کے طور پر دیکھتا ہوں۔ آئندہ اس کی ترتیب میں کمپیوٹر کے حروف کے پوائنٹ کم کر لیے جائیں تو یہ کتاب اتنی ضخیم نہیں معلوم ہوگی اور اس کا ہدیہ بھی کم رکھا جا سکے گا جس سے کتاب عوام میں بھی آسانی سے پھیل سکے گی۔ مولانا ظفر الدین بہاری کی زبان حالؔی کی طرح تو نہیں ہے لیکن سادگی اور صراحت کے جوہروں سے مالا مال ہے۔ دقیق مسائل بھی سادگی اور صفائی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جو سوانح نگاری کی مہارت کی دلیل ہے۔

ملک العلما حضرت مولانا محمد ظفر الدین بہاری کی سوانح ''حیات اعلا حضرت'' کے تین دفتر مل کر ایک بھرپور علمی ذائقہ عطا کراتے ہیں۔ بہ ظاہر تین جلد اور ہزاروں صفحات کی یہ کتاب معلوم ہوتی ہے لیکن بین السطور میں نہ جانے کتنے جہانِ معنی روشن ہیں۔ استاد اور صاحب سوانح کے عالمانہ وقار اور مذہبی حیثیت کے ساتھ ساتھ لائق شاگرد اور بے مثل عالم کی شخصیت کے نقوش بھی رہ رہ کر ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ استاد سے قربت اور تعلق کا اشتہار چسپاں نہیں کیا بلکہ اس کا صرف اس لیے ذکر ہوا کیوں کہ صداقت اور شہادت

کے لیے تنہا خود کو پیش کرنے کی ضرورت آن پڑی تھی۔ بعض کمزور لکھنے والے دوسروں کے ذکر کے بہانے چپکے سے اپنے واقعات پیش کر کے اپنی شخصیت اُبھارنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا بہاری نے حالی اور شبلی کی عظیم کتابوں سے سوانح نگاری کے اصول اخذ کیے اور ہر موڑ پر اس بات کا دھیان رکھا کہ وہ اعلا حضرت جیسی عظیم شخصیت کی سوانح لکھ رہے ہیں۔ انھیں اپنا ذکر صرف آنکھوں دیکھے واقعات کے ذیل میں سمیٹ کر رکھنا ہے۔ مولانا بہاری نے اپنا ذکر اتنے انکسار کے ساتھ اس کتاب میں کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور استاد کی بہترین تربیت کا اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین ہو جاتا ہے۔ اس سوانح کی حیثیت اس اعتبار سے قاموسی ہے کیوں کہ یہاں اعلا حضرت کی حیات و خدمات کا شاید ہی کوئی اہم گوشہ ہو جس کی کوئی جھلک نہیں پیش کی گئی ہو۔ زیادہ معلومات اور بھرپور معلومات کی فراہمی کے مقابل ترتیب سوانح کے مرحلے میں یہ احتیاط مولانا بہاری کو ایک بہترین سوانح نگار کے طور پر مستند قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ براہِ راست اردو ادب سے اس سوانح کا اتنا مختصر رشتہ ہونے کے باوجود ایک صاف ستھری، ترسیلی اور غیر پیچ دار زبان کی ہم واری کے ساتھ یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔ کہیں بھی بات کہنے میں سوانح نگار کو کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور جب ہم سوانح کے انجام تک پہنچتے ہیں، تب تک صاحبِ سوانح کی شخصیت ہمارے دلوں میں اُتر چکی ہوتی ہے۔

(2009)

وہاب اشرفی بہ نام کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد ایسے نقاد ہیں جن کی اکثر و بیش تر تحریروں پر اردو کے علمی حلقے میں غور و فکر سے کام لیا گیا۔ اُن کی کتابوں کی ایک ایک سطر پر نقادوں نے بحث کی اور اُن کی تحریروں کے نتائج کے سلسلے سے اردو کے بڑے حلقے میں ہیجان کا ماحول قائم ہوا۔ اردو تنقید میں اُن کے مقام کے تعلق سے اچھے خاصے اختلافات بھی ہوئے، اس کے باوجود اُن کی قدر و قیمت سب نے تسلیم کی۔ ان کی کتابیں خوب خوب پڑھی گئیں اور آج بھی ہر صاحب علم کے مطالعے کا وہ حصہ ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ کئی لکھنے والوں نے کلیم الدین احمد کی مخالفت کو اپنا شیوۂ علمی بنالیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ مزید دراز ہوا۔ عبدالمغنی نے کلیم الدین احمد کے کارناموں کے خلاف کتاب تیار کی۔ سید محمد محسن نے متعدد مضامین ان کی قدح میں لکھے اور رسالہ 'سہیل' گیا نے اُن کے خلاف پورا ایک شمارہ شائع کردیا۔ وہاب اشرفی نے ہر چند اپنے ابتدائی زمانے کی کتاب 'قدیم ادبی تنقید' پر کلیم الدین احمد کی تقریظ اہتمام کے ساتھ شائع کی تھی اور 'معنیٰ کی تلاش' کتاب کا انتساب انھی کے نام کیا تھا لیکن وہ بھی اُن کی نکتہ چینی سے غافل نہیں رہے۔ بالخصوص کلیم الدین احمد کی وفات کے بعد اردو تنقید کی تاریخ پر مضمون ہو یا اقبال کے سلسلے سے کلیم الدین احمد کے خیالات کا جائزہ مقصود ہو یا تاریخ ادب اردو میں ان کے مجموعی احتساب کی بات ہو؛ ہر جگہ کلیم الدین احمد کے امتیازات کی شناخت سے وہاب اشرفی نے مقدور بھر چشم پوشی کی۔

ساہتیہ اکادمی نے اردو کے مقتدر ادبا اور شعرا پر ایک طویل عرصے سے تعارفی کتابچے (Monographs) کا مختلف زبانوں میں نہایت کارآمد سلسلہ چلا رکھا ہے۔ ایسے مونوگراف اُس شخصیت کے کارناموں کا تعارف کرانے کے مقصد سے شائع کرائے جاتے ہیں۔ اسی لیے اُن کتابوں میں معترضانہ احتساب کی صورت کبھی سامنے نہیں آئی۔ اردو یا دوسری زبانوں میں بھی ساہتیہ اکادمی کا کوئی ایسا مونوگراف ہماری نگاہ سے

نہیں گزرا جس میں لکھنے والے نے تعارف سے لے کر اختتامیہ تک اُس شخصیت پر تیر ہی تیر برسائے ہوں۔ کلیم الدین احمد کے سلسلے سے وہاب اشرفی کے تحفظات یوں بھی لوگوں کو معلوم تھے۔اس کے باوجود نہ معلوم کن اسباب سے کلیم الدین احمد کے کارناموں کا تعارف پیش کرنے کے لیے وہاب اشرفی ہی منتخب ہوئے۔یوں بھی یہ کام آج سے پچیس برس پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔لیکن نہ جانے کس عصبیت کی بنا پر کلیم الدین احمد کی وفات کی تین دہائیاں مکمل ہونے کا انتظار کیا گیا اور احتساب کی ذمّے داری اُس شخصیت کو عطا ہوئی جس کے اعتراضات یا تحفظات اظہر من الشمس ہوں۔اس سے پہلے وہاب اشرفی قاضی عبدالودود کے سلسلے سے حد درجہ عامیانہ مونوگراف ساہتیہ اکادمی کے لیے لکھ کر اپنے موضوع سے بے اعتنائی برتنے کی مثال قائم کر چکے تھے لیکن اسی کام کا صلہ انھیں پھر سے کلیم الدین احمد کے کارناموں کا جائزہ لینے کے انعام کے طور پر دیا گیا۔ پتا نہیں، یہ کیسی عصبیت ہے کہ ساہتیہ اکادمی نے وہاب اشرفی کی عزت افزائی میں ان دو بڑے اہلِ قلم کو یوں ضائع کر دیا۔

وہاب اشرفی برق رفتاری سے کتابیں تیار کرتے ہیں۔جتنے وقفے میں دوسرے لکھنے والے کسی ایک مضمون کا خاکہ مکمل کرتے ہیں، اتنے وقفے میں وہاب اشرفی کی کتاب چھپ کر بازار میں چلی آتی ہے۔پچھلے بیس برس میں وہاب اشرفی کی کتابیں سج دھج کر اہتمام سے چھپیں حالاں کہ اس سے پچیس تیس برس پہلے ان کی کتابیں نہایت بد سلیقگی سے بُرے کاغذوں یہاں تک کہ نیوز پرنٹ پر چھپتی رہیں۔۱۹۹۴ء میں رانچی سے پٹنہ آمد اور یونی ورسٹی سروس کمیشن، بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاؤنسل وغیرہ اداروں کی سربراہی حاصل ہونے کے بعد وہاب اشرفی کی کتابیں حُسنِ صورت کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔پُرانی کتابوں کی اشاعتِ نو ہوئی۔زیادہ تعداد میں اسی دوران نئی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ ان کی شخصیت اور کارناموں پر بھی آدھا درجن کتابیں اسی دوران میں شائع ہوئیں۔کہنا چاہیے کہ پچھلے سترہ اٹھارہ برسوں میں وہاب اشرفی کا ستارہ بلند تر رہا اور ادبی اور دنیوی دونوں اعتبار سے وہ کامران تسلیم کیے گئے۔اُن کی کتابیں بڑے پبلشروں یا بڑے تعلیمی اداروں سے چھپ کر آنے لگیں جس کی وجہ سے اُن کی مُلک گیر شہرت میں اضافہ ہوا۔انھیں بڑے علمی اداروں کی مدد سے لوگوں تک پہنچنے کے مواقع ملے۔

پختہ عمری، شہرت و قبولیت میں عروج اور چھوٹی بڑی نصف صد کے قریب جلدوں کی اشاعت سے وہاب اشرفی کے یہاں زبردست علمی اعتماد قائم ہوا ہے۔علمی معاملوں میں مصنّف کا اپنی صلاحیت اور کارناموں کے غیر معمولی ہونے کا عرفان اکثر خطرناک ہوتا ہے۔ہمارے اسلاف میں بڑے کارنامے انجام دینے والے

لوگ اپنی خدمات کو ''تختیاں لکھنا'' قرار دیتے تھے؛ بڑی اور ضخیم کتابوں پر انکسار کے طور پر اپنا نام موئف کی حیثیت سے درج کرتے تھے۔ وہاب اشرفی نے ایک محفل میں کبھی یہ کہا تھا کہ ان کی کتابوں کا وزن اُن کے جسم کے وزن سے زیادہ ہو گیا ہے۔ جس پر اسرار جامعی نے شعر میں یہ پھبتی کسی تھی کہ وہاب اشرفی اپنی کتابوں سے ہلکے ہو گئے۔ اپنی تصنیف وتالیف کی حُسنِ صورت، موضوعات کی رنگارنگی، وسعت اور ترتیب واہتمام کے ساتھ اشاعت سے وہاب اشرفی کے یہاں نرگسیت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کیوں کہ وہ اب اپنی دوسری تحریروں کی نقل اور بار بار اپنے ہی اقتباسات کی پیش کش سے ایک ایسی علمی صورت پیدا کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ تمام علوم اور موضوعات پر وہ پہلے ہی کام کی باتیں کہہ چکے ہیں۔

ایک نقاد کے طور پر وہاب اشرفی کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی حمد و دیا تمام کتابوں کے انتسابات پر غور کرنا دلچسپ اُمر ہے۔ انھوں نے اپنی ہر کتاب میں یہ سلسلہ قائم کیا کہ اپنے زمانے کے بااثر لکھنے والوں بالخصوص نقادوں کو ترتیب سے کتابوں کا تحفہ پیش کیا جائے۔ اس میں مقامی اور قومی، تدریسی اور غیر تدریسی، علمی اور غیر علمی ہر طرح کی مصلحتوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملے۔ بعض کتابوں کی نئی اشاعتوں میں حسب ضرورت کسی نئی شخصیت کے نام کتاب منسوب کر دی گئی۔ پختہ عمری میں وہاب اشرفی کے ہاں ایک اور ادبی بدعت یہ آئی کہ وہ کتابوں سے کتابیں بنانے (Book Making) میں اپنی مہارت کا استعمال کرنے لگے۔ ان کی ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ کتاب 'تاریخ ادبِ اردو' (تین جلدیں) ملاحظہ کیجیے جہاں مختلف افراد کی کتابوں کے تراشوں کو ہو بہ ہو کہیں ان کے اقتباس کے طور پر اور کہیں بغیر حوالے کے اپنی کتاب کا حصّہ بنانے میں انھیں کوئی دریغ نہیں۔ کوثر مظہری کی کتاب 'جواز وانتخاب' کو سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ کس طرح اس میں شامل شعرا کے حالات اور کارناموں کو وہیں سے نقل کر کے اپنی کتاب کا جائزہ مکمل کر لیا گیا ہے۔ ایسی کم از کم ایک سو کتابوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جن کے صفحات در صفحات وہاب اشرفی نے ہضم کر لیے ہیں۔ 'مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب' کا جائزہ لیجیے تو خلیل الرحمان اعظمی اور سجاد ظہیر کی کتابوں سے سینکڑوں صفحات کہیں بتا کر اور کہیں بتائے بغیر ذاتی تصنیف کا حصّہ بن گئے ہیں۔ اس کتاب میں زیادہ سے زیادہ ایسے پچاس صفحات ہیں جنھیں وہاب اشرفی نے اپنے دماغ اور قلم سے لکھا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی پر لکھی گئی کتاب میں اچھا خاصا حصّہ ظ۔ انصاری کی کتاب سے نقل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح مجروح سلطان پوری پر ساہتیہ اکادمی کے لیے لکھے ہوئے وہاب اشرفی کے مونوگراف میں راشد انور

راشد کے مضامین سے ایک بڑا حصّہ براہِ راست اخذ کر لیا گیا ہے۔

اخذ و استفادہ کے نام پر سرقہ کی ابتدائی شکل وہاب اشرفی کے یہاں ان کی کتاب 'تفہیم البلاغت' میں بہت پہلے سے موجود ہے جہاں 'درسِ بلاغت' اور چند دوسری کتابوں سے مفید مطلب صفحات لے لیے گئے ہیں۔ لیکن اپنی اس خصوصیت کا انھوں نے منظم اور ادارہ جاتی طریقے سے 'تاریخِ ادبیاتِ عالم' میں استعمال کرنا سیکھا۔ وہاں اور وسیع دنیا تھی اور صرف اردو کی کتابوں پر انحصار کی مجبوری نہیں تھی۔ یہاں ترجمہ، تاثر، نقل اور نقل در نقل کے ملے جلے رنگوں سے سات جلدیں تیار ہوئیں۔ ابھی تک کسی نے مستعدی اور اہتمام کے ساتھ اس کتاب کے مآخذات تک پہنچنے کی مشقت نہیں اٹھائی کہ ان سات جلدوں میں کہاں کہاں سے اور کس طرح کا مال جمع کر دیا گیا ہے۔ دو جلدوں کے علاوہ وہاب اشرفی کی پانچ جلدیں 'کتابیات' سے خالی ہیں۔ اب کئی کتابوں سے ایک الگ کتاب بنانے کا عمل وہاب اشرفی نے 'مغربی و مشرقی شعریات' کتاب میں آزمایا ہے، جو خدا بخش لائبریری کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے پیشِ لفظ میں ڈائرکٹر کا کہنا ہے کہ کتاب خدا بخش لائبریری کے پروجکٹ کے تحت تیار ہوئی۔ خود وہاب اشرفی بھی اپنی 'گزارش' میں یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ یہ خدا بخش لائبریری کے ایک پروجکٹ کا حصّہ ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ وہاب اشرفی نے 'تاریخِ ادبیاتِ عالم' کی جو جلدیں تیار کیں، وہیں سے الگ الگ زبانوں کی تاریخ سے دس بیس صفحات اخذ کر کے ۴۷۸ صفحے کی یہ کتاب مکمل کر دی۔ یہ یاد رہنا چاہیے کہ 'تاریخِ ادبیاتِ عالم' کی پہلی جلد ۱۹۹۱ء میں شائع ہو کر علمی حلقے سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی تھی۔ تانیثی شعریات اور تقابلی شعریات کے تعلق سے ابواب جو محض چند صفحات پر مشتمل ہیں، 'تاریخِ ادبیاتِ عالم' سے الگ ہیں۔ اسی طرح اردو شعریات سے متعلق باب بھی الگ سے لکھا گیا ہے۔ باقی نوّے فی صدی سے زیادہ اپنے لکھے پُرانے مال کو نئی جلد میں پیش کر کے حکومتِ ہند سے خطیر مالی فائدہ حاصل کیا گیا ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ 'تاریخِ ادبیاتِ عالم' کی جلدوں پر حکومتِ ہند، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن یا بہار اردو اکادمی کی طرف سے جزوی یا کلّی مالی تعاون اور انعامات مصنف کو اس کام کے لیے الگ الگ وقتوں میں حاصل ہوتے رہے۔

ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل ساہتیہ اکادمی کی طرف سے شائع کی گئی وہاب اشرفی کی یہ کتاب (کلیم الدین احمد پر مونوگراف) ان کی مذکورہ تمام ادبی بدعتوں کا ثبوتِ تازہ ہے۔ ایک بکھراو کا عالم ہے جو شروع سے لے کر آخر تک موجود ہے۔ اپنی پُرانی کتابوں سے یہاں بھی کاٹ چھانٹ اور جوڑ جاڑ کا سلسلہ دراز ہے۔

یہ کتاب بھی عجلت میں بنائی گئی ہے کیوں کہ بہت ساری باتیں تشنہ ہیں۔ کسی کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے اصل نتیجہ کسی دوسرے ناقد کا قول بتا کر پیش کر دیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایسی کتابوں کے بارے میں وہاب اشرفی کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد کی بعض کتابوں کے بارے میں یوں سرسری گزر گئے ہیں جیسے وہ اُن کتابوں کو یا تو بالکل غیر اہم مانتے ہیں یا پھر ان پر رائے دینے کی انھیں ضرورت سمجھ میں نہیں آتی یا انھوں نے ان کتابوں کو غور سے دیکھا ہی نہیں۔ کن کتابوں پر تفصیل سے لکھا جاتا ہے اور کن پر اختصار درکار ہے: اس سلسلے سے بھی مصنف افراط و تفریط کا شکار ہے۔ ''اردو زبان اور فنِ داستان گوئی'' کے لیے محض ڈیڑھ صفحے کی گنجایش پیدا ہو سکی۔ ''اردو تنقید پر ایک نظر'' کا جائزہ معدودصفحات کے حوالہ جات کے ساتھ ساڑھے آٹھ صفحے میں سمٹ گیا ہے۔ لیکن ''اقبال: ایک مطالعہ'' کا جائزہ انیس صفحات پر مشتمل ہے کیوں کہ یہاں وہاب اشرفی نے اپنے ایک پرانے مضمون کے پندرہ صفحات ہُو بہُو شامل کر دیے ہیں۔ یہ مضمون 'اقبال: ایک مطالعہ' کے صرف ایک مقالے کو بنیاد بنا کر لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کے لکھنے میں وہاب اشرفی نے کیسی مشقت اُٹھائی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہیے کہ کُل انیس صفحات میں وہاب اشرفی نے صرف تازہ پچیس سطریں اپنی طرف سے لکھی ہیں۔ باقی یا تو ان کا پچھلا مضمون ہے یا کلیم الدین احمد یا دوسروں کے اقتباسات۔ تنقید کا یہ انداز ''ادبی تنقید کے اصول'' کتاب کے سلسلے سے گفتگو کے دوران مزید ترقی پاتا ہے۔ گیارہ صفحات کے اس جائزے میں کلیم الدین احمد کے چھوٹے بڑے تیس اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ظفر اوگانوی کا بھی ایک اقتباس شامل ہے۔ کلیم الدین احمد کی لکھی سطریں ۱۳۲ رہیں جب کہ وہاب اشرفی کے قلم سے تحریر شدہ سطروں کی کُل تعداد ۸۹ رہے۔ وہاب اشرفی نے کلیم الدین احمد کی تحریروں سے جو اقتباسات منتخب کیے ہیں، اُن اقتباسات کا جائزہ لینے میں کیسی گہری تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہوگا، اس کا اندازہ اُن کے چند جملوں سے کر لینا مناسب ہوگا:

(۱) بالکل درست ہے۔

(۲) کلیم الدین احمد کی یہ رائے بھی درست ہے، اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں۔

(۳) اس اقتباس میں جو بات کہی گئی ہے، وہ درست ہے۔

(۴) ظاہر ہے کہ پورا اقتباس قیمتی ہے۔

(۵) یہ بالکل صحیح اور کھری بات ہے۔

(۶) اس خیال میں بھی وزن ہے۔

(۷) یہ باتیں اہم ہیں۔

(۸) اس اقتباس کے خیالات سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔

(۹) یہ خیال بھی سوفی صد درست ہے۔

ایسی سرسری رایوں کے بعد وہاب اشرفی کے پاس نتیجے کے طور پر کچھ کہنے کی اگر کوئی بات تھی تو اس کے لیے بھی انھوں نے ظفر اوگانوی کے مضمون سے ایک اقتباس اخذ کرلیا اور ان کا باب مطالعہ تمام ہوگیا۔ ''سخن ہائے گفتنی'' اور ''عملی تنقید'' پر وہاب اشرفی نے ایک ساتھ گفتگو کی ہے۔ چار صفحات میں وہاب اشرفی نے صرف ساڑھے سات سطریں اپنی طرف سے لکھی ہیں۔ باقی تمام کلیم الدین احمد کے اقتباسات درج کردیے گئے ہیں۔ آخر میں سید محمد محسن کے بھی دو اقتباسات کلیم الدین احمد کی خامیوں کی نشان دہی کرنے کے لیے وقف ہیں۔ ''تحلیل نفسی اور ادبی تنقید'' اور ''کلیم الدین احمد کی شاعری'' کے سلسلے سے بھی مطالعے کا یہی مانوس سرسری انداز قائم ہے۔

اس کتاب میں وہاب اشرفی نے صرف انھی مقامات پر جی لگا کر لکھا ہے جہاں انھیں کلیم الدین احمد کی شخصیت یا کارنامے کے تعلق سے کوئی معترضانہ گفتگو کرنی ہے۔ وہاب اشرفی نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کلیم الدین احمد کے خلاف لکھے گئے مضامین یا مشاہدات درج کیے ہیں۔ عبدالمغنی اور سیّد محمد محسن کے اقتباسات کئی جگہ چپکتے ہوئے ملتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے ساتھ ان کی حمایت میں لکھنے والوں کی بھی جہاں گنجائش ہوئی، خبر لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کئی ایسی باتیں بھی کتاب میں پیش کی گئی ہیں جن کے لیے نہ کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی دلیل پیدا کی جاسکی ہے۔ چند اقتباسات سے وہاب اشرفی کے ذہن میں موجود اُس کدورت کو پہچانا جاسکتا ہے جو کلیم الدین احمد کے سلسلے سے انھوں نے رَوا رکھی:

■ ''صاف معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ڈاکٹر ممتاز احمد کی کتاب خود کلیم الدین احمد کی لکھی یا لکھوائی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سبھوں کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر ممتاز احمد کا انگریزی یا مغربی ادبیات سے کوئی ربط نہ تھا۔ نہ اُن کے پاس تمام مغربی شاعروں کی تفہیم کی کوئی سبیل تھی کہ وہ یہ تحقیقی امر سامنے لاسکتے کہ کون سا شعر کس شاعر کی جھولی سے نکالے گئے ہیں (نکالا گیا ہے)؟ اردو شعرا یا فارسی شعرا کے

حوالے تک بات ہوتی تو سب کچھ ممتاز صاحب کے نتیجۂ فکر کو واضح کرتی لیکن یہاں تو معاملہ ہی الگ ہے۔'' (کلیم الدین احمد۔ ص: ۹۹۔۹۸)

■ ''ہاں بالکل سچ بات ہے۔ لیکن خود کلیم الدین احمد کئی جگہ تعصب کے (کا) شکار ہوئے ہیں، ورنہ وہ شاد عظیم آبادی کو آردو شاعری پر ایک نظر' سے باہر نہ کرتے جب کہ اُن کی نگاہ میں میر، غالب اور شاد اردو غزل کی تثلیث ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال اُس وقت آیا جب انھیں بہار اردو اکادمی کے ایک منصوبے کے تحت اُن کا مجموعۂ کلام (کلیات؟) ترتیب دینا تھا اور یہ مالی منفعت کی بات تھی۔'' (کلیم الدین احمد، ص: ۷۷)

■ ''آلِ احمد سرور کے باب میں اُن کے رویّے میں لچک آتی رہی ہے۔ اس کی کچھ اور بنیادیں تھیں۔ خود آلِ احمد سرور نے دراصل کلیم الدین احمد سے مصافحہ کی شکل اپنائی تھی جس کا اثر ہوتا تھا۔ 'میری تنقید: ایک بازدید' میں جس طرح انھوں نے ان کے خیالات تفصیل سے قلم بند کیے ہیں، وہ ایسے ہی مصافحے کا نتیجہ ہیں۔ محمد حسن اور شمس الرحمٰن فاروقی بعد کے ایڈیشن میں جگہ پا سکے ہیں۔ ان کے ضمن میں جو رویّہ موصوف نے اختیار کیا ہے، وہ جارحانہ نہیں ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان دونوں کی تنقید کی پوری کارکردگی سامنے آجائے۔ اس لیے دونوں کے باب میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ رویّہ جان بوجھ کر اپنایا گیا ہے۔'' (کلیم الدین احمد۔ ص: ۴۷)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ کتاب کلیم الدین احمد کے ادبی احتساب کے لیے وقف ہونے کے بجائے کچھ دوسرے امور کے اِردگرد زیادہ گھومتی ہے۔ ممتاز احمد کی کتاب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کلیم الدین احمد کی ''لکھی یا لکھوائی'' ہوئی ہے، اس کی دلیل کون پیش کرے گا؟ کلیم الدین احمد (وفات۔ ۱۹۸۳ء) اور ممتاز احمد (وفات۔ ۱۹۹۸ء) دونوں کے گزرنے کے بعد وہاب اشرفی ۲۰۱۲ء میں ایسے سوالات قائم کررہے ہیں؟ کیا یہ دور کی کوڑی انھیں ان حضرات کی زندگی میں نہیں سوجھی؟ خود وہاب اشرفی کے سلسلے سے کئی ضخیم کتابیں ادبی طور پر غیر معروف لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں وہاب اشرفی کی خدمات کے بارے میں نہایت سنجیدہ اور توصیفی رویّہ اختیار کیا گیا ہے۔ ان کتابوں سے الگ اِن مصنّفین کا کوئی بڑا کارنامہ

ہمیں معلوم نہیں۔ تو کیا یہ الزام عاید کر دیا جائے کہ وہ کتابیں وہاب اشرفی کی ''لکھی یا لکھوائی'' ہوئی ہیں؟ وہاب اشرفی کی اس تنقید میں کچھ معاصرانہ رشک و رقابت بھی ہے۔ پٹنہ یونی ورسٹی میں پروفیسر شپ کے لیے وہاب اشرفی ممتاز احمد کے مقابلے ناکام قرار دیے گئے تھے جس کے نتیجے میں انھیں رانچی سے عظیم آباد آنے کا موقع نہ مل سکا۔ شاید کدورت کی بنیاد یہ بھی ہو۔

شاد عظیم آبادی کو اردو غزل کی حیثیت میں حصہ قرار دینے کو مالی منفعت کا کام ماننا اور یہ ثابت کرنا کہ صرف اسی وجہ سے یہ بات لکھی گئی تھی، یہ ادبی طور پر دیدہ دلیری کی انتہا ہے۔ وہاب اشرفی نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جسے وہ اب چھپائے پھرتے ہیں؛ اس کا نام یوں ہے: "Lalu Yadav : Apostle of Social Justice"۔ یہ کتاب آخر کس مقصد سے لکھی گئی تھی؟ وہاب اشرفی نہ کوئی سیاسی و سماجی مفکر ہیں، نہ ہی ایسے موضوعات پر ماضی میں اُن کی کوئی مکمل تحریر دیکھنے کو ملی۔ یہ بھی سچائی ہے کہ اس کتاب کے بعد ہی انھیں یونی ورسٹی سروس کمیشن اور بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کاؤنسل کی صدارت کے مناصب عالیہ تفویض ہوئے۔ اس کے بعد کی کہانی ان کی خودنوشت 'قصہ بے سمت زندگی کا' میں تذکرۂ گرفتاری تک پہنچتی ہے۔ ایسی حالت میں کلیم الدین احمد پر مالی منفعت کا حصول اور اس کی چھاؤں میں پسندیدہ ادبی فیصلے کرنے کا الزام عاید کرنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ خود وہاب اشرفی کے یہاں ایک مکمل گوشوارہ تیار کیا جاسکتا ہے کہ اپنی کس کس کتاب سے، کون کون سے پروجکٹ اور کس مکمل یا نامکمل کام کے سلسلے سے ملک کے کتنے تعلیمی اور غیر تعلیمی اداروں سے کتنی بڑی رقم پچھلی نصف صدی میں حاصل کرنے میں وہ کامیاب رہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان تفصیلات میں کئی بار ایسے پڑاؤ بھی آئیں گے جب ایک ہی منصوبے کے لیے دو یا دو سے زائد جگہوں سے مالی منفعت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

کلیم الدین احمد پر یہ الزام عاید کرنا کہ آل احمد سرور سے انھوں نے بعد میں مصالحت کر لی اور ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں ان پر سے بہت سارے ادبی الزامات گھٹا دیے گئے۔ یہ بات بھی اس لیے ظالمانہ ہے کہ وہاب اشرفی نے دونوں کی زندگی میں ایسا کوئی انکشاف یا تنقیدی نتیجہ ظاہر نہیں کیا۔ ان کے جملوں سے ایسا لگتا ہے کہ کوئی Underhand deal ہوئی تھی۔ محمد حسن اور شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں 'اردو تنقید پر ایک نظر' کی آخری اشاعت میں ابواب کی شمولیت پر وہاب اشرفی شاید معاصرانہ رقابت میں تکذیب کرتے ہیں۔ وہاب

اشرفی کو بھی یہ معلوم ہے کہ کلیم الدین احمد اُن کی طرح مروت پسند نقاد نہیں تھے۔ ایسے میں جدید نقادوں کی فہرست میں اگر فاروقی کے بعد کوئی دوسرا شامل نہیں ہوسکا، تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ ۱۹۸۳ء میں جب وہ 'اردو تنقید پر ایک نظر' کے مسودے کو نئے سرے سے لکھ رہے تھے، اس وقت تک وہاب اشرفی، شمیم حنفی، گوپی چند نارنگ کی تحریروں کے مقابلے شمس الرحمن فاروقی کی بعض تنقیدی تحریریں اس معیار کی سامنے آچکی تھیں جن کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود کلیم الدین احمد نے ان لفظوں میں شمس الرحمن فاروقی کا تذکرہ کیا تھا:

"اب رہیں شمس الرحمن صاحب کی تنقیدیں تو میں ان پر کچھ لکھنے سے پرہیز کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ ۴۶ سال اور وہ ابھی بہت کچھ لکھیں گے اور جو کچھ لکھا ہے، اس سے بہتر ہی لکھیں گے۔" (اردو تنقید پر ایک نظر، ص: ۴۴۳)

ایسی صورت میں وہاب اشرفی کے ذریعہ یہ باور کرانا کہ کلیم الدین احمد نے شمس الرحمن فاروقی کو شامل کرکے کچھ مصالحت یا بے انصافی کی ہے، عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ وہاب اشرفی کی "تاریخِ ادب اردو" یا اُن کی لامختتم تقریظات پر کوئی ایسے سوال قائم کرے تو ہمیں معلوم ہے کہ اس کا کوئی جواب ادبی طور پر درست نہیں ہو سکتا۔ اب جب کہ تیس برسوں میں شمس الرحمن فاروقی اپنی تنقیدی خدمات کی وجہ سے اردو کے سربرآوردہ نقادوں میں شمار ہوتے ہیں تو اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ کلیم الدین احمد اپنے انتخاب میں بالکل درست تھے۔

کلیم الدین احمد کی کتاب "قدیم مغربی تنقید" کا جائزہ لیتے ہوئے وہاب اشرفی نے یہ اظہار کیا ہے کہ اُن کی پرانی کتاب 'قدیم ادبی تنقید' جس کا پیشِ لفظ کلیم الدین احمد نے لکھا تھا، اسی سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کتاب تیار ہوئی ہے۔ وہاب اشرفی کے جملے ہیں:

"اب میرے پیشِ نظر کلیم الدین احمد کی کتاب 'قدیم مغربی تنقید' آئی تو محسوس ہوا کہ شاید میری کتاب موصوف کی کتاب کی محرک رہی ہے۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو، لیکن اس میں بھی وہی نقاد ہیں جو میری کتاب میں زیرِ بحث آئے ہیں۔" (کلیم الدین احمد، ص: ۱۰۲)

وہاب اشرفی یہ بات ۲۰۱۲ء میں لکھتے ہیں۔ ان کا حافظہ تقریبات وغیرہ میں بہت کم زور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہاب اشرفی کی اُس کتاب کی اشاعتِ اوّل میں شامل خود اُن کے دیباچے سے چند سطریں نقل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

"میں چاہتا رہا تھا (؟) کہ اس کتاب کے ضمن میں جناب کلیم الدین احمد کی رائے معلوم ہوتی۔ لہٰذا ڈرتے ڈرتے ان سے 'پیشِ لفظ' لکھنے کی درخواست کی۔ مجھے واقعی بڑی مسرّت ہے کہ موصوف نے میری درخواست پر اپنے گراں قدر خیالات رقم کر ڈالے۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موصوف کی تحریر کی روشنی میں اس کتاب کی اسپرٹ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔" (صفحہ۔ی، قدیم ادبی تنقید، جولائی ۱۹۷۳ء، پٹنہ)

یہاں دو باتیں بحث طلب ہیں۔ پیشِ لفظ آخر کس سے لکھوایا جاتا ہے؟ ہمیشہ اپنے سے بڑے مرتبے کے مصنف سے یہ گزارش کی جاتی ہے۔ وہاب اشرفی اُس زمانے کے اپنے علمی مرتبے کے مقابلے میں کلیم الدین احمد کے علمی مقام کو بہ خوبی سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے بجا فرمایا کہ "ڈرتے ڈرتے" ان سے لکھنے کی درخواست کی۔ پھر کلیم الدین احمد نے جو لکھا، اسے "گراں قدر خیالات" کہنا اور اس پر بے حد ممنون ہونا بھی صاف صاف بتاتا ہے کہ وہاب اشرفی اس زمانے میں کلیم الدین احمد کے علمی مرتبے کے قائل تھے۔ اب یہ اچانک انھیں خیال آیا کہ وہ کلیم الدین احمد پر اپنے اثرات ثابت کر کے اپنی عظمت کا ایک نیا پہلو ڈھونڈ سکیں۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ وہاب اشرفی اور کلیم الدین احمد کی کتابوں کا موازنہ کر کے بتا دیا جائے کہ وہاب اشرفی کے مقابلے کلیم الدین احمد کی تحریر کس قدر گہری، تجزیاتی اور اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ کلیم الدین احمد نے "کوئن ٹیلین" کے سلسلے سے کوئی باب نہیں قائم کیا جب کہ وہاب اشرفی نے اس موضوع پر علاحدہ طور پر گفتگو کی ہے۔

وہاب اشرفی نے اپنی کتاب کے نام کی تبدیلی کا جو شگوفہ چھیڑا ہے، وہ بھی درست نہیں۔ کلیم الدین احمد کی کتاب کی اشاعت تک وہاب اشرفی کی کتاب کا نام 'قدیم ادبی تنقید' ہی تھا۔ وہاب اشرفی نے اگر بعد میں اسے 'قدیم مغربی تنقید' کیا تو وہ واقعتاً کلیم الدین احمد کی نقل ہے اور حیرت کی بات ہے کہ وہ ٹھیک الٹا الزام کلیم الدین احمد پر عاید کر رہے ہیں۔ پہلے سے شائع شدہ کتاب کے نام کو اپنی کتاب کے لیے منتخب کرنا تصنیف و تالیف کی اخلاقیات اور قانون دونوں کے منافی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد کی کتاب ۱۹۸۳ء میں اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اندازہ یہ ہے کہ سال کے پہلے نصف میں ہی یہ کتاب آ گئی ہوگی کیوں کہ محمود الٰہی کا بہ حیثیتِ چیرمین جو پیشِ لفظ ہے، اس پر ۷/۱۷ مارچ ۱۹۸۳ء کی تاریخ درج ہے۔ کتاب کا واضح نام 'قدیم مغربی تنقید' ہے جو اتر پردیش اردو اکادمی میں کلیم الدین احمد کے پیش کردہ خطبات کا

کتابی روپ ہے۔ ۸۸ر صفحات کی اس کتاب میں کلیم الدین احمد نے افلاطون اور ارسطو کی تنقیدی خدمات کے سلسلے سے قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ہورس پر پندرہ صفحات اور لونجائی نس پر محض آٹھ صفحات مخصوص کیے ہیں۔ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں کلیم الدین احمد کا وہی مانوس ناقدانہ انداز ہے جس کے لیے اُن کی شناخت ہے۔ موضوع کا بے لاگ تجزیہ اور تمام متعلقات کو نگاہ میں رکھ کر غور وفکر اس کتاب کی خاص بات ہے۔ یہاں تعارفی یا ابتدائی نوعیت کے شاید ہی چند جملے ہوں جب کہ وہاب اشرفی کی کتاب میں تعارفی اور سرسری معلومات سے کام چلانے کا ہنر بہ آسانی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

وہاب اشرفی نے ۲۰۱۰ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے جب اپنی پُرانی کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا تو اس میں مختلف طرح کی علمی 'ہوش مندیاں' داخل کی گئیں:

(الف) اپنی کتاب کی پہلی اشاعت کا دیباچہ نکال دیا جس میں کلیم الدین احمد کے تئیں اعتراف اور احسان مندی کے جملے شامل تھے۔ جب کہ یہ عمومی اصول ہے کہ نئی اشاعت کے موقعے سے اشاعتِ اوّل یا ماقبل اشاعتوں کے 'عرضِ مصنف' لازماً شامل کیے جاتے ہیں کیوں کہ کتاب کی تصنیف کے تفصیلی عمل کو مصنف پہلی اشاعت میں اکثر و بیش تر صراحت کے ساتھ درج کرتا ہے۔ خود وہاب اشرفی نے 'شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری' کی دوسری اشاعت میں پہلے ایڈیشن کے عرضِ مصنف کو شامل رکھا ہے۔ یہاں آخر کس چیز کی پردہ داری ہے؟

(ب) کتاب کا نام تبدیل کر دیا گیا اور کلیم الدین احمد کی ۲۷ برس قبل شائع شدہ کتاب کا نام ہُو بہ ہُو نقل کر لیا۔ اس طرح ۱۹۷۳ء کی 'قدیم ادبی تنقید' ۲۰۱۰ء میں 'قدیم مغربی تنقید' بن کر سامنے آگئی۔ نئے 'پیش گفتار' میں بہت اختصار کے ساتھ تبدیلی نام کا قضیہ آتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "کتاب کے نام میں قدرے تبدیلی کر دی ہے۔ اب اس کا نام 'قدیم مغربی تنقید' ہے۔ اس طرح اب یہ نئی ہو گئی ہے۔ اس لیے بھی کہ اس کے بیش تر مندرجات میں ترمیم بھی کی گئی ہے اور اضافہ بھی۔" [ص ۱۳]۔ کتاب کے نام میں تبدیلی ایک اہم واقعہ ہے، اس لیے مصنف کو تفصیل کے ساتھ تبدیلی کے

اسباب وعلل اور لازمیت پر روشنی ڈالنا چاہیے تھا۔ ترمیم واضافہ تو ہر نئی اشاعت کا 'لازمی جزو' ہے۔ اس لیے اس کی وجہ سے نام کی تبدیلی کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ اضافے کی حقیقت یہ ہے کہ صرف دانتے پر سوا پانچ صفحے (بہ مشکل پندرہ سو الفاظ) اس کتاب میں بہ طور اضافہ دکھائی دیتے ہیں۔

(ج) نئی اشاعت کا انتساب ابوالکلام قاسمی کے نام کیا گیا ہے جب کہ کتاب کی پہلی اشاعت پروفیسر اختر قادری کے نام سے منسوب تھی۔ ہر اشاعت میں انتساب کی تبدیلی کی بدعت وہاب اشرفی کی دوسری کتابوں میں بھی سلسلے وار انداز سے موجود ہے۔ اس میں اکثر نئے اصحابِ اثر ورسوخ پر مہربانی اور جو گزر چکے ہیں، اُن سے اظہارِ برأت کا کاروبار جہاں ملحوظ رہتا ہے۔ وہاب اشرفی کے سلسلے سے انتسابات کی تبدیلی علاحدہ جائزے کا دل چسپ موضوع ہے جس سے اُن کے ادبی اور دنیوی نقطۂ نظر کو سمجھا جاسکتا ہے۔

(د) حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء میں شائع شدہ وہاب اشرفی کی کتاب 'قدیم ادبی تنقید' کا نام ۲۰۱۰ء سے قبل کبھی تبدیل نہیں ہوا۔ اس کی دوسری اشاعت بھی اس دوران سامنے نہیں آئی جب کہ انھوں نے اپنی نئی پُرانی بہت ساری کتابیں دوبارہ شائع کرائیں۔ اُن کے بارے میں جس قدر بھی کتابیں شائع ہوئیں؛ مثلاً سرور کریم، راشد انور راشد، مناظر حسن، نسیم احمد راہی، ہمایوں اشرف وغیرہ، اُن میں ہر جگہ 'قدیم ادبی تنقید' ہی اس کا نام درج ہے۔ ہمایوں اشرف نے اپنی فہرست میں کئی کتابوں کے نام یا کسی دوسری تبدیلی کے بارے میں بھی صراحت کی ہے۔ وہاں بھی ۲۰۱۰ء سے قبل ایسی کسی تبدیلی کی وضاحت نہیں۔

(ہ) اصل معاملہ یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی کے سلسلے سے مونوگراف کی تیاری کے مرحلے میں شاید وہاب اشرفی کو یہ دھیان آیا ہو کہ کلیم الدین احمد پر معتدد بہتان تراشیوں میں اسے بھی جوڑ دیا جائے کہ وہاب اشرفی کی کتاب کے موضوع اور اس کے

نام کو انھوں نے بہ طور نقل استعمال کر لیا۔ اسی لیے نئی اشاعت میں اپنا پُرانا دیباچہ ہٹا دیا اور پانچ صفحے کے دانتے پر مواد کے اضافے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ بالکل نئی کتاب ہے۔

(و) اسی لیے انھوں نے اپنی پُرانی کتاب پہلے شائع کرائی اور کلیم الدین احمد کے سلسلے سے مونوگراف لکھتے ہوئے اپنے تنقیدی اثرات ثابت کر دیے۔ اِسے جُرم کی تفتیش میں 'شہادت پیدا کرنا' (Evidence Creation) کہتے ہیں جسے عدالتیں قابلِ سزا جرم قرار دیتی ہیں۔ یوں اِسے علمی ہوس کاری اور عدم دیانت داری کہنا چاہیے۔

وہاب اشرفی نے اپنی خودنوشت میں کلیم الدین احمد کا ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ درج کیا ہے:

"اہم لوگ اپنے تعصبات سے دوسروں کو زیر کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور ہمہ دانی کے زعم میں مبتلا ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو غلط نتائج تک پہنچانے اور گمراہی میں مبتلا کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔" (قصہ بے سمت زندگی کا، ص: ۲۲۰)

وہاب اشرفی خود بھی "اہم لوگوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے سلسلے سے ان کے علمی نتائج بڑی حد تک اس اقتباس میں پیش کردہ اصول کے مطابق ہیں۔ جلد در جلد کتابیں پڑھنے والوں پر رعب تو قائم کرتی ہی ہیں لیکن کبھی کبھی نرگسیت کا ایسا عالم ہوتا ہے کہ لکھنے والا بھی اپنے علمی جلال میں تپ کر دوسروں کو ہیچ گردانتے میں ذرا بھی جھجکتا نہیں۔ وہاب اشرفی ہی نہیں، کلیم الدین احمد کی وفات کے بعد یہ ماحول خاص طور سے قائم ہوا کہ کلیم الدین احمد کے علمی مرتبے پر خاک ڈالے بغیر کسی دوسرے کا مقام متعین نہیں ہوگا۔ اسی لائحۂ عمل میں وہ لوگ جو اُن کی حیات میں اُن کے قصیدہ خواں تھے، بعد میں ان کے نقادِ خصوصی بن گئے۔ دشواری یہ ہے کہ کلیم الدین احمد جیسا گہرا علم، متن کی جہات پر قدرتِ کاملہ، تجزیے کا حیرت انگیز شعور، سلسلے وار انداز میں گفتگو کا طور، عملی تنقید کی گہری مشقت اور سادگی و پُرکاری سے مزین ایک دل پسند اسلوب دوسروں کے پاس کہاں سے آتا؟ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد کی تحریریں آج بھی سنجیدہ گفتگو کا موضوع بنی رہتی ہیں لیکن وہاب اشرفی نے جن شخصیات یا جن تحریکات پر مضامین یا کتابیں لکھیں، وہ کہیں بھی موضوعِ بحث نہیں بن سکیں۔ حد تو یہ ہے کہ مابعد جدیدیت پر

لکھی گئی ان کی کتاب پر بھی دس بیس مضامین کہاں شائع ہوئے؟ کلیم الدین احمد نے جب ترقی پسند تحریک کو موضوع بنایا، اس وقت ادبی رسائل میں اتنی زم گرم بحثیں سامنے آئیں جن سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ لکھنے والے کی وقت کی نبض پر انگلی ہے اور اس کے خیالات لوگوں کے ذہن میں شور پیدا کرتے ہیں۔ یہاں یہ حالت ہے کہ کتاب کی کئی کئی اشاعتیں سامنے آگئیں لیکن ایک بھی بحث طلب یا محاسباتی تحریر سامنے نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کتابیں علم کا خودرَو پودا نہیں بلکہ وہ ٹھونٹھ ہیں جن سے علمی زرخیزی نہیں اُبھر سکتی۔

'آب حیات' کی جب پہلی اشاعت عمل میں آئی، اس وقت چند ہفتوں میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید، حالی اور منشی ذکاء اللہ جیسے صفِ اوّل کے لکھنے والوں کے بھرپور تبصرے شائع ہوئے۔ ذکاء اللہ کا تبصرہ تو نہایت سخت تھا۔ لیکن محمد حسین آزاد نے ان ممتاز دانش وروں کے قائم کردہ سوالوں کے تعلق سے اپنا مکتوب جاری کیا جس میں بعض تسامحات کے تدارک کا اعلان شامل تھا۔ وہاب اشرفی کی کسی تحریر سے ایسی ادبی سرگرمی دیکھنے کو نہیں ملی۔ 'تاریخِ ادبیاتِ عالم' کی سات جلدیں اور 'تاریخِ ادبِ اردو' کی تین جلدیں بھلے کاغذ کا زیاں نہیں مانی جائیں لیکن ان کتابوں کے مطالعے کے بعد اہلِ اردو کے دماغ میں کوئی شور پیدا نہیں ہوا یا اردو کی نئی شعریات گڑھنے کے لیے کوئی ہلچل نہیں پیدا ہو سکی۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہاب اشرفی نے اپنے علمی نتائج اخذ کرنے میں وہ مشقت اور جاں سوزی نہیں اٹھائی جو ہمارے بزرگ مصنفین کا شیوہ تھا۔ اپنے علمی دائرۂ کار کو بھی انھوں نے مخصوص و محدود بنانے سے پرہیز کیا جس سے ان کا اختصاص پیدا نہ ہو سکا۔ بالعموم وہ تعریف و توصیف کو ہی تنقید سمجھتے ہیں لیکن کلیم الدین احمد کے سلسلے سے رشک، حسد اور کینہ پروری تک پہنچ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ کلیم الدین احمد پر وہاب اشرفی کی کتاب خود وہاب صاحب کے تنقیدی توازن پر سوالیہ نشان قائم کرے گی۔

(2012)

معاصر تنقیدی رویّے : ایک جائزہ

ابوالکلام قاسمی موجودہ دور کے ایسے مصنّفین میں نمایاں ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر مشرقی علوم کی سیاحی کے بعد اردو تنقید کی طرف قدم بڑھائے اور رفتہ رفتہ اپنی صلاحیت اور تصنیف وتالیف کے کام میں مستعدی کی وجہ سے انھیں ایسے نقادوں میں گِنا جانے لگا جو مغرب کے اصول ونظریات سے واضح واقفیت رکھتے ہوں اور جن کی اس نوع کی تحریروں پر سنجیدگی کے ساتھ ہم زبان متوجہ ہوتے ہوں۔ مشرق سے مغرب کی طرف مراجعت کا اگر قاسمی کی موجودہ تحریروں کے تناظر میں احتساب کریں تو وہ مشرق کے بجائے مغرب کی طرف ہی زیادہ جھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت'' کو منہا کر دیں تو اُن کی مجموعی خدمات میں مشرق کے علوم وفنون کا کچھ زیادہ دخل بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کے یہاں مغربی علوم اور واقفیت سے مستفید ہونے کا رویّہ جس قدر خشوع وخضوع کے ساتھ دکھائی دیتا ہے، وہ تیز لَو مشرقی علوم سے استفادے میں مدھم ہوجاتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ 'شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے'۔

۲۰۰۷ء میں 'معاصر تنقیدی رویّے' عنوان سے ابوالکلام قاسمی کے مضامین کا جو انتخاب شائع ہوا، اس میں بھی مغرب سے خوشہ چینی کا یہ سلسلہ قائم ہے۔ بعد میں ساہتیہ اکادمی کے اعزاز سے اس کتاب پر ایک سرکاری مُہر بھی لگ گئی۔ 'مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت' کے ماسوا ابوالکلام قاسمی کے پاس اب تک کوئی مکمل یک موضوعی تحریر نہیں ہے جسے اپنے موضوع پر بھرپور مطالعہ سمجھا جا سکے۔ مرتبہ کتابوں میں سے مُنی نار کے مقالات کے انتخابات زیادہ ہیں۔ محمد حسن عسکری کے تعلق سے ۱۹۸۲ء میں 'مشرق کی بازیافت' عنوان سے جو انتخاب شائع ہوا، اس کے علاوہ بہت کم مقامات پر ان مرتبہ کتابوں کا قاسمی صاحب نے کوئی بھرپور تنقیدی وتحقیقی احتساب پیش کیا ہے۔۔۔ 'معاصر تنقیدی رویّے' بھی ان کے متفرق مضامین ہی کا مجموعہ ہے جس میں موضوعاتی تنظیم کا ظاہری تعلق ابھارنے کی کوشش مصنف نے پیش گفتار کے اِن لفظوں میں کی ہے: ''یہ کتاب دراصل

میرے 'بیسویں صدی کی اردو تنقید کی مبسوط تاریخ' لکھنے کے خواب کی تعبیر ہے۔...... اس اعتبار سے زیرِ نظر کتاب ایک مربوط یک موضوعی کتاب کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔" (ص:۶) یہاں یہ بحث زیادہ ضروری نہیں کہ واقعتاً یہ یک موضوعی کتاب ہے یا مجموعۂ مضامین۔ لیکن پڑھنے والے دل چسپی سے مصنف کے مذکورہ اقتباس کو پڑھتے ہوئے اس نفسیات پر غور کرنا چاہیں گے کہ ایسی دلیلوں کی آخر ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کتاب کے انیس مضامین کی تحریر کا زمانہ ایک نہیں ہے۔ یہ الگ الگ وقتوں میں لکھے گئے مضامین ہیں۔ ایک موضوع یا ملتے جلتے موضوعات پر دوبارہ گفتگو کے دوران نقطۂ نظر میں خفیف سی تبدیلی یاد ہرا و اس کتاب کی واضح حد ہے۔ مضامین پر سال تصنیف نہ ڈالنا مزید پریشانی کا باعث ہے جس سے قاسمی کے ارتقاے خیال کا گراف صحیح طور پر تیار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان تمام مضامین میں ایک ایسی شخصیت چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے جسے ادب کے نظریات اور اصول وضوابط کے آئینے میں ادبی سرمایے کی طرف متوجہ ہونے کا شوقِ بے پایاں ہے۔ ابوالکلام قاسمی کا یہی اختصاص انھیں برتر مقام عطا کرتا ہے ورنہ اس کتاب کی حد تک ان کی عملی تنقید ناکافی اور سرسری ہو گئی ہے۔ نظریات کے شیدائی کی تخلیق وتنقید کے اصلی نمونوں سے جوجھنے میں یہ بے رُخی قابلِ تشویش ہے۔

ابوالکلام قاسمی کو عام طور پر مابعدِ جدید نقادوں کی ٹولی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب کے مضامین بہ طورِ ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں کیوں کہ انھوں نے مابعدِ جدید نظریات، انسلاکات اور شخصیات کو اِس کتاب میں بار بار اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔ یہ بھی پُرلطف ہے کہ وہ اس نئی ادبی تحریک یا رویّے کے ایسے رہبر ہیں جسے ان نظریوں میں کوئی کوتاہی یا تحفظ اور حدود کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ نئے ادبی رویّے پر جاں نثاری اور غیر مشروط طرف داری گوپی چند نارنگ کی قدر شناسی میں، مختصر لفظوں میں ہی سہی، عقیدت مندی میں بدل جاتی ہے اور اس کے برعکس جدیدیت یا اس کے سرخیل شمس الرحمٰن فاروقی کے ذکر واحتساب میں بے جا سخت گیری بھی قاسمی کے تنقیدی مسلک کی پرورد گی اور جوش کا زیادہ مظہر ہے۔ ان دونوں معاملات میں ابوالکلام قاسمی نقاد کے فرائضِ منصبی سے بہ سلامت عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ یہ بات بہت دل چسپ ہے کہ اس کتاب کے سب سے اچھے مضامین اُن اشخاص یا ادبی رویّوں سے متعلق ہیں، جن کا ابوالکلام قاسمی کے موجودہ ادبی مسلک سے کوئی خاص واسطہ نہیں۔

کتاب کے نام سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو تنقید کے رویّوں سے زیادہ دل چسپی ہے۔ وہ خود بھی پیش گفتار میں پڑھنے والوں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ " قارئین کو اس بات کا اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی کہ مصنف کو تنقیدی نظریات، معیارات اور اُن کے فلسفیانہ مباحث سے کتنی دل چسپی ہے"۔

انھی وجوہات سے اصولی حصّے سے اس کتاب کا آغاز ہوا ہے، جہاں اچھے مضامین موجود ہیں۔ یہ مضامین پورے طور پر اصولی مباحث کا اعلامیہ تو نہیں ہیں لیکن جگہ جگہ نئی پُرانی تنقیدی اصطلاحات اور ان کی وضاحتیں ان میں موجود ہیں۔ یہ تمام مضامین کسی نہ کسی جہت سے مابعدِ جدید نظریات کی تعبیر و تشریح کے لیے وقف ہیں۔ ایک مختصر مضمون 'ادبی تنقید کی نظریاتی بنیادیں' کو چھوڑ کر سارے مضامین مابعدِ جدید تنقیدی نظریے اور مابعدِ جدید نقادوں کی پشت پناہی کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ اس پوشیدہ یا ظاہری مقصد کی وجہ سے ابوالکلام قاسمی اپنے دائرۂ کار کو زیادہ وسعت نہیں دے سکے اور کم و بیش بار بار شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کے حوالہ جات اور ان کے تجزیے سامنے آتے ہیں لیکن نتیجہ پہلے سے معلوم ہے کیوں کہ ابوالکلام قاسمی گوپی چند نارنگ کے نظریۂ تنقید اور ادبی شخصیت کے دفاع کو ہی شاید اپنا ادبی مسلک سمجھتے ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے مضمون کا عنوان 'معاصر تنقید کی نارسائیاں' نہایت بلیغ اور شاعرانہ ہے۔ عنوان سے ایسا لگتا ہے کہ قاسمی اردو تنقید کی موجودہ صورتِ حال سے پورے طور پر نالاں ہیں اور اس لیے سے مستقبل کے لیے کوئی بہتر نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں لیکن اُس وقت افسوس ہوتا ہے کہ سارے مسئلوں کا حل گوپی چند نارنگ کے نظریۂ تنقید میں انھیں دکھائی دیتا ہے۔ نارنگ کے معتدٌ اقتباسات اور بار بار ذکر سے اگر یہ مانا جائے کہ معاصر تنقید کی نارسائیوں کا مداوا نارنگ صاحب یا ان کے نظریے میں ہے، تب یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ آخر اسی کے متوازی نارسائیوں کی فصل کیسے قائم ہوتی چلی گئی۔ کیا نارنگ کی اصلاح کا ہم عصر تنقید پر کوئی اثر نہیں پڑا؟ کیا نارنگ یا اُن کے انداز کی تنقید اسی طرح کا ایک ادعائی جز یہ نہیں ہے جس طرح علَم بردار جدیدیوں کی تنقید رہی ہے؟ اس طرح کے کئی اور بھی سوالات ہیں جن کا ابوالکلام قاسمی کو جواب دینا ہوگا۔

ابوالکلام قاسمی تنقیدی نظریات کے تعلّق سے جس قدر بھی دل چسپی لیں اور عملی تنقید کو اس کے بغیر ''ایک خوابِ پریشاں'' (ص ۱۸) سے زیادہ اہمیت نہیں دیں لیکن اس کتاب کے جو اچھے مضامین ہیں، وہ نظریوں کے مقابلے نظریہ سازوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں بھی نظریوں اور اصولیات کا ذکر بار بار ہے، لیکن ان کی انتہائی تجزیے کی سلیقہ شعاری میں پوشیدہ ہے۔ یہاں حالی، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آلِ احمد سرور، گوپی چند نارنگ، سجّاد ظہیر، سردار جعفری، اسلوب احمد انصاری اور وہاب اشرفی جیسے ادیبوں پر نو مضامین شامل ہیں۔ یہ قبول کرنا تو مشکل ہے کہ اردو کی تنقید کی تاریخ کے یہ نو سب سے مستحکم ستون ہیں لیکن اگر ابوالکلام قاسمی انھیں نمائندہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ان نقادوں کے مجموعی کارناموں کو پیشِ نظر رکھ

کر اپنا جائزہ مکمل کرنا تھا۔ لیکن یہاں حالی کو غزل کی تنقید اور آلِ احمد سرور کو نقدِ اقبال کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کر کے آدھے ادھورے نتائج پر مصنف نے قناعت کر لی ہے۔ ترقی پسند تنقیدی رویّے کے ترجمان کے طور پر سجاد ظہیر اور سردار جعفری پر قانع ہو جانا بھی انصاف کی بات نہیں۔ ہم عصر نقادوں میں اسلوب احمد انصاری، گوپی چند نارنگ اور وہاب اشرفی پر گفتگو کر لینے سے بھی معاصر رویّوں کی نمایندگی مکمل نہیں ہوتی۔

ابوالکلام قاسمی کے تجزیے کی معروضیت اور گہرائی کلیم الدین احمد پر لکھے مضمون میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس مضمون سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ قاسمی چاہیں تو کسی نقاد کا انصاف پسندانہ جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس مضمون میں کلیم الدین احمد کی تنقیدی خصوصیات سے وہ پورے طور پر واقف معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی تلی تنقیدی رائے دے سکتے ہیں اور تجزیہ کر کے اپنی باتوں کو ثابت کر سکتے ہیں۔ اس مرحلے میں اردو کے موجودہ نقادوں میں ان کی حیثیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ کلیم الدین احمد کے سلسلے سے ان کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

- ''ادبی تنقید کی نئی روشنی اور عالمی اصولوں سے کم و بیش یکساں طور پر باخبر ہونے کے باوجود کلیم الدین احمد اپنے معاصرین کے درمیان ادبی جمالیات اور تنقیدی ضابطہ بندی کے معاملے میں اُسی طرح ممتاز دکھائی دیتے ہیں، جس طرح حالی اپنے معاصرین اور متاخرین کے درمیان۔'' (ص:۱۰۳)
- ''بہ حیثیتِ تنقید نگار تجربے کی نوعیت اور الفاظ کے انتخاب کی منطق کے مابین نہایت باریک تفریق قائم کر کے اپنی تنقیدی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔'' (ص:۱۱۱)
- ''یہ کلیم الدین احمد کا عام تنقیدی طریقِ کار ہے کہ وہ کسی بھی شاعر کے لیے تعمیمی رائے زنی سے حتی الامکان احتراز کرتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح شاعر کے انفرادی رویّے کی نشان دہی کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔'' (ص:۱۱۲)
- ''کلیم الدین احمد کا امتیاز اس بات میں نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے شاعر کی (کے) فنّی نقائص کی نشان دہی اور چھوٹے سے چھوٹے شاعر کے محاسن کا اعتراف کرنے میں کسی نوع کی استناد سازی کو اپنی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتے۔'' (ص:۱۱۴)

■ ''ان کی (کلیم الدین احمد کی) سائنٹفک زبان ان کی تنقید کی ایک بڑی قوت ہے۔'' (ص:119)

تنقیدی ذمے داری کا یہ سلیقہ الطاف حسین حالی کے حوالے سے جو مضمون ہے، اس میں بھی قائم ہے۔ اسلوب احمد انصاری اور وہاب اشرفی کے تعلق سے بھی ابوالکلام قاسمی کے مضامین دیانت دارانہ ہیں۔ تنقیدی رائے دینے کے سلسلے سے یہاں غیر ادبی یا مسلکی نقطۂ نظر کو اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ دونوں مضامین میں مصنفین کے کارناموں پر زبردست ارتکاز ہے، جس کی وجہ سے ادبی نقاد کے منصب کی شان باقی رہتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ابوالکلام قاسمی جب اپنے پسندیدہ نقاد گوپی چند نارنگ کی تنقید کا دائرۂ کار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تب ان کی اپنی تنقیدی نارسائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں 'قاموسی'، 'بہترین نقشہ'، 'عمدگی کے ساتھ'، 'بڑی گہرائی کے ساتھ'، 'سیر حاصل بحث' وغیرہ مجموعۂ الفاظ گوپی چند نارنگ کے کارناموں یا تنقیدی نظریات کی وضاحت میں صَرف ہوئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کے امتیازات پورے طور پر اتنی صفات خرچ کرنے کے باوجود واضح نہیں ہوتے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ مضمون ذرا عجلت میں لکھا گیا ہے اور مصنف کو نارنگ کے تمام کارناموں اور مکمل ادبی کاموں کے احتساب سے زیادہ سروکار نہیں۔

اس کتاب کے تیسرے حصے میں چار مضامین شامل ہیں جن میں پہلا 'قدیم شعری متن اور جدید تعبیری رویے' کا دائرۂ کار قدرے پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں مرکز میں غالب اور ضمناً میر کا تذکرہ ہے۔ اگلے مضمون میں ''نقدِ میر کے بدلتے ہوئے رویے'' عنوان پر جو گفتگو ہے، اسے بھی پہلے مضمون کے موضوعاتی دائرۂ کار میں شامل سمجھنا چاہیے۔ اچھا تو یہ تھا کہ یہ دونوں مضامین کتاب کے حصۂ اوّل میں جگہ پاتے۔ یہاں بھی گوپی چند نارنگ کی موجودگی اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ ان مضامین میں تحقیقی اعتبار سے بہت ساری کڑیوں کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس بعض پسندیدہ ناموں کے دہراؤ کو جی لگا کر انجام دیا گیا ہے۔ موضوع جتنا بھرپور تھا اور ابوالکلام قاسمی کے اختصاصِ علمی سے بھی اس کا گہرا تعلق تھا: ایسے میں یہ توقع غیر ضروری نہیں کہ آخر وہ ایسے مقام سے سرسری کیوں گزر جاتے ہیں؟ سرسری گزرنے کا انداز میر انیس اور تانیثیت کے حوالے سے لکھے گئے مضامین میں بھی روا رکھا گیا ہے۔ دونوں مضامین نہایت تشنہ ہیں اور جب عملی تنقید کی ضرورت آتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ابوالکلام قاسمی کے یہاں بکھراؤ کی کیفیت اُبھر کر سامنے آنے لگتی ہے۔

ابوالکلام قاسمی کے مضامین میں اکثر و بیشتر نہایت سلیقہ مند پیش بندی ملتی ہے۔ وہ کسی موضوع پر

لکھنے سے پہلے اپنا دائرۂ کار متعین کر لیتے ہیں اور ضروری علمی و ادبی کیل کانٹے بھی درست کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے مضامین پورے عالمانہ انداز و وقار میں اچھے خاصے کر و فر کے ساتھ شروع ہوتے ہیں۔ زبان بھی اکثر و بیشتر صاف اور واضح ترسیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن یہ سلسلہ انجام تک اسی انداز میں قائم نہیں رہ پاتا۔ کبھی جدیدیوں سے مبارزت، کبھی مابعد جدیدیوں سے محبت، کبھی فاروقی سے مخاصمت اور کبھی گوپی چند نارنگ سے عقیدت جیسے تحفظات اس شانِ علمی کو گزند پہنچانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ جب کسی تنقید نگار کے یہاں اتنی رکاوٹیں ہوں، تو وہ معروضی اور ایماندارانہ فیصلے کیسے کر پائے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف کا پورے طور پر جی بھی نہیں لگتا۔ 'مقدمۂ شعر و شاعری'، 'اردو شاعری پر ایک نظر' یا 'اردو تنقید پر ایک نظر' جیسی کتابیں اپنے ادبی رویے اور معیار میں از اوّل تا آخر یکساں ہیں۔ وہاں ایسی اصولی یا عملی رکاوٹیں نہیں۔ قاسمی ان چیزوں سے اس کتاب کی حد تک بچتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ کوئی دنیوی جبر یا اہم عصر مسئلہ ہے، جس کا آسیب قاسمی کی تنقیدی عمارت پر کالی پرچھائیں بن کر بیٹھا ہے ورنہ زبان کے اتنے بڑے ماہر کے مضامین میں اس طرح کے جملے ان کی قوتِ انشا کا کیوں کر منہ چڑاتے:

■ ''مگر کلیم الدین احمد کے نہایت سخت گیر احتساب کے باوجود اردو تنقید کی تاریخ پر پوری صدی گزر جانے کے باوجود اس نوع کی تنقیدی تحریریں خاصی کم لکھی گئیں جن کو ادبی تنقید کے مثالی نمونوں کا نام دیا جا سکے۔'' (ص:۵)

■ ''اس بات میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ عربی قصائد کی تشبیب سے لے کر فارسی غزل کے ایرانی اور ہندستانی اسالیب اور اردو غزل کی روایت اور روح کو اپنے معاصرین اور بعد کے تنقید نگاروں کے مقابلے میں حالی نے کم گہرائی کے ساتھ نہیں سمجھا اور جذب نہیں کیا تھا۔'' (ص:۸۸)

اسی کے ساتھ اُن کے چند ایسے جملے بھی ملاحظہ ہوں جن کا شاید اب قاسمی صاحب خود مطالعہ کریں تو انھیں یقین نہیں آئے گا کہ ایسے غیر تنقیدی (اور غیر تہذیبی) جملے وہ تنقید کے نام پر نہ جانے کس عالم میں پیش کر چکے ہیں:

■ ''ہیئتی تنقید کے نقطۂ نظر سے متن یا زبان کو خیال کے وسیلۂ ترسیل سمجھنے والوں کا، مابعدِ ساختیات یا مابعدِ جدید تصورات سے اپنی بنیادوں کو متزلزل ہوتا محسوس کرنا بالکل ایک فطری اور قابلِ فہم ردِ عمل ہے۔'' (ص:۳۲)

■ ''شاید یہی اسباب ہیں کہ جن کے باعث شمس الرحمٰن فاروقی جیسے قطعیت پسند ہیئتی نقاد بھی ڈھکے چھپے انداز میں ہی سہی، مگر اس کی افادیت کے جزوی اعتراف پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔'' (ص:۳۲۔۳۳)

■ ''اردو کی اطلاقی تنقید نے گذشتہ برسوں میں بعض ایسے مراحل طے کیے ہیں جن کو یقیناً حالی کی عملی تنقید سے آگے کی منزلوں کا نام دیا جانا چاہیے۔'' (ص:۸۷)

ابوالکلام قاسمی کی یہ کتاب چند تنقیدی اصولوں کے دائرۂ کار میں نقادوں کو رہ کر گفتگو کا سلیقہ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیکن اپنے نشانے میں یہ پورے طور پر کامیاب نہیں۔ قاسمی نے کیا خدا لگتی کہی ہے :

''حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زمانے میں اگر ادبی تنقید نارسائیوں کا شکار ہوتی ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ اس نوع کے بے لچک رویے اور قطعیت ہوتی ہے۔'' (ص:۳۵)

کاش ابوالکلام قاسمی کی یہ کتاب بھی ان عیوب سے پاک ہوتی۔ ہمارے زمانے کے بزرگ تر نقادوں کے بعد جو صفِ دوم قائم ہوتی ہے، ان میں ابوالکلام قاسمی اپنی علمی تیاری کے اعتبار سے سب سے پختہ کار مانے جاتے ہیں۔ زبان اور انشا کے تعلق سے بھی ان کے احوال چست درست ہیں۔ لیکن مضامین میں اپنے ادبی مسلک کے تئیں بے جا جھکاو، تحقیقی اعتبار سے حقائق کی پیش کش میں عدم مستعدی، ادبی نمونوں کے انتخاب میں غیر معروضیت یا عدم درجہ بندی اور عملی تنقید سے گریزاں ہونا، ایسی رکاوٹیں ہیں جنھیں پار کیے بغیر اردو کا نیا نقاد سامنے نہیں آ سکتا۔ یہ ابوالکلام قاسمی اور ان سے توقعات رکھنے والے ادب فہموں، دونوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔

(2012)

ناوک حمزہ پوری: استاد شاعر کی نقادی

ناوک حمزہ پوری اردو کے بزرگ شعرا میں عروض و قوافی کے مسائل و مباحث کے آشنا میں شمار ہوتے ہیں۔ ملک اور بیرونِ ملک ایسے لوگوں کی تعداد شاید سیکڑوں میں ہو جو براہِ راست اپنے کلام پر اُن سے اصلاح لیتے ہوں۔ ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنے شعری مجموعوں کو اشاعت سے پہلے ناوک حمزہ پوری کو ارسال کر دیتے ہیں تا کہ اُن کے دیکھنے کے بعد فنّی اعتبار سے کوئی خامی وہاں موجود نہ رہے۔ ناوک حمزہ پوری اپنی مشاقی اور استادانہ رکھ رکھاو کے طفیل شعر و ادب کی حسبِ اصنافِ سخن میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ درسی اور غیر درسی، کلاسیکی اور جدید سب کوچوں کی سیاحی کرتے ہوئے اب وہ مجموعۂ مضامین 'آوازِ ہست' کو ایک سویں کتاب کا درجہ عطا کر کے اگلی ادبی منزلوں کی طرف عمر کی نویں دہائی میں پہنچنے کے باوجود رواں ہیں۔

ناوک حمزہ پوری ایک کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ 'آوازِ ہست' میں ۱۹ر مضامین شامل ہیں۔ یہ تصنیف ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے کیوں کہ ایک استاد شاعر اور ایک مشاق اہلِ علم کے گہرے مطالعے کا نچوڑ ان مضامین میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے تنقیدی مضامین کے عمومی مجموعے کی طرح نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ عام طور پر جس طرح متفرق موضوعات پر دو، چار، دس لاتعلق تحریریں جمع کر کے ہمارے زمانے میں کتابیں تیار کر دینے کا چلن ہے، ناوک صاحب نے ایسی علمی ہوس نا کی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کتاب میں کم از کم نصف درجن ایسے مضامین ضرور شامل ہیں جو اپنے موضوع کے ساتھ عالمانہ طور پر انصاف کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ، چھے مضامین ایسے اور بھی نکل آئیں گے جن میں کوئی نہ کوئی گہرا علمی نکتہ ضرور پوشیدہ ہو۔

ناوک حمزہ پوری کو باضابطہ نقاد کہنا مشکل ہے۔ حالاں کہ وہ تنقید سے متعلق بہت ساری چیزیں لگاتار لکھتے رہے ہیں۔ استادی کی وجہ سے انھیں تقریظ اور مقدمات لکھنے کی بار بار ضرورت پڑتی ہے۔

اپنے شاگردوں کو دعائیں دیتے ہوئے یا نیک خواہشات کا اظہار کرنے کے مقصد سے جو تحریریں پیش کی جائیں گی وہ عام طور پر تنقید کے دائرے سے رہ رہ کر نکل جائیں گی۔ اس کتاب میں یہ مشکل اَسّی فی صد مضامین کے ساتھ موجود ہے۔ ان میں جگہ جگہ تنقیدی اشارے تو ہیں لیکن صلاح ومشورہ، نیک خواہشات، استادانہ چپت اور تبلیغ، اخلاق ومروّت کے ساتھ کبھی کبھی جلال وکمال علم کا فخر اس انداز میں جگنوؤں کی طرح روشن ہو جاتے ہیں جس سے علمی معروضیت اور تنقیدی ناوابستگی اپنے آپ دم توڑ دیتی ہیں۔ اس مجموعے کے تقریباً تمام وکمال مضامین شاعری سے متعلق ہیں۔ صرف خورشید جہاں، خلیق النسا خانم اور اشراق صاحب کی کتابوں پر لکھے گئے مضامین نثر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مصنف اپنے مخصوص علمی دائرے کو سمجھتے ہیں اور مضبوط زمین پر رہ کر ہی احتساب کا کام کرتے ہیں۔ یہاں نَومشق اور کہنہ مشق دونوں ہیں لیکن دونوں کے جانچنے اور پرکھنے کا پیمانہ ایک ہی ہے۔ مصنف سے ذاتی تعلقات کی تفصیل، جگہ جگہ شاعری کے نمونے چسپاں کرنا، چند خصوصیاتِ شعر بھی بتاتے چلنا، اخلاقی اعتبار سے بھی ذرا صورتِ حال کی ناپ تول کر لی جائے اور عروض کے پہلو سے دو چار خامیاں ہوں تو انھیں اہتمام کے ساتھ نشان زد کر دیا جائے۔ یہی ناوک حمزہ پوری کی تنقید نگاری کے اصول وضوابط ہیں۔ انھیں اعلا تنقید کا واقف کار تسلیم کرنا مشکل ہے۔ ہاں، ان کی تنقیدی افادیت سے زیادہ انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کتاب کی لَے بے تکلفانہ ہے۔ یہی اس کی تنقیدی اُٹھان پہ قدغن بھی ہے۔ تنقید کے روایتی اصولوں سے بے ربطی کے سبب اس کتاب میں رسومیات کی کثرت ہوگئی ہے۔ جن اصحاب کی تربیت حالی، شبلی سے لے کر کلیم الدین احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدوں کے زیرِ سایہ ہوئی ہے، انھیں ناوک صاحب کے اندازِ تحریر کی انتہائی غیر رسمی فضا ناگوار گزرے گی۔ وہ کب منطق اور استدلالی دنیا سے نکل کر رسومیات میں بہ خوشی قید ہو جاتے ہیں، انھیں پتا ہی نہیں چلتا۔ اسی لیے ان کے اکثر مضامین فلمی اصطلاح میں غیر مدوّن Rushes کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ عمر کی نویں دہائی میں پہنچ چکے کسی معتبر اہلِ قلم کو پھر سے نئے راستوں کا راہ رَو بننے کی کون تلقین کرے اور اس حال میں کہ جب بزرگ محترم کو اپنی کہنہ مشقی ہمیشہ یاد رہے اور اس کا تذکرہ مضمون در مضمون تخن تکیہ کی طرح ہوتا ہو، انھیں کون ٹوکے۔ چند ملی جلی مثالیں ملاحظہ ہوں:

■ ''پرسوں پھر کہکشاں کا فون آیا۔ وہ غالب کے نثری اسلوب پر کچھ

کتابیں چاہتی تھیں۔ تو شرمندگی ہوئی کہ ان کی تصنیف محتاج توجہ پڑی ہوئی ہے۔
رمضان آیا چاہتا ہے اور یہ فقیر رمضان شریف میں اکثر دنیوی مکروہات سے
دامن کش رہتا ہے۔ سو خیال آیا کہ اپنا وعدہ جیسے تیسے پورا کر ہی ڈالوں''۔ (ص:۱۲)

■ ''آپ چاہیں تو اسے حسن اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ میں کیا کہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ گذشتہ ساٹھ برسوں سے شعرا کی رہ نمائی کرتے کرتے آنکھ سوا تنگ سب کھودیں اور اب سکت باقی نہیں۔ ایسے میں حضرت خوشدل اپنی قریباً ایک سو نعتیہ نظمیں لے کر اس خاکسار کے غریب خانے میں آ دھمکے کہ ان کی نوک پلک درست کر دیجیے۔'' (ص:۱۶۶)

■ ''آپ کی شادی ۲۸ر مارچ ۱۹۹۴ء کو ہوئی۔ اور شادی شدہ زندگی کی اس مدّت میں آپ کی تین بیٹیاں اور تین بیٹے ماشاءاللہ حی القائم ہیں۔ ایک حضرت جناب معصوم اس وقت میرے پڑوس میں ہیں۔ وہ فرما رہے تھے کہ موصوف کی زوجہ خوب رُو اور خوش سلیقہ ہے۔ اس لحاظ سے جناب میم اشرف خوش بخت ہیں۔'' (ص:۱۵۹)

ایسے اقتباسات یہ واضح کرتے ہیں کہ کسی تنقیدی مضمون میں ان کے لیے کون سی جگہ ہونی چاہیے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناوک حمزہ پوری ایک ساتھ خودنوشت، خاکہ، رپورتاژ، مکتوب اور تنقیدی مضمون کا کوئی محلول تیار کر رہے ہیں۔ ہر صنف کے تقاضے جدا ہیں اور اُن کی سرحدیں جب دراندازی کی زد پہ آتی ہیں تو پڑھنے والا بے چین ہو جاتا ہے۔ خود ناوک حمزہ پوری رباعیوں کے دائرۂ کار میں چھیڑ چھاڑ پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔ لیکن وہ پانچ صنفوں کے دائرۂ کار کو مَن چاہے طریقے سے توڑ دیتے ہیں۔ ایسے میں پڑھنے والوں کو کیسا محسوس ہوگا؟ ممکن ہے، ان کی استادی یہاں بھی کچھ نئی صنف قائم کرالے لیکن ابھی وہ زمانہ نہیں آیا۔ کہیں کہیں اُن کے جملے اچھے خاصے تنقیدی بیل بوٹوں سے لیس ہو کر بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس وقت یہ سمجھنا دشوار نہیں ہوتا کہ صاحب مضمون کو بہت سارے تنقیدی گُر معلوم ہیں لیکن استادی انھیں لکیر کا فقیر بننے نہیں دیتی۔ نئی بحر اور نئے اوزان یا زحافات کا مستقل کھلاڑی کیوں تنقید میں دوسروں کے 'فاعلاتن فاعلات' پر قانع ہو جائے؟ چند جملے اس امر کے ثبوت کے لیے پیشِ خدمت ہیں تاکہ قارئین یہ سمجھ سکیں کہ بزرگوار عام تنقید کے اصول وضوابط سے کماحقہٗ

واقف ہیں:

- ''ہر چند محترمہ تبسم ہر دو اصناف پر قدرتِ کامل رکھتی ہیں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ نظموں میں بہ نسبتِ غزل زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کے کلام میں رنگیں لہر، نشیلی جدت، البیلی خوشبو، صف بند سائے، تپتی مسافت، ست رنگ سپنے، روتی حویلی، آسیبی موسم، خوں ریز جھم جھم، یخ بستہ موسم، گیلی لکڑی وغیرہ وغیرہ بے شمار تلازمے، تشبیہات، استعارے اور ترکیبات وغیرہ موجود ہیں جو معنی کی دنیائے لامحدود کی سیر کراتے ہیں۔'' (ص:۲۵)
- ''ان اشعار کو دیکھیے، یہ شاہد ہیں کہ شاعر جاگ رہا ہے۔ کھلی آنکھوں سے آئے دن رونما ہونے والے واقعات کو دیکھ بھی رہا ہے اور انھیں بھوگ بھی رہا ہے۔ پھر یہ کہ اپنے احساسات دوسروں تک پہنچا بھی رہا ہے مگر ایسی سلیقہ مندی سے کہ دل موہ لیتا ہے۔ پیرایۂ بیان بلا واسطہ رپورٹنگ کا نہیں ہے بلکہ غزل کا دلکش انداز ہے۔ حسین اشارے ہیں، من موہک کنایے ہیں۔'' (ص ۶۲)
- ''خاکسار بہار میں اپنے معاصرین میں درمیانی انگلیوں پر گنے جانے والے جن چند حضرات کو بالمعنی تعلیم یافتہ سمجھتا ہے، جانتا ہے، اُن میں بھی حضرت ظفر کمالی کا خاص الخاص مقام ہے۔ موصوف کو نثر و نظم ہر دو شعبے پر خاصی قدرت حاصل ہے۔ نثر بھی بڑی شگفتہ لکھتے ہیں اور نظم نگاری پر بھی کیا زبان و بیان اور کیا عروض و فن، دونوں پر انھیں قدرتِ تامّہ حاصل ہے۔ چناں چہ اس خاکسار کی نظر میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔'' (ص:۹۳)
- ''رباعی کے نامور شعرا میں اس زمانے میں جوش (وفات ۱۴۰۲ھ) اور فراق (وفات ۱۹۸۲ء) خاصے قابلِ ذکر ہیں۔ جوش اپنی زبان کی دبازت کی وجہ سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ رباعی روشن بیانی کا فن ہے۔ ثقالت برداشت نہیں کرتی۔ عقاید کی بغاوت (شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا) نے بھی اثر

دکھلایا۔فراق قدرے کامیاب رہے۔رباعی کی فضا بدلنے کی بھی کوشش کی۔لیکن ایک حد تک۔جنسی برہنگی اور نا آسودگی کا رنگ اُن کے ہاں ذرا زیادہ شوخ ہوگیا ہے۔ رباعی کو گھر آنگن تک لے جانے میں وہ ایک تہذیب کے مبلغ بن گئے۔'' (ص:۴۳)

ناوک حمزہ پوری ماسوائے عروض و بیان تحسینی دبستانِ نقد سے تعلق رکھتے ہیں۔اس تحسین کا بار بار معیار اور مہارت سے ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی تحسین سے یہ پتا لگانا مشکل ہے کہ ادبی اعتبار سے دو لکھنے والوں میں بڑا کون ہے؟ ہر مضمون ہمیں اس الجھن میں ڈال دیتا ہے کہ بہت سارے نئے نئے چہرے اور ''ابتدائے عشق'' کے فرزندان علامہ اور حضرت جیسے القاباتِ جلیلہ سے متصف ہو کر ہمارے سامنے یوں آتے ہیں جیسے علم و فن انھی پر ختم ہیں۔اس لیے اس تنقیدی اصطبل میں گھوڑے اور گدھے سب ایک ہی جیسے لفظوں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت اور شفقت میں لکھنے والوں کی درجہ بندی بے کار سمجھ لی جاتی ہے۔ دل کھول کر محبت بانٹنا ذرا تنقیدی سایہ چاہتا ہے۔کاش ایسا ہو جاتا تو اس کتاب میں شامل افراد اسی طرح اردو ادب میں اپنی جگہ مستحکم کرا لیتے جیسے ناوک حمزہ پوری انھیں پیش کرتے ہیں۔

اردو کی حد تک غور کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماہرینِ عروض و قوافی ہمارے ادب کے راہ بر نہیں مانے گئے۔پوری تاریخ نے قواعد نویسوں اور ماہرینِ عروض و قوافی کو سربراہی کا تاج نہیں پہنایا بلکہ اس کے لیے شعرا اور ادبا منتخب کیے گئے اور انھیں ادبی رہنمایان کی صف میں جگہ دی گئی۔اقبال کی بے عروضیوں پر کتابیں مکمل ہوئیں لیکن کلامِ اقبال کی فضیلت پہ حرف کہاں آیا؟ اس سے بڑھ کر یہ بھی ہوا کہ (۱) من نہ دانم فاعلاتن فاعلات (۲) شعر میں کہتا ہوں، بچے تم کرو جیسے مصرعے کہہ کر شعرا نے عروضیوں کا مذاق اڑایا۔

'آوازے ہست' میں تقریباً ہر مضمون میں اسی 'بچے' پر بہت زور ہے۔زبان و بیان کی گرفت کرنا اور بے راہ روی سے فرزندانِ قوم کو روکنا اور ٹوکنا ناوک حمزہ پوری کا شیوۂ علمی ہے۔عروض کے باریک نکات کو بتانا اور ہر شاعر کے یہاں ایسی تھوڑی بہت خامیوں کو واشگاف کرنا وہ کام ہے جسے تنبیہ الغافلین کے شوقین افراد ہی انجام دے سکتے ہیں۔ناوک صاحب کا یہ خاص میدان ہے اور وہ اس معاملے میں کسی بھی حال میں نئے یا پرانے لکھنے والوں سے محبت آمیز رویہ اختیار کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔لیکن یہاں بھی ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ شعرا کی عروضی خامیاں اس انداز میں طے کرتے ہیں جیسے سچ اور جھوٹ یا یزید و حسین کے بیچ معرکہ ہو۔

اردو شاعری کا طالب علم عروض کے ماہرین کی آپسی چپقلش سے خوب خوب واقف ہے جہاں عروضیوں کے بیچ علمی جوتم پے زار کی نوبت آجاتی ہے لیکن ناوک صاحب نے بیسیوں جگہ قولِ خدا کی طرح فیصلہ فرما دیا ہے۔ جب کہ وہ خامی یا رواج اساتذۂ فن کے یہاں بھرپور مقدار میں موجود ہے۔ ظفر کمالی کی رباعیات پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے سقوطِ حروفِ علت سے احتراز کا مشورہ دیا ہے، اسے کون تسلیم کرے گا۔ خود مامون ایمن پر گفتگو کرتے ہوئے ناوک صاحب اس معاملے میں عمومی صورتحال سے آگاہی ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ اور لاٗ پر بحث کرتے ہوئے 'ہ' کو حذف کرنا انھوں نے نادانی مانا ہے۔ حالاں کہ وہ معاصرین کے درمیان صرف دو شعرا قمر مینی اور مامون ایمن کو بہ طورِ مثال پیش کر پائے جو لفظ اللہ کو پوری 'جسامت' کے ساتھ باندھتے ہیں۔

ناوک حمزہ پوری کی اس کتاب کو کوئی بڑا تنقیدی صحیفہ کہنا مشکل ہے۔ وہ ادبی متون کے بطن میں اُتر کر تحلیل و تجزیہ کی خو کم کم اپناتے ہیں۔ اس کے بغیر تنقیدی اعتبار سے شاید ہی کوئی بڑا کارنامہ سامنے آسکتا ہے۔ یہ کتاب ایک معمر ادیب اور مستند استاد شاعر کی خوش گپی کی طرح ہے۔ حضرت جب ترنگ میں ہوں تو گہرے رموز ہاتھ آجائیں اور جب عمر کی تھکان حاوی ہو جائے تب اِدھر اُدھر کی یادوں کا بے جوڑ سلسلہ سامنے آجائے۔ اس کتاب میں علمی نکتے اور گانٹھ میں باندھ لینے والے اشارے بہت ہیں۔ لیکن وہ غیر ضروری رسومیاتِ علمی اور فضولیات کے جنگل میں کھو گئے ہیں۔ صد حیف، استاذ الاساتذہ ناوک حمزہ پوری کی کتاب سے گزرتے ہوئے خاکساران کے تحسینی رویے کو قائم نہیں رکھ سکا۔

(2012)

شیخ سعدی، صابر القادری اور افادہ بخش ادب

خطۂ مشرق میں شیخ سعدی کی کتابیں اپنی جہاں دیدنی کے لیے حیرت انگیز طور پر شہرت رکھتی ہیں۔ اپنے عہد اور زندگی کو ننگی آنکھوں سے ایک مفکرانہ اور مصلحانہ آنچ کے ساتھ جیسے سعدی نے ملاحظہ فرمایا تھا، وہ ایک پُر استعجاب حقیقت کی طرح ہے۔ اسی لیے سعدی کی کتابوں کے ورق ورق عوامی یادداشت میں اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ کبھی اُن کا وہی حقیقی رنگ ہوتا ہے جو فارسی میں ہے اور کبھی اصل متن پر علاقائی زبانوں کا ٹھپا لگتے ہوئے صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشرق ہی نہیں مغرب کی زبانوں اور قوموں نے بھی سعدی کو آنکھوں سے لگایا اور ایک زندہ حقیقت کی طرح شیخ سعدی اپنی موت کے سات سَو برس کے بعد بھی فیضان جاری رکھنے میں کامیاب ہیں۔

اس موضوع پر پتا نہیں کوئی تحقیق ہو سکی ہے یا نہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فارسی کے جس اہلِ قلم کو اردو والوں نے بیش از بیش ترجمے کے حوالے سے اپنا بنانے کی کوشش کی، اس میں سعدی سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں۔ مولانا روم، امیر خسرو اور حافظ بھی اردو والوں کے بیچ نہایت جانے پہچانے ہیں لیکن تراجم یا مترجمین کی تعداد کے معاملے میں سعدی کا اردو میں کوئی مدِ مقابل نہیں ہو سکتا۔ اردو شاعروں میں غالب اور اقبال کے فارسی کلام کے بھی متعدد تراجم سامنے آئے لیکن یہاں بھی تعداد کے معاملے میں سعدی ہی افضل قرار دیے جائیں گے۔

ابھی یہ کل کی بات تھی جب یونی ورسٹیوں کا نظام باضابطہ طور پر قائم نہیں ہوا تھا اور مدارسِ اسلامیہ کے بغیر تعلیم کا کوئی تصوّر ممکن نہیں تھا۔ اس وقت ابتدائی جماعتوں میں 'گلستاں' اور 'بوستاں' کی حیثیت لازمی نصاب کی تھی۔ آج جن کی عمر زیادہ ہے، اگر اپنے بچپن کے نصابِ تعلیم پر غور کریں تو انھیں یاد آئے گا کہ سعدی شیرازی ایامِ طفلی میں ہی اُن کی زندگی کا حصّہ ہو گئے تھے۔ جب انگریزی تعلیم کا زور بڑھا اور

مدارسِ اسلامیہ سے سماج کی بے رغبتی پیدا ہونے لگی، اس وقت بھی فارسی کے شعرا میں صرف سعدی ہر جگہ نصاب میں کم وبیش موجود رہے۔ ہمارے مترجمین نے نثر اور نظم دونوں میں سعدی کو پیش کیا، بچّوں اور عورتوں کے لیے جو نصابات تیار ہوئے، اُن میں بھی سعدی کا انتخاب اور نہایت سادہ زبان میں تراجم شامل کیے گئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شیخ سعدی اردو معاشرے میں کوئی اجنبی فرد معلوم نہیں ہوتے۔

اہالیانِ اردو سے سعدی کے اس گہرے رشتے کے متعدد اسباب ہیں۔ سہل پسندی میں اس کا ایک جواب یہ ہوتا ہے کہ سعدی کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اس لیے سعدی کم پڑھے لکھے اردو والوں کو بھی راس آتے ہیں۔ مزید توجیہات یہ پیش کی جاسکتی ہیں کہ سعدی کا موضوع لوگوں کو دل پسند لگتا ہے۔ سعدی کی کتابوں میں اصلاح اور تبلیغ کا اچھا خاصا انتظام ہوتا ہے۔ یہ بھی عام لوگوں کے لیے توجہ کا باعث ہے۔ اصلاح پسندی کے باوجود سعدی مبلّغ سے زیادہ وقت کے مشاہد کی طرح سامنے آنا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے عوامی حکایات کا ایسا سلسلہ قائم کیا جن کا ایک سرا اگر مذہب سے ملتا ہے تو دوسرا سرا عوامی روایات اور مشاہدات سے متعلق ہے۔ موقعے کی مناسبت سے سعدی واقعات یا اشعار کا ایسا ہنر مندانہ استعمال کرتے ہیں جو اردو معاشرے میں بھی اچھا خاصا پسندیدہ ہے۔ سعدی کے اکثر وبیش تر واقعات یوں تو عرب اور ایران سے متعلق ہیں لیکن حالات کی پیش کش میں سعدی نے انھیں عمومی بنانے پر سب سے زیادہ زور دیا جس کے نتیجے کے طور پر ہندستان کے باشندگان کو دورانِ مطالعہ کبھی بھی کوئی بڑی رکاوٹ نہیں معلوم ہوتی۔ فضا بندی میں بھی سعدی نے کچھ ایسا سلیقہ پایا تھا کہ کسی دوسرے ملک کے باشندے کو ان واقعات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ملکِ مخصوص کی تاریخ یا جغرافیہ پہاڑ کی طرح مخل نہیں ہوتے ہیں۔

سعدی سے ہندستانی معاشرے کی انسیت یا اپنائیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سعدی نے اپنے ادب کی بنیاد تجربات، مشاہدات اور افادیت کی جس حیثیت پر قائم کی، وہ شعروادب کی آفاقیت کے اصل ستون ہیں۔ ہندستان میں یوں بھی ادب اور تہذیب کے قدیم دھارے موجود رہے ہیں جن کی آغوشِ تربیت میں ہماری کئی نسلیں پلی بڑھیں۔ اس لیے ہمارے عوامی قصّوں کی طرح سعدی کی کتابوں کی روایات اِدھر اُدھر گھومنے لگیں۔ ایسے مراحل میں الحاق کا زور بھی قائم ہوتا ہے اور وقتی ضرورت اور افادیت کا دباؤ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اصل روایات کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنی غیر اصل روایات اپنے آپ پیدا ہونے لگتی ہیں۔ ہندستان میں امیر خسرو کے ہندوی کلام کے ساتھ بھی یہی

ہوا اور جگہ جگہ سعدی کے نام سے ایسی روایات بھی سامنے آنے لگیں جن کی اصل حقیقت معدوم تھی۔

عوامی ردوبدل یا الحاق نے ہندستانی معاشرے میں سعدی کے کلام کے اتنے رنگ پیش کیے کہ اصل میں اہلِ ایران بھی اس کی تلاش نہیں کر سکتے۔ اردو میں سعدی ایک ادبی روایت بن گئے۔ بچّوں کے لیے سعدی، عورتوں کے لیے سعدی، مذہب پسندوں کے سعدی اور فکر و فلسفہ کے جویان کے لیے سعدی۔ فارسی کی متنی تنقید کے ماہرین اردو متن سے فارسی متن کا موازنہ کرتے وقت بے شک جگہ جگہ چیں بہ جبیں ہوں گے لیکن ہندستان کی عوامی روایات میں سعدی جیسے ہیں، اب انھیں اس طور پر بھی لازماً پہچانا جائے گا۔ کوئی اس سے بجا طور پر اختلاف کرے یا لاکھ تنقید لکھے لیکن عوامی روایات کا جادو بالآخر چل ہی جاتا ہے۔

جناب صابر القادری کا کتابچہ 'کریمائے سعدی' سعدی سے ہندستانی اور اردو معاشرے کی اسی روایت سے وابستگی کا اظہار ہے۔ کریما سعدی اور بوستاں سے مختصر انتخاب کو صابر القادری صاحب نے اردو اشعار کے قالب میں ڈھال کر یہاں پیش کیا ہے۔ شاعری کے ماہرین کا یہ تصور بہت پرانا ہے کہ شاعری کا ترجمہ ممکن نہیں یا ترجمہ کرتے ہوئے اکثر و بیش تر اچھی شاعری ضائع ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اسے اپنی اصل زبان میں کیوں کر اتنا اونچا مقام عطا کیا گیا؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ترجمے کے بغیر دنیا کی کسی قوم کا کام نہیں چل سکتا اور چا ہے جس قدر ترجمے سے بے اطمینانی ہو لیکن اس کے سہارے کے بغیر ہزاروں مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

انھیں اسباب سے اس کتابچہ کے متن (ترجمہ) اور اصل فارسی سے موازنہ کر کے صابر القادری صاحب کی مترجم کی حیثیت سے صلاحیت کا جائزہ لینا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس سے زیادہ مناسب یہ کام ہوگا کہ ہم یہ غور کریں کہ یہ کتابچہ سعدی کی حکیمانہ باتوں کو کس حد تک اردو زبان میں پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ اس سے ہم اردو کی عوامی روایت میں سعدی اور خسرو کی بھرپور شمولیت کے فائدہ بخش نتائج کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس بات کا جائزہ بھی لیا جائے گا کہ ترجمہ کے دوران صابر القادری صاحب نے اپنی زبان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا اور کیا شاعری کے تمام تقاضوں کو انھوں نے بہ طریق احسن آزمایا ہے۔ ایک سوال اور بھی ہے کہ سعدی نے علم اور فکر و فلسفہ کی بلندی پر پہنچ کر زبان و بیان کی جس سادگی کا عرفان حاصل کیا تھا، وہ کیا مترجم نے اپنے مسودے میں سمونے کی کوشش کی ہے؟ ہر چند یہ ناممکنات میں سے ہے لیکن یہ توقع فضول نہیں کہ آپ ترجمہ یا تلخیص پیش کرتے ہوئے اصل متن کے حقیقی اشارات کہاں تک شامل کر کے اپنی زبان کے سرمایۂ ادب کو اعتبار بخشتے ہیں۔

صابر القادری صاحب کا یہ ترجمہ اُن کی پہلی تصنیف نہیں ہے۔ اس سے پہلے شعری اور نثری تحریریں جلد بند ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ اُن کا مکمل دیوان اور متعدد مسوّدات ابھی اشاعت کے انتظار میں ہیں۔ اس اعتبار سے یہ فیصلہ مناسب ہے کہ صابر القادری نے ترجمے کے لیے اپنی استعداد اور تخلیقی صلاحیتوں کو تول کر دیکھا۔ اسی لیے ترجمہ کے دوران اُن کی زبان اکثر و بیش تر نہایت سادہ ہے اور ترسیل کا کوئی مسئلہ ابھرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ انھوں نے اچھا کیا کہ چھوٹے چھوٹے عنوانات بھی متن میں شامل کر دیے اور فارسی کے انداز میں ہی مختصر قصّوں کے موضوعاتی عنوانات بھی بنا دیے۔ قصّے رنگ برنگے اور الگ الگ آداب کے ہیں لیکن اُن کی پیش کش میں مترجم نے یہ خیال رکھا کہ عام آدمی کی معصومیت اور سادگی ہر اعتبار سے نفسِ مضمون کا حصّہ بنے۔ انھی وجوہات سے اس کتابچے کی ضرورت اور اتنے سلیقے سے اشاعت کا موقع فراہم ہوا ہے۔

''کریمائے سعدی'' کا پہلا شعر اردو میں اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے:

ہمارے حال پہ بخشش الٰہی کردے دھندے میں
مقید ہو گیا ہوں نفسِ امّارہ کے پھندے میں

اس شعر میں قافیے کے طور پہ 'دھندے' کا استعمال پہلی نظر میں عجیب لگتا ہے لیکن جیسے ہی شعر مکمل ہوتا ہے اور 'نفسِ امّارہ کے پھندے میں' ٹکڑا آنے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ شاعر نہ صرف یہ کہ مترجم ہے اور سعدی کا مزاج داں بلکہ بیان پر اُسے قدرت بھی حاصل ہے۔ اس کے پاس ایسی مشاقی ہے جس میں شاعری سے باہر کے لفظوں یا بے جان اور از کار رفتہ الفاظ سے وہ طلسمِ سامری کا کام لے لیتا ہے۔ کسی کتاب کے پہلے شعر میں ادب باہر کا قافیہ استعمال کرنا بڑے حوصلے کی بات ہے لیکن شاعرِ محترم نے یہ خطرہ مول لیا ہے کیوں کہ یہ قافیے عام انسانوں کی زبان اور بول چال سے لیے گئے ہیں۔ شاعر کو پتا ہے کہ وہ سعدی سے تعلقِ خاطر جوڑ رہا ہے تو کیوں وہ عوامی بولی ٹھولی کے لفظوں کا استعمال نہیں کرے؟

صابر القادری کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی مشق اور ریاضت میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر مضمون کے لیے اس کے پاس آسان یا حسبِ ضرورت مشکل: ہر طرح کے الفاظ صف باندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ فارسی زبان سے تعلق، عربی سے بھی واضح وابستگی اور مذہبی علوم سے حد درجہ قربت کی وجہ سے صابر القادری کی شاعری میں فکر و فلسفہ اور افادیت کے پہلو موج زن ہیں۔ اس دوران ایک

سچائی یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جناب صابر القادری کا ادبی مطالعہ اس قدر مستحکم نہیں ہے جس کی بنیاد پر اُن کی شاعری چراغ سے چراغ روشن کرنے کا آزمودہ فن سیکھ جاتی۔ انھی اسباب سے ان کے اشعار میں روانی، شگفتگی، شعریت اور ادبی حسن کی طلسم افزائیاں کم کم دکھائی دیتی ہیں۔ وہ تو شیخ سعدی کا صدقۂ جاریہ کہیے جس کی وجہ سے ان کے یہاں سادگی اور بھول پن سے ایک الگ طرح کی شاعرانہ سحر طرازی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے ہر جگہ شعریت کا بدل نہیں قرار دیا جاسکتا۔

صابر القادری چوں کہ کُل وقتی طور پر شاعر نہیں تھے، وہ ہمارے علمائے کرام کے اس سلسلے کی کڑی تھے جن میں ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی نعمانی جیسی شخصیات شامل ہیں جن کا بنیادی کام شاعری تو نہیں لیکن شعر گوئی کے فیوض و برکات سے وہ پورے طور پر واقف ہیں اور ضرورت پڑنے پر اس کا بھرپور استعمال بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری غالب، میر اور اقبال کی شاعری نہیں ہے اور نہ اساتذہ کی طرح فنّی رموز کی انھیں بھرپور پرکھ ہے۔ صابر القادری کی شاعری میں بہت ساری جگہوں پر فنّی اسقام ہیں۔ عروض اور زبان و بیان کی صحت والے کھڑا بچیں اس مختصر کتابچے میں بھی دیکھنے کو مل جائیں گی۔ مرحوم کو خدا نے اور مہلت دی ہوتی یا مذہبی کاموں سے انھیں ذرا فرصت ملتی تو عین ممکن ہے کہ وہ شعر و ادب کے کوچے میں مزید انضباط کے ساتھ موجود ہوتے لیکن اجل کے ہاتھوں انھیں ایسی کوئی مہلت نہیں مل سکی۔ صابر القادری کے اخلاف نے ان کی غیر مطبوعہ تحریروں کی اشاعت کا جو تہیہ کیا ہے، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری زبان کے ایک خاموش خدمت گار کی تخلیقات قوم کے سامنے بہ طور امانت پیش ہو سکیں گی۔ ان کا دیوان بھی مکمل شکل میں غیر مطبوعہ ہے۔ اللہ کرے وہ بھی زیورِ اشاعت سے مالا مال ہو سکے۔

اردو پر آج جو پیغمبری وقت آیا ہوا ہے، اس کا مقابلہ ہم اس طور پر بھی کر سکتے ہیں کہ اردو کی اُن جڑوں کی طرف توجہ کریں جنھیں تقریباً سو برس سے ہم نے الگ تھلگ چھوڑ دیا ہے یا جن میں کھاد اور پانی ڈالنا ہم نے ضروری نہیں سمجھا۔ یونی ورسٹیوں کے فروغ نے مدارسِ اسلامیہ سے اردو کو کاٹ کر رکھا اور ہم نے اپنی ایک بکھری پڑی آبادی کو نہ جانے کس جنون کے عالم میں کھو دیا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی جڑوں کو سوکھنے سے بچانے کے لیے مدارسِ اسلامیہ میں پھل پھول رہے اردو کے پودے کو پھر سے ہرا بھرا بنانے کی مہم تیز کی جائے۔ صابر القادری کی اس کتاب کو میں اسی سلسلے کی ایک کڑی مانتا ہوں۔ اس صورت میں اس کتابچے کو ہوا کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح محسوس کرتا ہوں اور اسی تناظر میں قارئین کرام سے پڑھنے کی سفارش کرتا ہوں۔

(2011)

حبیب تنویر کا رنگ منچ

جدید ہندستانی ڈرامے کی تاریخ میں حبیب تنویر کے امتیازات تسلیم شدہ ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی اور دوسری نسل سے ان کا بہ راہِ راست تعلق تھا۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی باضابطہ اعلا تعلیم (نامکمل) حاصل کی تھی۔ نظیر اکبر آبادی کی حیات و شخصیت کو بنیاد بنا کر انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 1954ء میں جو ڈراما پیش کیا، وہیں سے ایک نئے ڈراما نگار حبیب تنویر کا ورودِ مسعود ہوتا ہے جس کی ایک اضافی خصوصیت شاعری اور موسیقی سے گہرا لگاو ہے۔ اہلِ اردو کی ڈراموں سے بے رغبتی مشہور ہے جس کی وجہ سے کسی نازک لمحے میں حبیب تنویر چھتیس گڑھی اسلوب کی طرف مُڑ گئے۔ حالاں کہ وہ صدفی صد اردو کے ادیب تھے اور ہر آدمی کو معلوم ہے کہ وہ اپنے ڈراموں کے تمام کام اردو ہی میں کرتے رہے۔ انھوں نے اردو میں شعر کہنا کبھی نہیں چھوڑا۔ آخر وقت تک اردو شاعری ان کے اظہار کا ذریعہ رہی لیکن اردو والوں نے انھیں اپنی مادری زبان کی طرف لَوٹنے کی کبھی پُرزور دعوت نہیں دی۔ اس طرح وہ چھتیس گڑھی ہی کے ہو رہے۔

یہ کم تعجب کا مقام نہیں کہ حبیب تنویر کی خدمات پر اردو زبان میں کوئی بھرپور کتاب نہیں لکھی گئی۔ ہندی اور انگریزی زبانوں میں حبیب تنویر کے بارے میں حسبِ مختصر اور طویل تصانیف موجود ہیں لیکن ان کی مادری زبان کی گود ان کے اوصاف سے خالی ہے۔ چند یونی ورسٹیوں میں اردو والوں نے اُن پر تحقیق بھی کی تو محققین کے مکمل نتائج چھپ کر سامنے نہیں آئے۔ پچھلے دنوں جب دلّی کتاب گھر نے تقریباً پونے تین سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب 'حبیب تنویر کا رنگ منچ' عنوان سے پیش کی تو خوشی کے ساتھ تعجب کا احساس بھی ہوا۔ اس کتاب کے مرتب مشہور مترجم مسعودالحق صاحب ہیں جو 2012 میں کتاب کی اشاعت کے چھے مہینے کے اندر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ حبیب تنویر کے سلسلے سے اردو میں وہ کئی اور کتابیں تیار کر رہے تھے لیکن موت نے

اس کارِ جہاں کو مزید دراز نہ ہونے دیا۔ افسوس!

اس کتاب میں مرتب کے پیشِ لفظ کے علاوہ 31 مضامین شامل ہیں۔ انگریزی کے پندرہ مضامین تو خود مرتب کے اردو میں ترجمہ کیے ہوئے ہیں؛ صرف دو مضامین عبدالرشید اور اظہار احمد ندیم نے ہندی سے اردو میں منتقل کیے ہیں۔ مرتبِ کتاب نے آٹھ صفحات کا ایک مختصر سا پیشِ لفظ کتاب میں شامل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیب تنویر سے ان کی محبت اور دوستی کی میعاد کوئی چھے دہائیوں پر محیط تھی۔ مرتب نے کتاب میں اپنا جلوہ پیش کرنے کے بجائے موضوعِ کتاب کو اُبھارنے میں دل چسپی لی ہے۔ یوں تو یہ کتاب ڈھائی درجن مضامین کا ایسا مجموعہ ہے، جن کے لکھنے والے الگ الگ لوگ باگ ہیں لیکن اِن افراد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حبیب تنویر کے کارناموں سے پورے طور پر واقف ہیں۔ کتاب کو ترتیب دینے میں مسعودالحق صاحب نے ایسی محبت اور اپنائیت کا ثبوت پیش کیا ہے، جس سے ہر صفحہ اور ہر سطر سے حبیب تنویر کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ لمبی چوڑی تحقیقی کتابوں میں جتنے کام کا علمی مواد شامل ہوتا ہے، اس سے کئی گُنا زیادہ اور معتبر معلومات بہ ظاہر ان بکھرے مضامین میں سلسلے کے ساتھ سجادی گئی ہیں۔

یہ کتاب ایک بھرپور دانش ورانہ نقطۂ نظر کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے۔ جنھوں نے بھی قلم اٹھایا ہے، وہ سب اس موضوع کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ترجمہ اور ایڈیٹنگ میں مرتب نے اپنی ماہرانہ استعداد کا بھرپور استعمال کر کے اس کتاب کو مزید قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ اس کے اکثر لکھنے والے اپنی ادبی، سیاسی اور ڈرامائی وابستگی کی وجہ سے نمایاں شخصیات میں شامل ہیں۔ حقائق کا دہراو کم سے کم ہے۔ کسی لکھنے والے نے اپنی شخصیت نہیں اُبھاری ہے اور مقدور بھر کوشش کی ہے کہ حبیب تنویر کے کارناموں پر ہی گفتگو مرکوز ہو۔ اس کتاب کی یہ خاص خوبی ہے کہ اس میں حبیب تنویر ایک ساتھ ڈراما نگار، اداکار، ادیب، شاعر، مُفکّر، مصلح، عاشق، دوستوں کے دوست، سیاست داں اور عالمی امن کے پیغام بَر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ ہر پڑھنے والے کو حبیب تنویر کی شخصیت کا کوئی نیا پہلو لازماً اس کتاب میں ضرور مل جائے گا۔

فی زمانہ شخصیات پر ضخیم دستاویزی کتابیں تیار کرنے کا ایک عام چلن قائم ہو گیا ہے۔ پانچ سو اور ہزار صفحات کی کتابیں ایسے لوگوں کے سلسلے سے بھی سامنے آ جاتی ہیں جن کی اس قدر علمی اہمیت نہ تھی۔ کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے کہ اتنی ضخیم کتابیں تیار کرنے کے باوجود کام کی چیزیں کم شامل ہوئیں اور بہت سارے امور تشنہ رہ

گئے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف لوگوں نے ایک ہی طرح کی باتیں پیش کیں۔ کچھ رَٹی رَٹائی باتیں تو شامل ہو جاتی ہیں لیکن اصل موضوع یا شخصیت کے سلسلے سے گہری باتیں اور کارآمد نکتے آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔ مسعود الحق نے ''حبیب تنویر کا رنگ منچ'' ترتیب دیتے ہوئے ایک ذیلی عنوان قائم کیا: 'معاصرین اور دوستوں کے تاثرات'۔ یہ مرتب کا انکسار ہے ورنہ سب ڈراما اور ادب کے ماہرین کی تحریریں یہاں شامل کی گئی ہیں۔ پُرانے اور لائق لکھنے والے خود کو مصنف کی جگہ مؤلف کہتے تھے۔ اسی طرح مسعود الحق نے عہدِ حاضر کے بازاری انداز سے گریز کیا اور اپنی کتاب کے مضامین کو معاصرین اور دوستوں کے ''تاثرات'' کہہ کر بہ ظاہر یہ بتانا چاہا کہ یہ کوئی گہری اور تنقیدی و تحقیقی کتاب نہیں ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ حبیب تنویر کے سلسلے سے ایک مکمل دستاویز ہے۔ ان کی شخصیت اور کارناموں کے ہر پہلو کو مرتب نے اپنے زمانے کے ماہرین کے مضامین سے اس طرح نکال کر رکھ دیا ہے جیسے کوئی تحقیقی اور علمی مقالہ ترتیب دیا جا رہا ہو۔

اس کتاب کے مطالعے سے حبیب تنویر کی شخصیت اور کارناموں کی جو دنیا روشن ہوتی ہے، اس میں سب سے اہم وہ اطلاعات ہیں جن سے ہمیں حبیب تنویر کی مکمل ڈرامائی شخصیت کے عناصر معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہاں آغاز، تشکیلی دور، عروج، فکری بنیادیں اور کام کا مجموعی احتساب---- سب باتیں مرحلہ وار طریقے سے ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ سے کسی بھی قاری کو حبیب تنویر کے تدریجی ارتقا کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے تین مضامین سے ایک ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے معلوم ہو سکے کہ حبیب تنویر کا ڈرامائی ذہن کس طرح مرتب ہوا:

■ ''میں نے سوچا کہ آدمی کوئی قابلِ قدر کام اُس وقت تک کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنی جڑوں تک نہیں جاتا ہے اور اپنی روایات کی تاویل نہیں کرتا ہے اور انھیں جدید ترین اور معاصر پیغامات کی ترسیل و ابلاغ کا ذریعہ نہیں بناتا ہے۔ اس کا مطلب ہوا روایات میں تخلیقی مداخلت۔'' [جاوید ملک: جدیدیت کی تشکیلِ نو، ص:٢٦]

■ ''یورپ میں گزارے ہوئے دنوں نے انھیں خود اپنے ثقافتی اور سماجی خلقیے کے حوالے سے کام کرنے کی اہمیت اور ضرورت کا یقین دلا دیا اور ان کے دل

میں رائج شہری تھیٹر کی طرف سے کسی قدر متنفر پیدا کر دیا۔ یہ تھیٹر انھیں محض نقل لگتا تھا جس پر کلونیل نقطۂ نظر اور کلونیل سوچ کا بھاری بوجھ تھا۔ اپنے چند معاصرین کے برعکس، بریختین ہونے کا مطلب ان کے نزدیک اور زیادہ ہندستانی ہونا تھا۔''
[سلیم عارف: کرشن کال؛ ص:۷۰]

■ ''بریخت کے اثر نے حبیب کو وہ سب بھلانے پر مجبور کر دیا جو انھوں نے انگلستان میں سیکھا تھا۔ بریخت کا یہ قول کہ تھیٹر کو تفریح ہونا چاہیے، بالکل ویسے جس طرح میوزک ہال یا فٹ بال کا کھیل دل چسپ ہوتا ہے، حبیب کے جی سے لگ گیا۔'' [شمع زیدی: چوتھی دیوار سے پرے؛ ص:۷۸]

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حبیب تنویر نے لندن کے رائل اکیڈمی آف ڈرامینک آرٹس (RADA) میں ڈرامے کی اشرافیت کی جو تعلیم حاصل کی تھی، اسے یورپ میں رہتے ہوئے بریخت کے حلقے میں انھوں نے مٹا دیا اور نئے ثقافتی خوابوں کی تعبیر تلاش کرتے ہوئے اپنے ملک ہندستان واپس ہوئے اور اسی سے ایک نیا ڈرامائی تصور پیدا ہوا۔ اس نئے ڈرامے میں سیاست، ارضیت اور زبان کا اَن گڑھ پن سب کچھ ہے۔ یہی رفتہ رفتہ حبیب تنویر کے آرٹ کے عناصرِ ترکیبی بن گئے۔ چند مقالہ نگاروں کے اس سلسلے سے مختصر تاثرات ملاحظہ کیجیے:

■ ''اس کے بعد انھوں نے بائیں بازو کے تھیٹر میں سیکھے ہوئے فنون میں ناصحانہ اور معلمانہ طریقے کے استعمال کو چھوڑا اور اس کے بجائے استعاروں، کنایوں اور بالواسطہ طریقوں سے کام کرنا شروع کیا اور دیکھنے والوں کو لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں خود اپنے سیاسی نتائج اخذ کرنے کا موقع فراہم کیا۔'' [سدانند مینن: تھیٹر میں 'سیاسی' کی تجدید؛ ص:۶۶]

■ ''تنویر ایک عالمی شہری تھے اور دنیا سے وہ چیزیں مستعار بھی لیتے تھے، پڑھتے تھے اور بلا تکلف اثرات قبول کرتے تھے مگر وہ ایک طویل اور سخت تخلیقی جدوجہد کے بعد چھتیس گڑھ کے ہو گئے۔'' [سدھنوا دیش پانڈے: حبیب تنویر اور چھتیس گڑھ؛ ص:۵۰]

■ ''حبیب تنویر کہا کرتے تھے کہ آرٹ کو اگر زندہ رہنا ہے تو اسے روایت شکن اور انقلابی ہونا ہوگا۔'' [مسعودالحق: پیشِ لفظ،ص:۱۳]

■ ''وہ ایک ناراض آدمی تھے مگر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی رہتی تھی۔'' [نندیتا داس: حبیب تنویر اور ان کے اداکاروں کے ساتھ ریہرسل،ص:۱۲۶]

یہ ڈرامائی تصورات آج زیادہ انوکھے نہیں معلوم ہوں گے لیکن ساٹھ سال قبل کے ہندستانی تھیٹر کی فکری بے سمتی کو نگاہ میں رکھا جائے تو پتا چل جائے گا کہ حبیب تنویر کس طرح ہمارے ملک میں تھیٹر کی ایک انقلابی دنیا خلق کررہے تھے۔ صرف سماجی انقلاب پر قناعت کرنے والے افراد کے لیے بھی اکثر حبیب تنویر اس لیے ناپسندیدہ ہو جاتے تھے کیوں کہ وہ تہذیب وثقافت کے ہر منچ پر اس آزادی اور انقلاب کی دستک سننا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں ڈرامائی آرٹ میں ایک سُلجھا ہوا ارتقا نظر آتا ہے۔ حبیب تنویر نے مستقبل کا تھیٹر تلاش کیا اور اس کے نقش ونگار متعین کیے۔ مسعودالحق نے اپنی کتاب میں حبیب تنویر کے کارناموں کا مجموعی احتساب بھی شامل کیا ہے۔ پیش ہیں چند اقتباسات:

■ ''انھیں بالآخر اپنے کام کو دو مخصوص علاقوں میں قائم کرنا تھا۔ ایک علاقہ تھا جس میں انھیں ایک نئے ایمائی اور علامتی مواد کے لیے جگہ نکالنی تھی جو لوک گیتوں اور علاقائی ذہانت اور علاقائی حسِ مزاح میں احتجاج کی روح کی شکل میں پنہاں تھا اور مزاحیہ اور شوخ وگستاخ پرفارمنس میں بڑے واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔ دوسرا علاقہ اسٹیج پر پردے کے سامنے کی جگہ کو رد کرکے ایک زیادہ بہتی ہوئی، زیادہ اُبھری تھیٹریکل جگہ بنانے کا تھا۔'' [سدانند مینن: حوالۂ سابق،ص:۶۱]

■ ''حبیب تنویر کا کمال اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ڈرامے کی تاریخ کو لسانی سخت گیری، تعصب اور تنگ نظری کے دائرے سے باہر نکالا۔ زبان کے ساتھ بولیوں کی اہمیت کا احساس عام کیا اور معاشرتی نیز فکری سطح پر بھی اردو کلچر اور اس کلچر کو اساس مہیا کرنے والی مقامی، مادّی اور زمینی سچائیوں میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی۔'' [شمیم حنفی: حبیب تنویر: ایک متمدن آدی باسی کا ادھورا خاکہ،ص:۱۶۳]

■ ''ہم نے ٹیم ورک یا جماعتی کام میں کیا لطف ہے، حبیب سے سیکھا۔ یہ بھی جانا کہ وہ ایک خوش طبع، چنچل، شائستہ، مہذب اور باذوق آدمی ہیں۔ بالکل ہماری طرح جو اُن کی طرح ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔'' [راجیو سیٹھی: ایک ٹجنڈ، ص:۹۵]

■ ''حبیب تنویر نے تھیٹر کے اپنے شوق اور اپنے جنون کو سیکولر اور روشن خیال انداز پر اپنے ناقابلِ مصالحت عقیدوں اور سماجی تشویشات سے اپنے زندگی بھر کے عہدِ وفا کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔'' [شانتا گوکھلے: حبیب تنویر...... سرتاپا تھیٹر، ص:۵۷]

■ ''انھوں نے مذہب، سیاست اور تاریخ کو سمجھا اور سنجیدگی کے ساتھ ان میں ملوث رہے۔ ان موضوعات پر جب انھوں نے اپنے ناٹکوں کی تخلیق کی تو اُن کی چھٹیس گڑھی میں ایک ہمہ گیر کُل ہند لہر کا احساس ہوا۔ وہ چاہے کوئی قدیم سنسکرت کلاسک ہو، چاہے یوروپین لوک ہو، چاہے آج کا ماڈرن۔ حبیب کے ناٹکوں کی تخلیق ہمیشہ حال کے حوالے سے ہوئی۔ ان کے ڈراموں میں ہمیشہ ایک مخصوص روشن خیال اور انسان دوست فضا ہوتی ہے۔'' [ایم۔ کے۔ رینا: نشاۃ الثانیہ کی بصیرت رکھنے والا ایک فن کار، ص:۱۵]

حبیب تنویر کا ذکر ہو اور ان کے ڈراموں بالخصوص 'آگرہ بازار' اور 'چرن داس چور' کی بات پہلی سانس میں ہی نہ آجائے، یہ ممکن نہیں۔ یہ کتاب یوں تو شخصیات کے تاثرات پر مبنی ہے لیکن اس میں بھی ان دونوں ڈراموں کے حوالے سے حبیب تنویر کے ڈرامائی ذہن میں مقالہ نگاروں نے جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں تین مختصر اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

■ ''میں نہیں سمجھتا کہ معاصر تھیٹر میں کسی ڈائرکٹر نے وہ مقبولیت حاصل کی جو مثال کے طور پر حبیب تنویر کے ناٹک ''چرن داس چور'' کے حصے میں لکھی تھی۔''
[پرسنا: حبیب تنویر کی حقیقی اہمیت، ص:۳۸]

■ ''اور پھر یوں ہوا کہ میں نے ''چرن داس چور'' دیکھا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ اس ناٹک میں وہ کون سی چیز تھی جس نے میرے حواس پر جادو کر دیا

تھا؟ کیا وہ اسکرپٹ تھا؟ کیا وہ چھتیس گڑھی ایکٹروں کا پرفارمنس تھا؟ کیا وہ ڈائریکشن تھی؟ کیا وہ میوزک تھا؟ پتا نہیں کیا تھا۔ مگر آج تک ''چرن داس چور'' کے طلسم سے باہر نہیں آسکا ہوں۔ اس دن میں نے حبیب صاحب کو ایک نئی روشنی میں دیکھا۔ ناٹک تو میں نے بہت سے دیکھے تھے۔ پڑھے بھی تھے مگر تب تک یہ راز معلوم نہیں ہوا تھا کہ اچھا ناٹک صرف ایک ناٹک نہیں ہوتا، وہ ایک احساس ہوتا ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔'' [جاوید صدیقی: اپنے کامریڈ حبیب، ص: ۱۹۲]

■ ''آگرہ بازار'' نے بنیادی طور پر ایک بالکل مختلف تجربہ کرایا۔ ہیئت کے اعتبار سے بھی اور مواد کے لحاظ سے بھی بلکہ یہ ہر اس چیز سے مختلف تھا جو شہر کے باسیوں نے ابھی تک دیکھی تھی..... ناٹک کے دو خصوصی پہلو تھے جو تھیٹر میں تنویر کے کاموں کی شناخت تھے۔ ایک اَن گڑھ عوامی کلچر سے تنویر کی فن کارانہ اور نظریاتی رغبت اور دوسرا پہلو سنگیت اور شاعری کو ڈراموں میں شامل کرنے کا شوق۔ غیر ضروری تزئین و آرائش کی خاطر نہیں بلکہ بریخت کی طرح ایکشن کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے۔'' [جاوید ملک: حوالۂ سابق، ص: ۲۵-۲۴]

حبیب تنویر نے بریخت اور جرمن تھیٹر سے جو کچھ سیکھا، اسے انھوں نے تھیٹر کی ایک نئی زبان تشکیل کرنے میں بہ خوبی استعمال کیا۔ حبیب تنویر ڈرامے کی سطح پر آزمائی جانے والی عرف عام میں ہماری زبانوں کی کارگردگی سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ ڈرامے کی ایک ایسی زبان کی تلاش میں تھے جو ہمارے روایتی لسانی ڈھانچے کو تہس نہس کردے۔ ایک ترسیلی زبان کا یہ سودا لیے وہ لندن، برلن سب جگہ گئے لیکن زبان انھوں نے سیکھی عام لوگوں کے بیچ۔ اسے اردو، ہندی اور چھتیس گڑھی سب ناموں سے پہچانا گیا۔ یہی حبیب تنویر کا مخصوص اسلوب قرار پایا۔ بہ قول حبیب تنویر:

■ ''میں بولیوں کی طرف کھنچا'' انھوں نے کہا تھا: ''ان کے متمول کی وجہ سے..... ائرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ..... میں اس کا ہندی متبادل دہرا بھی نہیں سکتا ہوں۔ یہ ایک بہت طویل لفظ ہے۔ کچھ یہ صورت حال اردو میں بھی ہے۔ مگر بمبئی کے قلی نے اسے

صرف ''ٹھنڈی گاڑی'' کہا.....زبان ہمہ وقت بنتی رہتی ہے۔اسے وہ لوگ جانتے ہیں جو اسے استعمال کرتے ہیں۔جنھیں اس کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس سے اپنی روزی کماتے ہیں.....۔'' [انجم کنیال: چرن داس چور اور 'ہرما' کا ترجمہ،ص:۱۰۴]

اس کتاب کے مطالعے سے حبیب تنویر کی ایک عالمی شخصیت ابھرتی ہے۔وہ اپنے تصورات میں بین الاقوامی ذہن کے یوں ہی دکھائی نہیں دیتے۔انھوں نے یورپ اور امریکا میں وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل کر جو تھیٹر کیے اور سیکھنے سکھانے کے عمل میں شامل رہے، اس سے دنیا کے مختلف ملکوں کے ڈرامے سے متعلق شخصیات کا ان سے گہرا ربط پیدا ہوا۔مسعود الحق نے اس کتاب میں روزی اور نین سی وینڈر رہولڈ جیسی دو خواتین کے مختصر مضامین اور تاثرات شامل کر کے حبیب شناسی کا ایک نیا زاویہ پیش کیا ہے۔اس سے ان کی شخصیت ایک طلسم خانہ معلوم ہوتی ہے۔ان دونوں مضامین کے مطالعے سے حبیب تنویر کی شخصیت کی محبوبیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ان کے مضامین سے دو مختصر اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

■ ''آپ کو جن لوگوں سے محبت ہوتی ہے، وہ ہمیشہ نہیں رہتے۔جیسا کہ البرٹ کامیو نے کہا تھا: ''کوئی موت خوش گوار نہیں ہوتی'' مگر آدمی جس راہ پر چلتا ہے، اس کے بارے میں وہ سوچ تو سکتا ہے۔ایک اچھی اور خوش گوار موت کے لیے آدمی کو کس طرح زندگی گزارنی ہوگی۔ حبیب نے ایک پُر شکوہ اور اچھی زندگی پائی۔اس کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اسے اپنی شرطوں پر گزارا۔اور اسی سبب سے انھوں نے اپنے وجود سے ہمیں زیادہ متمول چھوڑا۔کاش میں انھیں بچا سکتی۔انھیں ان کے آخری تین دنوں اور گھنٹوں میں ہونے والی تمام تکلیفوں اور ان کے تخلیے میں ہونے والی مداخلتوں سے انھیں محفوظ رکھ سکتی۔میں ایسا نہیں کر سکی۔کاش ہم میں سے وہ لوگ جو انھیں جانتے تھے اور اُن سے محبت کرتے تھے، وہ اس طرح بیچ میں آ سکتے کہ وہ غیر ضروری اذیت جھیلے بغیر اس کرۂ ارض کو الوداع کہہ سکتے۔ہم یہ نہیں کر سکے۔'' [نینسی وینڈر رہولڈ: حبیب تنویر سے میری دوستی،ص:۱۱۸]

■ ''برلن میں انھیں ایسے لوگ ملے جو زندگی بھر اُن کے دوست رہیں

گے، ہیننگ اور کوراشیروڈر۔ خصوصاً ہیننگ۔ حبیب اور ہیننگ نے بے شمار شب و روز باتوں میں بتا دیے۔ کیسے؟ ہیننگ انگریزی نہیں جانتی تھی مگر ہیننگ ایک موسیقار تھی، ایک کمپوزر تھی۔ میرا خیال ہے کہ دونوں بس ساتھ بیٹھتے، اپنے اپنے پائپ پیتے، ریڈ وائن پیتے، گاتے، ایک دوسرے کے لیے مختلف دھنیں گنگناتے۔ بھوپال میں حبیب کے بیڈروم میں مونیکا اور حبیب کی شادی کی تصویر کے ساتھ ہیننگ کا ایک پورٹریٹ ہمیشہ لٹکا رہتا ہے۔'' [روزی، ماریا میگ ڈگرا: حبیب کی یاد آتی ہے: ص:۸۶]

ایسی کتابوں میں اردو کے قارئین یہ توقع کرتے ہوں گے کہ حبیب تنویر کا کم از کم ایک خاکہ ضرور شامل کتاب ہو۔ فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کا ایسا خاکہ لکھا جس کے سبب ہر پڑھنے والا اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ کسی شخصیت کا اسی طرح چلتا پھرتا نقش کاغذ پر قائم کر دیا جائے۔ مسعود الحق نے حبیب تنویر کا اس انداز کا خاکہ تو شامل نہیں کیا لیکن اس کتاب میں حبیب تنویر کی جادوئی شخصیت کی تہیں کھولنے کے لیے مختلف مضمون نگاروں نے الگ الگ موقعے سے ان کے ایسے دل پذیر مرقعے پیش کر دیے ہیں جن سے خاکے کا حسن اور بے تکلف فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ خاکہ نگاری کا اولین نقش تو مرتب کتاب سے حبیب تنویر کی پہلی ملاقات میں ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔ واقعہ جس قدر انوکھا اور دل پذیر ہے، بیان اس سے کسی درجہ کم لبھاونا نہیں۔ ملاحظہ کیجیے ایک اقتباس اور اس بات پر غور کیجیے کہ یہ آخر خاکہ کیوں کر نہیں ہے:

''1950ء تھا اور مہینہ غالباً جون تھا۔ اس زمانے میں میرے بڑے بھائی۔۔ مکتبہ جامعہ کی بمبئی شاخ کے منیجر بن چکے تھے۔۔ میں بمبئی پہنچ گیا۔۔ ایک دن بھائی جان نے بمبئی کے سمندر کی سیر کا پروگرام بنایا۔۔ رات خوب صورت تھی۔ چاندنی رات تھی۔ کشتی میں بیٹھنے کے بعد ہم سے دور ہوتی ہوئی شہر کی زرق برق روشنیوں نے ماحول کو کچھ زیادہ ہی دل فریب بنا دیا تھا۔۔ چہار طرف چاندنی کی سفید چادر تھی اور ہم لوگ ایک سحر آگیں فضا میں، اور دھیرے دھیرے بہتی ہوئی ہوا کی خوش گوار خنکی میں سرشار، ساحل سے دور، سمندر کی گہرائیوں کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ اچانک سمندر کی پُرسکون سطح پر بجتی ہوئی ایک آواز آئی۔۔ کنارے سے دور، محیط

خاموشی کو توڑتی ہوئی آواز سے ہمیں حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ حیرت اس پر کہ ہمارے جیسے دیوانے اور بھی ہیں مگر ہے یہ کون؟۔۔ آواز کسی کے گانے کی تھی۔۔ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ بھائی جان نے کہا: ''ہو نہ ہو، یہ حبیب تنویر ہیں۔ اس وقت اور اتنی رات گئے ان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔''

کشتی والے سے کہا گیا کہ وہ ہماری کشتی کو اُسی آواز کی طرف لے چلے۔

آواز قریب ہوتی گئی۔۔ اس کشتی میں واقعی حبیب تنویر ہی تھے۔ کشتیاں قریب لائی گئیں، روکی گئیں اور پھر بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس اتفاقیہ ملاقات کا لطف بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بھائی جان نے حبیب سے میرا تعارف کرایا۔ پھر دونوں کشتیاں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ گفتگو ہوتی رہی، گانے سُنے اور سُنائے جاتے رہے۔ چاندنی رات، سمندر، خاموشی، شہرِ بمبئی کے قریب آتی ہوئی روشنیاں۔ رات کے تقریباً دو بجے ہم لوگ کنارے پر اُترے۔ پُر لطف سیر ختم ہوئی۔ ہم نے ایک دوسرے سے رخصت لی۔ حبیب تنویر سے یہ میرا پہلا تعارف تھا'' [مسعود الحق: حوالہ سابق، ص:۹-۸]

اس پیش بندی پر ہی خاکہ نگاری کا سلسلہ تمام نہیں ہوتا۔ مختلف مضمون نگاروں نے اپنے طور پر حبیب تنویر کو جیسے دیکھا، اسی طرح اور اسی انوکھے پن کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اس سے اس کتاب کے مطالعے کے لیے مزید رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تصویریں بلاشبہ حبیب تنویر سے محبت اور عقیدت کرنے والے لوگوں نے سجائی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایک مکمل خاکے کے بکھرے موتی کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کے جانے اَن جانے چند پہلوؤں سے ذیل کے کچھ اقتباسات کے ذریعہ آپ بھی لطف اندوز ہوں:

■ ''یہ ناقابلِ فراموش خوب صورت آدمی مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ "HIP" (اُس زمانے میں یہ لفظ...... Cool کا مترادف سمجھا جاتا تھا) شائستہ، خوش وضع، سبز قمیص اور آنکھوں کے رنگ کی تلافی کرتے ہوئے سُرخی مائل بھورے رنگ کی کارڈرائے کی پتلون پہنے ہوئے، گھنگھریالے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے یا پھر سر پر نرم نمدے کی ٹوپی۔ تمباکو کے پاؤچ میں کچھ ٹٹولتے ہوئے،

اپنے پائپ کو کنجی سے کھودتے ہوئے۔'' [راجیو سیٹھی: حوالۂ سابق، ص:۹۴]

■ ''ذوالفقار بخاری صاحب نے اپنی آپ بیتی میں حافظ کی غزلوں سے حبیب صاحب کے شغف کا تذکرہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب وہ اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ بڑے بخاری صاحب اور فیض صاحب کے سامنے حافظ کی غزلیں سناتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا اور پطرس کہا کرتے تھے کہ شعر حافظ کے ہوں اور ترنم حبیب تنویر کا تو ایسا لگتا ہے کہ آسمان سے انوار کی بارش ہو رہی ہے۔'' [شمیم حنفی: حوالۂ سابق، ص:۱۶۶]

■ ''حبیب صاحب کی طبیعت میں تحمل اور اشتعال کے رنگ عجب طرح سے باہم مل گئے تھے۔ اپنی تڑپ کو وہ جس صبر اور سلیقے کے ساتھ باندھے رکھتے تھے، وہ اپنی جگہ؛ دوسری طرف معاملہ اپنے تعہد اور اپنے ضمیر کو بچائے رکھنے کا ہو، اور آزمائش کی گھڑی آجائے، تو وہ آن کی آن میں شعلے کی طرح بھڑک اُٹھتے تھے۔ ان کے بیش تر ڈرامے دراصل اسی اخلاقی آزادی کے احساس اور ضمیر کی طہارت کا اظہار ہیں۔'' [شمیم حنفی: حوالۂ سابق، ص:۱۶۵]

■ ''افسردہ اور سریلی چھتیس گڑھی بولی میں، وہاں کے خوب صورت لوک گیت اس سے سُن کر آدمی کا دل جیسے پگھل جاتا تھا۔ روشنی کی موت (Dying of the light) اور خود اپنی فنا کا انھیں دکھ تھا۔ ایک ایسے جسم پر، جو اَب ان کا ہمیشہ ساتھ نہیں دیتا، بڑھاپے کی ناانصافیوں پر وہ جھنجھلاتے تھے۔...۱۵ رمئی ۲۰۰۹ء کو جب وہ اسپتال میں داخل کیے گئے، اس سے کئی دن پہلے ہم نے باتیں کی تھیں۔ ان کی پہلے والی گمبھیر اور بلند آہنگ آواز کمھلائی ہوئی اور مدّھم تھی۔ انھیں سانس لینے میں بڑی دشواری تھی، اور جملوں کے بیچ میں طویل وقفے تھے۔ میں بہت پریشان ہوگئی۔ میں نے کہا: اچھا حبیب، خدا حافظ۔'' [نینسی وینڈر ہولڈ: حوالۂ سابق، ص:۱۱۷]

اہالیانِ اردو کے بیچ اس کتاب کی سب سے زیادہ اہمیت اس وجہ سے قائم ہوتی ہے کیوں کہ اس میں کم از کم آدھا حصّہ انگریزی اور ہندی زبانوں میں لکھے گئے مضامین کے اردو ترجمے سے منتقل ہوا ہے۔ پندرہ

مضامین مرتب نے خود انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے ہیں جو ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہیں۔ مرتب کتاب کی اپنی مادری زبان پر ایسی گرفت ہے کہ وہ انگریزی سے صرف ترجمہ نہیں کرتا بلکہ ہماری زبان جدید علمی تقاضوں سے لیس ہو کر اپنے آپ وہاں پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں انگریزی دانی تو بڑھتی جا رہی ہے لیکن ایسے نفیس ترجمہ کرنے والے چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ذیل کے جملے ملاحظہ کیجیے اور مسعودالحق کے بہترین مترجم ہونے کی داد دیجیے:

- ''مونیکا، نگین کی ماں، ایک طرف اپنی ذکاوت اور پیش بینی سے ہمہ وقت شکست وریخت کی شکار دنیا میں چیزوں کو مجتمع اور حالات کو قابو میں رکھتی ہیں۔ دوسری طرف حبیب، تخلیقی افراتفری کے ماحول میں سکون اور عزم کے ساتھ کاموں میں مگن رہتے ہیں۔'' [راجیو سیٹھی: حوالۂ سابق، ص:۹۰]
- ''نیا تھیٹر نے ڈرامے کی ایک بے ساختہ اور برجستہ شیلی کی تخلیق میں مدد کرنے کے لیے مختلف زبان بولنے والے دیہی اور شہری فن کاروں کے ساتھ کام کیا۔ کیا یہ ایک نئی ملواں ہندستانی ہانڈی تھی، کُل ہند کٹھالی میں پڑی ہوئی ایک کھچڑی؟ یا یہ ایک بالکل مختلف اور متنوع ہندستان تھا جو اپنے ناگزیر اختلافات سے نبرد آزما تھا اور اپنی خطرات میں گھری ہوئی تکثیریت (Plurality) کی زندگی اور اس کے استحکام کی نوید دے رہا تھا؟'' [راجیو سیٹھی: حوالۂ سابق، ص:۹۸-۹۷]
- ''یہ اکثر اسٹیج پر ہونے والی سرگرمیوں کی تاویلات میں مزید تہیں یا مزید ابہام شامل کرتے ہیں۔ لہٰذا لے اور سُر جیسی گیتوں کی خصوصیات سے محروم ہوئے بغیر، میں نے کسی نہ کسی طرح اُن میں پنہاں پیغامات کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔ میں نے مقامی استعاروں کے متبادل کی تلاش وجستجو کی۔ گیتوں کے چلبلے پن، اس کی مزیداریوں اور اس کی بھرپور توانائیوں کو باقی رکھنے کی سعی کی۔'' [انجم کنیال: حوالۂ سابق، ص:۱۰۶]

یہ کتاب مسعودالحق صاحب نے اپنی عمر کی آٹھویں دہائی میں ترتیب دی۔ کتاب کے ایک ایک

صفحے سے تجربہ اور پختہ کاری جھلک رہی ہے۔ پیشِ لفظ کے علاوہ مسعودالحق نے کہیں اپنی دوستی کا دم نہیں بھرا۔ شمیم حنفی کے مضمون کے علاوہ شاید ہی مرتب کے حبیب تنویر سے تعلقات کے بارے میں دو چار الفاظ شامل ہوئے ہوں۔ خود کو پوشیدہ رکھ کر اپنے موضوع کو زیادہ روشن کرنے کا صوفیانہ ہنر مسعودالحق کا وصفِ خاص ہے۔ بہت ایمان داری سے ہر مضمون کی اشاعتِ اوّل کی تفصیل بتائی۔ رسالے یا کتاب کا فرداً فرداً ذکر کر کے شکریہ ادا کیا۔ آج کے مرتبین اتنا علمی تکلف اور تردد کہاں پالتے ہیں؟ اُن کا بس چلے تو دوسروں کے مضامین سے اپنے نام کی ضخیم کتابیں تیار کر لیں؛ اپنا نام تو شاہ سرخیوں میں ہو لیکن اصل لکھنے والوں کے نام خفی قلم سے لکھے جائیں۔ وہ مضامین کس کتاب سے لیے گئے، اس کی صراحت بھی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ مسعودالحق صاحب نے اس کے برخلاف ایک ایک مضمون نگار کا واضح انداز میں تعارف کرایا ہے۔ تعارف میں بھی یہ اہتمام رکھا کہ مضمون کے آغاز میں زیادہ روشن انداز میں تعارف لکھا جائے۔ اردو کے ماحول میں جو لوگ زیادہ جانے پہچانے ہیں، صرف انھی لوگوں کا الگ سے تعارف نہیں کرایا گیا ہے، جیسے: شمیم حنفی، زبیر رضوی، جاوید صدیقی، انیس اعظمی، اقبال مجید، محمد کاظم وغیرہ۔

یہ کتاب 'مونتاژ' (Montage) اسلوب میں تیار ہوئی ہے۔ الگ الگ زاویے سے وقت کے مرکز پر ٹھہری ہوئی زندگی کا مطالعہ۔ مصوّروں کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ ایک بار آنکھ کھلی اور تصویر کے سب رنگ اور زاویے نگاہوں میں قید ہو گئے۔ اسی لیے آنکھ والے کو کبھی کبھی کوئی تصویر حیرت انگیز طور پر اپنے قابو میں کر لیتی ہے۔ لیکن مصوّری کی تکنیک آزماتے ہوئے مسعودالحق نے اس کتاب میں ہر صفحے پر ایک نئے حبیب تنویر کو پیش کیا ہے۔ سب تصویریں اُسی طرح سجی دھجی نہیں ہیں جیسے اکثر حبیب تنویر دکھائی دیتے تھے اور جیسے سگار سے دھواں اُڑاتے حبیب تنویر کی تصویر کتاب کے سرورق پر سجائی گئی ہے۔ کچھ کھُردری آوازیں اور کچھ کٹے پھٹے اوراق بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کچھ سوال اور کچھ ادھورے جواب بھی جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ سب کچھ پسندیدہ ہو، ایسا بھی نہیں ہے، لیکن مرتب کو 'مونتاژ' کا تخلیقی ہنر معلوم ہے۔ اس لیے حبیب تنویر کی خوشبو اور جادو ہر آنکھ اور دل والے کے لیے یہاں حاضر ہے۔ اس کتاب سے اردو میں حبیب شناسی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگا، اس کا مجھے یقین ہے۔ خدا کرے، حبیب تنویر کے سلسلے سے مسعودالحق صاحب کے باقی ماندہ کام اُن کے پس ماندگان جلد از جلد منظرِ عام پر لے آئیں۔

(2013)

مولانا آزاد کا قیامِ رانچی: احوال و آثار

اردو میں بہت کم ایسی شخصیات ہیں جن کی حیات اور ادبی کارگزاریوں کی جزئیات قلم بند کرنے کی سعی کی گئی ہو۔ ہمارے یہاں عمومی مطالعات کا رواج اتنا تیز ہے کہ کبھی یہی چاہتے ہیں کہ ایک موقعے سے یا ایک جلد میں ہی گفتگو تمام کر لی جائے اور نتائج کا اعلان ہو جائے۔ اس سہل پسندی کی وجہ سے ہی ہمارے بعض بڑے اصحابِ قلم کی حیات اور خدمات کے تعلق سے بہت کم مواد منظرِ عام پر آ سکا۔ جب کہ ترقی یافتہ اقوام کی طرح ہماری یہ روش ہونی چاہیے تھی کہ اُن کی زندگی اور تخلیقات کے معمولی سے معمولی حصوں اور ادوار پر بھی معلومات کے دفاتر جمع کر دیے جاتے۔ اس کے بعد ہی تاریخ کے مشاہدین کو بتایا جا سکتا تھا کہ ہم نے اپنے اسلاف کے ستاروں اور ذرّوں کو بھی محفوظ رکھا ہے اور ان کا بہترین وارث ہونے کا ہمارا حق محض دعوا نہیں ہے۔

غالب، اقبال اور ابوالکلام آزاد کے سلسلے سے اردو اور دوسری زبانوں میں جو کام ہندو پاک میں بڑے پیمانے پر ہوئے ہیں، اُن سے پتا چلتا ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کی یادگاریں محفوظ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، بلکہ ان تینوں اشخاص کی زندگی یا ادبی کارناموں کے شاید ہی کسی پہلو پر کئی کئی جلدیں نہیں لکھی گئی ہوں۔ بعض اوقات تو ایک ایک موضوع کو مختلف محققین و ناقدین نے علاحدہ زاویے سے بھی دیکھا ہے۔ ہر چند کہ ایسے کاموں میں تکرار اور بے وجہ کا معتقدانہ انداز فطری طور پر بہت ہے، پھر بھی تصانیف کی بھیڑ میں ایسے وقیع کارنامے بہ آسانی مل جاتے ہیں جن سے علمی کاموں کا وقار بلند ہوتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب، اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح میر، نظیر، میر امن، محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی اور دوسرے

بڑے تخلیق کاروں پر بھی ان کے شایانِ شان تحقیقی و تنقیدی کام انجام دیے جائیں اور اُن کی حیات اور ادبی خدمات کی چھوٹی بڑی تمام شقوں کو جمع کر دیا جائے۔

جمشید قمر کی نئی کتاب 'مولانا آزاد کا قیامِ رانچی: احوال و آثار' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے پیش لفظ میں بتایا گیا ہے: 'کتاب میں مولانا آزاد کے قیامِ رانچی سے تعلق رکھنے والی چھوٹی بڑی، اہم اور ضروری تحریروں کو اس طور سے منتخب و مرتب کیا گیا ہے کہ یہ اب اس موضوع پر کام کرنے کا ایک اہم ماخذ بھی بن گیا ہے۔' مولانا آزاد تقریباً پونے چار برس تک رانچی میں نظر بند رہے۔ مولانا کے اس دورِ اقامت کے سلسلے سے اِدھر اُدھر تھوڑی بہت معلومات تو مل جاتی ہیں لیکن اس موضوع پر بہ تفصیل شاید ہی لکھا گیا ہو۔ اس کتاب کے پس ورق پر مولانا امداد صابری کی کتاب سے جو اقتباس اخذ کیا گیا ہے، اس میں بھی رانچی اقامت کی جزئیات کو تاریخ کے نہاں خانوں سے باہر لانے کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بہت ساری باتیں اور اطلاعات پہلی بار سامنے آئی ہیں، اس لیے جمشید قمر کی اس تحریر کو قیامِ رانچی کے لیے اوّلین مفصل اور قابلِ اعتماد دستاویز تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

پیش لفظ 'حرفِ آغاز' اور 'کچھ اس کتاب کے بارے میں' یعنی آغاز سے صفحہ ۱۸ تک افتتاحیہ رنگ ہے۔ حرفِ آغاز میں معلق طریقے سے مولانا کے تعلیمی نظریات پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں نہ واضح طور پر رانچی کے قیام سے اس موضوع کے تعلق کی تفصیل آسکی ہے اور نہ ہی کھل کر مولانا کے نظریۂ تعلیم پر لکھا گیا ہے۔ چھے صفحے کی اس تحریر کا اختتامیہ بھی نہیں لکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بات بیچ میں ہی رُک گئی۔ آئندہ اشاعت میں مصنف رمرتب اس مضمون کو جامع اور مکمل صورت میں ہی شامل کریں تو مناسب ہوگا۔

افتتاحیہ حصے کے بعد 'احوال' کے عنوان سے محمد اسماعیل صاحب محمدی، سید سلیمان ندوی، فضل الدین احمد، ابوالحسام نعمانی، مولانا ابو محمد مصلح اور سہیل عظیم آبادی کی کتابوں رمضامین سے ضروری حصے نکال کر جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہاں رانچی اور مولانا آزاد کا تعلق مرکزی موضوع ہے۔ خدا بخش جرنل میں شائع ہوئی محمد حبیب کی مرتبہ تصنیف 'یادِ آزاد' جوانوں کی یادداشتوں پر مشتمل ہے، اس کے اجزا کوئی ۱۸ صفحات میں پھیلے ہیں۔ اس میں بھی مولانا کے قیامِ رانچی کے سلسلے سے وافر معلومات موجود ہیں۔ خاص طور سے مولانا کی روشن خیالی اور مذہب و سماج کے معاملے میں رواداری کے بعض نمونے یہاں دکھائی دے رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا

ہے کہ مولانا اپنے جس لوچ دار مذہبی فکر کی وجہ سے بعد کے زمانے میں اہم سیاسی لیڈر بنے، وہ خصوصیات ان کی ذات و شخصیت میں ابتدائی دور سے ہی موجود تھی۔

'بیانات' مولانا کی مختلف تصانیف اور دیگر تحریروں سے اخذ شدہ شذرات پر مشتمل ہے۔ 'مکاتیب' کے عنوان سے اس کتاب کے جو ۲۰ صفحات وقف کیے گئے ہیں، ان میں مولوی محمد زکریا، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، بیگم حسرت موہانی اور محی الدین احمد قصوری کے نام قیامِ رانچی کے دوران لکھے گئے خطوط کا متن مختلف مجموعوں سے اخذ کر کے شامل کر لیا گیا ہے۔ ان دو حصوں میں اگرچہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن منتشر معلومات اور اطلاعات یہاں یک جا طور پر مل جاتی ہیں جن کی روشنی میں مولانا کے قیامِ رانچی کی بابت منضبط اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔

اس کتاب کے دو حصے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں — 'رانچی ڈائری' اور 'نوادرات'۔ مرتب نے ابتدائیے میں ان دونوں شقوں پر داد طلب نگاہوں سے پڑھنے والوں کو متوجہ کیا ہے۔ اس لیے ان پر علاحدہ سے گفتگو ضروری ہے۔ 'رانچی ڈائری' عنوان سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ یہاں مولانا کی رانچی اقامت کی تفصیلات درج ہوں گی۔ بارہ صفحات کے اس کوزے میں اس دوران کی مولانا کی چھوٹی بڑی تمام باتوں کا اندراج کیا گیا ہے۔ سنہ، ماہ اور تاریخ کی ترتیب کے ساتھ یہاں اندراجات تیار کیے گئے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں ۲۱، ۱۹۱۷ء میں ۹، ۱۹۱۸ء میں ۶، اور ۱۹۱۹ء میں ۸/ اندراجات شامل ہیں۔ مولانا کی نظر بندی کی میعاد تقریباً پونے چار برس رہی (یعنی ۴۴ ماہ ۲۷ دن) اندراجات کی کل تعداد ۴۴ ہے۔ بہ ظاہر تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ہر ماہ میں ایک اندراج رکھا گیا ہوگا لیکن صورت حال یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۱۶ء سے اگست ۱۹۱۷ء، جنوری ۱۹۱۸ء سے جون ۱۹۱۸ء، اور فروری تا اکتوبر ۱۹۱۹ء کے درمیان میں ایک بھی اندراج نہیں ہے۔ ان وقفوں میں مولانا کے رانچی قیام کے دوران کون سے کام ہوئے یا مولانا کے شب و روز کیا تھے، اس کی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ مرتب کا جواز ہو سکتا ہے کہ سرکاری ریکارڈ میں جو کچھ مواد حاصل ہو سکا، اسی کی روشنی میں یہ ڈائری ترتیب دی گئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک ضروری کام یہ بھی تھا کہ وہ دوسرے ذرائع سے بھی معلومات حاصل کر کے اس ڈائری کو زیادہ وقیع، مفصل اور کارآمد بناتے۔ ورنہ یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ پونے چار برس کی ۴۵-۴۴ مہینوں کی سرگذشت بیان کرنے میں کل ۲۲ ماہ ایسے ہیں جن کے احوال اس ڈائری میں شامل ہونے سے رہ گئے

ہیں۔ظاہر ہے، یہ رانچی ڈائری ہر چند کہ کارآمد اطلاعات پر مبنی ہے لیکن اس سے مولانا کے قیامِ رانچی کے حالات آدھے ادھورے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

'نوادرات' کے عنوان سے رانچی قیام کے دوران لکھے مولانا کے تین خطوط کا عکس اور اس کا واضح متن شائع کیا گیا ہے۔مولانا کے یہ خطوط، مرتب کے مطابق اب تک غیر مطبوعہ تھے اور یہ اس کتاب میں پہلی بار شائع ہورہے ہیں۔یہ خطوط ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۶ء اور ۲۱ جنوری ۱۹۱۷ء کو بنام چیف سکریٹری، حکومتِ بہار واڑیسہ اور یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء بہ نام سپرنٹنڈنٹ (آف) پولس، رانچی کو لکھے گئے ہیں۔ان میں پہلا خط مولانا کی انگریزی دانی کے قضیے پر روشنی ڈالتا ہے۔مولانا کے زرے عقیدت مندوں نے ان کی عربی، فارسی اور اردو دانی کے ساتھ ساتھ انگریزی، فرانسیسی، جرمن یا دیگر یوروپی زبانوں پر دست رس ہونے کی بات کہیں کہیں لکھ ماری ہے۔چیف سکریٹری کے نام لکھے گئے اپنے پہلے خط میں مولانا نے اپنی انگریزی دانی پر خود ہی معذرت کرلی ہے۔وہ لکھتے ہیں :

> 'میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھ کو معاف فرمائیں گے اگر میں ایک ایسی زبان میں خط لکھنے کی جرات کروں جو سرکاری مراسلت میں مستعمل نہیں ہے۔یعنی ہندستانی زبان میں۔میں انگریزی زبان سے ناواقف ہوں اور جب کبھی انگریزی زبان میں مراسلت کی ضرورت پڑتی ہے تو ایسے لوگوں سے مدد لینے پر مجبور ہوتا ہوں جو میری تحریر کو انگریزی میں ترجمہ کردیں۔لیکن سوے اتفاق سے اس وقت کوئی شخص ایسا میرے پاس موجود نہیں ہے اور اگر ترجمہ کے لیے کلکتہ بھیجتا ہوں تو اس میں بہت تاخیر کا اندیشہ ہے۔' (ص: ۵۔۴۔۲)

اس اقتباس کے علاوہ مذکورہ خطوط میں مستعمل زبان کی عمومی ناپختگی اس بات پہ دلالت کرتی ہے کہ مولانا اپنے جس پُرشکوہ اسلوب اور صاف شفاف زبان دانی کے لیے بعد کے زمانے میں معروف ہوئے، وہ اُن کی سخت محنت ومشقت اور مشق وریاضت کا نتیجہ تھا ورنہ یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء یعنی ۲۹ برس کی عمر تک تو وہ عام مبتدیوں کی طرح اس قسم کی نثر لکھتے تھے:

> ''کل جب شام کو میں مسجد سے آیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی

Scanned by CamScanner

میں نواب نصیر حسین خیال آئے تھے اور مع سامان کے (؟) آئے تھے۔ کچھ دیر انتظار
کر کے اور کارڈ چھوڑ کے واپس گئے۔ سامان ساتھ ہونے کی وجہ سے خیال کرتا ہوں
کہ شاید ان کا ارادہ یہاں قیام کرنے کا تھا۔'' (ص: ۵۔۲۱۴)

اس عبارت اور ان مکاتیب میں عام طور پر اسی طرح کی ڈھیلی ڈھالی نثر نگاری ہے۔ اگر کوئی 'غبار خاطر' کے خطوط سے اِن کا موازنہ کرے تو کسی کو یقین بھی نہیں آئے گا کہ یہ مولانا کی تحریر ہے۔ ان خطوط میں ایک جگہ 'حکم' کو تانیث لکھا گیا اور 'پوزیشن' کو تذکیر (ص: ۷۔۲۰۶)۔ اسی طرح اس کتاب میں صفحہ ۱۲۳ پر مولوی زکریا کے لیے ایک سفارشی خط مجلسِ خلافت صوبہ بنگال کے لیٹر پیڈ پر مولانا کی تحریر میں شائع کیا گیا ہے۔ وہاں مولانا نے زکریا، ذال سے (ذکریا) لکھا ہے۔ زبان اور املا کے مزاج دانوں کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

اس کے باوجود، مولانا آزاد کے رانچی قیام کی روداد اور دوسرے آثار و عوامل سے آگاہ ہونے کے لیے یہ کتاب ایک اہم ماخذ قرار دی جائے گی۔ مرتب نے اس موضوع کے باقی ماندہ حصّوں پر مزید جلدیں شائع کرنے کا حوصلہ اپنے ابتدائیے میں دہرایا ہے۔ اس لیے امید کی جانی چاہیے کہ آئندہ وہ اس سے بہتر اور پُر از معلومات دفاتر سامنے لائیں گے۔ لیکن مرتب سے ہماری گزارش ہوگی کہ وہ زبان و بیان کے سلسلے میں مزید بیداری سے کام لیں۔ علمی نثر میں آرائش و زیبائش کے اضافی حملوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ جمشید قمر مرادفات کی فہرست بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، ابوالکلام آزاد پر کام کرتے ہوئے اُن کی اس خصوصیت سے وہ متاثر ہو گئے ہوں۔ لاتعلق جملے، گُنجلک فقرے اور پیراگراف، نشانِ اوقاف سے مقدور بھر پرہیز علمی کاموں کی ترتیب و اشاعت کے لیے بے ہنری کی دلیل ہیں۔ جمشید قمر کو آیندہ ان خامیوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ بعض الفاظ کا ایسی بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے کہ اس سے ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے صفحہ 17 اور 18 پر جن دو شخصیات کے لیے انھوں نے 'مخنی' لفظ کا استعمال کیا ہے، ان اصحاب کی عمر بلاشبہ جمشید قمر صاحب سے دوگنی ہے۔

مولانا آزاد ۱۵/اپریل ۱۹۱۶ تا ۳۱/دسمبر ۱۹۱۹ یعنی تین برس آٹھ ماہ اور ستائیس دن رانچی میں رہے۔ اسے مرتب نے تین برس، نو ماہ اور چند روز (ص: ۱۱) کس طرح قرار دے دیا اور اس میعاد کو 'طویل زمانہ' (ص: ۱۵) کہنا کہاں تک مناسب ہے؟ بعض معروف تراکیب کو اُلٹ کر لکھنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، جیسے

'رفت وآمد' بجائے آمد ورفت (ص:۱۱) 'بند وقید' بجائے 'قید وبند' (ص:۱۶)۔ صفحہ دس پر 'ہامی' کا محل ہے لیکن 'حامی' لکھا گیا ہے۔ کتاب میں مرتب نے جو رسمی معذرت کی ہے، وہ یہ ہے: 'کتاب میں در آئی کمیوں خامیوں اور غلطیوں کی ذمہ داری مجھے قبول ہے۔' (ص:۱۸) مرتب کی اس سے قبل ۱۹۹۱ء میں 'غیاث احمد گدی کے افسانے۔ تعارف وانتخاب' نام کی کتاب کے عرضِ مرتب کا آخری جملہ ہے: 'کتاب کی ترتیب وتدوین میں کسی بھی غلطی، کمی یا خامی کی ذمہ داری مجھے قبول ہے۔' عین ممکن ہے، یہ محض اتفاق ہو لیکن کسی نثر نگار کے لیے زبان و بیان کی یہ بخل مزاجی قابلِ ستائش نہیں، اسے مفلسی سے تعبیر کیا جائے گا۔

ظ۔ انصاری نے روسی مصنفین پر لکھتے ہوئے روسیوں کے اپنے بڑے لوگوں کی چھوٹی بڑی چیزوں کو حفاظت سے رکھنے اور ان پر ریسرچ کرنے کے شغف کی بڑی تعریف کی ہے اور اردو کے سلسلے سے حسرت کا اظہار کیا ہے۔ جمشید قمر جیسے چند اہلِ قلم اگر اسی طرح سرگرمِ کار رہے تو وہ دن دور نہیں، جب ہم اردو والے بھی اپنے ممتاز اہلِ قلم کے میوزیم قائم کرلیں گے اور اُن کی ہر چھوٹی بڑی شے اس میں محفوظ کرلیں گے۔ غالب، اقبال اور ابوالکلام آزاد پر اس نہج سے کافی کام ہو چکا ہے اور دوسرے مصنفین پر بھی محقق حضرات شاید جلد متوجہ ہوں۔ بہر حال، جمشید قمر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اگر انھوں نے ان پونے چار برس کے واقعات اور مضمرات روشن نہ کیے ہوتے تو لوگوں کو مولانا آزاد کے قیامِ رانچی کی اہمیت کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ (1995)

شمس الرحمٰن فاروقی کی مدح پر قدح

گذشتہ تیس برسوں میں اردو میں جن چند لوگوں نے اپنے علم و فضل اور اہمیت کا سکہ بٹھایا، اُن میں شمس الرحمٰن فاروقی سب سے اہم ہیں۔ 'شب خوں' (۱۹۶۶ء) اور 'نئے نام' (۱۹۶۷ء) کے توسط سے انھوں نے اردو ادب میں باضابطہ داخلہ لیا۔ شاعری، تنقید، تشریح، ترجمہ، درسیات اور اعزازی ادب جیسے زمروں میں اُن کی دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ صاحب کتاب ہونے کی تین اور ادبی کارگزاریوں کی چار دہائیاں مکمل کر لینے اور اب بھی متواتر تصنیف و تالیف کے کام میں سرگرم ہونے کی فضیلت کا تاج اُن کے سر پر ہے۔ شاید اسی لیے اختر الایمان اور قرۃ العین حیدر کو پانچ لاکھ روپے کا 'سرسوتی سمان' نہیں دیا جا سکا اور ان دونوں کی زندگی میں ہی اس انعام کو فاروقی صاحب حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

اردو کی ایسی اہم شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو، اردو کے وسیع و عریض حلقے میں اُن کی خدمات کے متعلق موجود رائے اور ہم عصروں سے لے کر تازہ واردانِ بساطِ ادب پر اُن کے کارناموں کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری تھا۔ اردو کے نوجوان شاعر، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی میں ریسرچ اسکالر (اب شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد، جہاں خود فاروقی صاحب نے خان عبدالغفار خاں چیئر کو عزت بخشی ہے) جناب احمد محفوظ کی مرتبہ کتاب ''شمس الرحمٰن فاروقی : شخصیت اور ادبی خدمات'' وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ ۱۹۶ صفحات کی کتاب میں مرتب نے کوشش کی ہے کہ اردو کے اہم لکھنے والوں کی تحریروں کے اجتماع سے فاروقی صاحب کی ایک بھرپور ادبی شخصیت اُبھر کر سامنے آئے۔

اس کتاب میں شارح میر اور میر شناس کے بہ طور فاروقی صاحب کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ سردار جعفری، دیویندر اسّر، انتظار حسین، نثار احمد فاروقی، قاضی افضال حسین، عقیل احمد صدیقی اور آصف

نعیم صاحبان کے مضامین و تاثرات ۶۲؍صفحات (یعنی کُل کتاب کا ایک تہائی) پر مشتمل ہیں۔ نثار احمد فاروقی کے علاوہ باقی تمام نے شرحِ میر کے طرز پر فاروقی صاحب کے کمالات کی تشریح کی ہے۔ نثار احمد فاروقی نے چند اشعار کی مثال دے کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی ''دُور کی کوڑی'' لانے کی کوشش میں اشعار کے سامنے کے اور واجب مفاہیم؛ اور بسا اوقات اصل متن کو کس خوش اسلوبی سے نظر انداز کرنے میں کیسی مہارت رکھتے ہیں۔ اردو کے کھاتے میں خوشامدی، مصلحت پسند اور مہمل تنقیدی زاویے سجانے والے اتنے ادیب ہیں کہ انھیں 'شعرِ شور انگیز'' کی چار جلدوں کے ۷۱۲+۵۲۰+۶۹۸+۸۱۰ = ۲۷۴۰صفحات میں کوئی کمی، کھوٹ یا جھول دکھائی نہیں دیتا۔ دنیا میں کون سی ایسی تحریر ہے جس میں ایک ذرا سی کھوٹ نہ مل جائے، اس پر کسی پہلو سے اعتراض نہ کیا جا سکے۔ نثار احمد فاروقی یا کوئی دوسرا ناقد اگر 'شعرِ شور انگیز' کی چاروں جلدوں میں شامل ۴۸۷؍غزلوں کے کُل ۱۹۹۰؍اشعار کی تشریحات کا فرداً فرداً تنقیدی جائزہ لے لے، تب فاروقی صاحب کی تشریحات کے علمی اور تنقیدی اعتبار کے معیار کا تعین ہو سکے گا۔

کتابوں کی ضخامت اور جلد در جلد پھیلاو سے علم و فہم کی پیمائش کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ آج کے مشینی اور عجلت پسند عہد میں صبر و تحمل سے پڑھنے اور تین تین ہزار صفحات کے بکھراو کو ذہن کے آئینہ خانے میں محفوظ رکھ کر بے لاگ تجزیہ کرنے کی مہلت، فرصت اور ضرورت بہت کم لوگوں کو ہے؛ شاید کسی کو بھی نہیں۔ اسی لیے فاروقی کی 'شعرِ شور انگیز'، جمیل جالبی کی 'تاریخ ادب اردو' کے اب تک کے شائع شدہ ۲۰۵۴ صفحات کا بے لاگ جائزہ سامنے نہیں آ سکا ورنہ تنقید و تحقیق کی کون سی کمی ہے جس کی مثال ان کتابوں سے نہیں دی جا سکتی۔ حد تو یہ ہے کہ رشید حسن خاں کی وقیع اور مستند علمی و تحقیقی کتابوں 'فسانۂ عجائب'، 'باغ و بہار' اور 'گلزارِ نسیم' کا بھی کسی نے بھرپور تجزیہ نہیں کیا۔ نثار احمد فاروقی نے ذرا سی معترضانہ بات کی لیکن وہ بھی برائے بیت اور کم از کم ان اہم اور قابلِ قدر کتابوں کے شایانِ شان تو ہرگز نہیں۔

ان اہم کتابوں کا تنقیدی اعتبار سے پست معیاری جائزہ یہ بتاتا ہے کہ اردو والوں نے اپنے بڑے کارناموں کو بلند معیار سے پرکھنے کا حوصلہ نہیں دکھایا۔ نتیجتاً ان کی ادبی اہمیت کا تعین منصفانہ طور پر نہیں ہو سکا۔ آج اگر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود یا امتیاز علی عرشی ہوتے تب بھی کیا ان کتابوں کے تعلق سے ایسا ہی چاپلوسی سے بھرا منظر نامہ ہوتا۔ ہرگز نہیں۔ قاضی صاحب فاروقی کے متن کی جانچ تو کرتے ہی، میر کے اشعار

کے مطالب کے گھال میل کو بھی واضح کرتے۔ انھوں نے خواجہ احمد فاروقی کی تحقیقی کتاب پر تبصرے میں خواجہ صاحب کے تنقیدی مفروضات کا جو عالمانہ جائزہ لیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کے ادبی مزاج پر اُن کی کیسی گہری نگاہ تھی۔ کلیم الدین احمد تو یقینی طور پر 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں فاروقی کے اس کارنامے کا بہ تفصیل جائزہ لیتے اور اس کتاب کے سیاہ و سفید کے متعلق ہماری آنکھیں کھول دیتے۔ افسوس، اردو کا موجودہ منظر نامہ بڑے اصحاب قلم، بے لاگ اور منصفانہ گفتگو کرنے والے ناقدین و محققین سے یکسر خالی ہے۔ اس لیے بڑے اور معتبر کارناموں کی بھی تنقیدی پذیرائی نہیں ہو رہی ہے۔ ایسی کتابوں کو ایک ایک لفظ پڑھنے کے بجائے اُلٹ پلٹ کر دیکھ لینے سے ناقدین کا کام چل جا رہا ہے اور 'لکھاڑ' تنقید نگاروں کے دھڑا دھڑ فرمودات عالی منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اردو تنقید کے اس موجودہ المیے کا شکار 'شعر شور انگیز' جیسی کتاب بھی ہے لیکن فاروقی صاحب کے چاہنے والے مرتب کتاب کو 'شعر شور انگیز' پر لکھی تنقید کی ان حدود کا اندازہ نہیں، اس لیے عقیدت مندانہ تاثرات کے بھرم جال میں کھو جانے کو وہ قدر شناسی تصور کر لیتے ہیں۔

اسی ماحول کی وجہ سے اہم لکھنے والوں کے یہاں عالمانہ انکساری کے بجائے بڑھی ہوئی خود اعتمادی، غیر جمہوری طریق استدلال اور ایک طرح کے بنیاد پرستانہ جوش کے عناصر غیر ضروری طور پر در آئے ہیں جس سے مکالمے اور بات چیت کے راستے بند ہو رہے ہیں۔ یہ بڑے اہلِ قلم Single end discourse پر قناعت کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس مرض میں ایک عرصے سے مبتلا رہے ہیں۔ رشید حسن خاں کی علمی احتیاط پسندی کے باوجود ایسی بدعتیں اُن کی بعض تحریروں میں بھی مل جائیں گی۔ مبتدیوں کی کوتاہیوں پر اُنگلی اُٹھانے والے لوگ ہی خال خال ہیں تو ان جیسے عظیم المرتبت اور بلاشبہ علم و دانش کے سب سے بڑے میناروں کو آخر کون آئینہ دکھائے، انھیں کون روکے، ٹوکے؟

شرحِ میر پر کتاب کا ایک تہائی وقف کرنے کے بعد مرتب نے شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری پر بلراج کومل، چودھری ابن النصیر اور اپنے مضامین شائع کیے ہیں۔ غالب کی تشریح و تعبیر میں فاروقی صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان پر مظفر علی سید (پاکستان) اور ظفر احمد صدیقی کے مضامین ہیں۔ مظفر علی سید کے تین صفحات کے تاثرات انگریزی سے مرتب نے ترجمہ کر کے شامل کیے ہیں جہاں فاروقی کے طریق تنقید پر ذرا سی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ 'شب خوں' سے فاروقی کے تعلق پر سید ارشاد حیدر اور ترقی اردو بیورو کے رشتے پر ابو الفیض

سحر نے روشنی ڈالی ہے۔ عرفان صدیقی، حمید الماس اور تنویر سامانی کا عقیدت مندانہ کلامِ منظوم کے علاوہ مرتب اور سراج اجملی کے ذریعے فاروقی صاحب کا لیا گیا ایک انٹرویو بھی شامل کتاب ہے۔ فاروقی کے والد کی کتاب سے ایک اقتباس اور محبوب الرحمان فاروقی کے مضمون سے فاروقی کے سوانحی پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ ''عکسِ تحریر'' میں تنقید کے بجائے شاعری مندرج ہے: ایک رباعی اور ایک غزل۔

فاروقی کی تنقیدی خدمات پر شمیم حنفی کا چار صفحے کا ایک نوٹ شائع کر کے مرتب نے فاروقی کی تنقید نگاری کو (ماسوائے میر و غالب سے متعلق تشریحات) سمیٹ لیا ہے جب کہ اداریے میں وہ سب سے زیادہ اہمیت فاروقی کی ناقدانہ حیثیت کو ہی دیتے ہیں۔ اسی طرح مرتب کا تیار کردہ ''سوانحی خاکہ'' بالکل ناکافی ہے اور یہاں ایسے کاموں کے اصول وضوابط سے ناواقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ فاروقی کے تنقیدی تجزیوں کی طرح ضروری اطلاعات سے گریز اور غیر اہم یا معمولی، ضمنی موضوعات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنے کی ہنر مندی اس بائیوڈیٹا میں مل جائے گی۔ ۳۶ ربرس کے محکمۂ ڈاک اور تار سے تعلق کو مرتب نے صرف دو سطروں میں ختم کر دیا ہے جب کہ اعزازات وانعامات اور عہدوں کی پیش کش کی تفصیل میں پورا پورا صفحہ خرچ ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے بیرونی ممالک کے اسفار کا گوشوارہ تیسرے صفحے میں مکمل ہو پایا ہے۔

فاروقی صاحب کے والد نے اپنی تحریر میں ابتدائی دور میں شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھوں ایک ماہنامہ قلمی رسالہ نکالنے کی بابت اطلاع دی ہے۔ مرتب، فاروقی، محبوب الرحمان فاروقی وغیرہ کسی کی تحریر میں اس واقعے کی مزید معلومات دستیاب نہیں جس سے فاروقی کے تدریجی ارتقا کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا تھا۔ فاروقی صاحب کے دادا کے فراق گورکھ پوری کے استاد ہونے اور منشی پریم چند کے فاروقی صاحب کے والد کے استاد ہونے کی اہم اطلاعات کے ساتھ ''کہا جاتا ہے'' لکھنے کا مطلب اِن معلومات کی بے اعتباری کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ مرتب نے نہایت غیر ذمے دارانہ طریقے سے یہ سوانحی خاکہ مرتب کیا ہے۔ مثالیں مزید دی جا سکتی ہیں۔

مرتب کتاب کو الفاظ بالخصوص صفات کے استعمال میں احتیاط کا سبق شاید فاروقی صاحب نے بھی نہیں پڑھایا۔ حالاں کہ وہ ریسرچ اسکالر (اور اب ملک کی ایک نام ور دانش گاہ کے استاد) جیسے ذمے دارانہ عہدے پر فائز ہیں۔ سرورق پر شائع کی گئی فاروقی صاحب کی ایک سفید سیاہ تصویر کے لیے فوٹو گرافر کا شکریہ ادا کرنے کے مرحلے میں ''خوب صورت عکسی تصویر'' کے الفاظ نچھاور کرنا تصویر اور ریسرچ دونوں کے فن کے ساتھ

زیادتی ہے۔اس کا کلائمکس اداریے میں یوں اُبھرتا ہے.... ''شعرِ شور انگیز'' کی اشاعت سے اردو میں عملی تنقید کا جو نمونہ ہمارے سامنے آیا ہے، اُسے بلاشبہ دنیا کے اہم تنقیدی کارناموں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔(ص:۸) یہ الفاظ بہ طور عبرت ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔اسی اداریے میں وہ فاروقی صاحب کی اوّلیات اور فضائل کی جو فہرست پیش کرتے ہیں، وہ اُن سے بہتر طریقے سے اور زیادہ معروضیت کے ساتھ کلیم الدین احمد اور بعض معاملات میں الطاف حسین حالی کے یہاں فاروقی صاحب کے اردو ادب میں جنم لینے سے پہلے سے موجود ہیں اور کہنا چاہیے کہ تجزیے کا اسلوب اور طریقِ استدلال فاروقی صاحب نے انھی پیش روؤں سے سیکھا ہے۔

تنقید و تحقیق کی یہ سخاوت اور دریا دلی مرتب نے صرف ذاتی تحویل میں نہیں رکھی ہے بلکہ اس کتاب کے اکثر مضمون نگاروں اور شاعروں کو اس کی اجازت (یا شاید ہدایت) حاصل ہے کہ وہ حیرت انگیز مبالغوں کی فصل اُگائیں۔فاروقی صاحب کے والدِ محترم فرماتے ہیں: ''الہٰ آباد شہر کا شاید ہی کوئی ایسا ٹیلی فون نمبر، جسے انھوں نے ایک بار استعمال کیا ہو، نہیں ہے جو انھیں زبانی نہ یاد ہو۔'' (ص:۳)۔اس کا نقطۂ عروج فاروقی کے عم زاد بھائی محبوب الرحمان فاروقی پیش کرتے ہیں: ''ذہانت کا یہ عالم کہ آج سے پچاس سال پہلے بھی جو کتاب انھوں نے ایک بار پڑھ لی، اس کی سطریں اور صفحہ نمبر تک یاد ہیں۔ایک بار جس چیز پر بھی انھوں نے نگاہ ڈال لی، وہ اُن کے حافظے میں محفوظ ہو گئی۔'' (ص:۲۸)۔والدِ محترم اور چچا زاد بھائی فاروقی صاحب کی یادداشت کی داد دے رہے ہیں لیکن اُن کی پیش کردہ مثالوں کی جانچ کے مرحلے میں خود فاروقی صاحب کو شرمندہ ہونے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا۔مرتب کتاب نے نہ اپنی تحریر پر لگام لگائی اور نہ دوسرے لوگوں کو محتاط، معروضی اور حقیقت شناس ہونے کی دعوت دی۔لہٰذا پوری کتاب میں ایسے Rhetoric بھرے پڑے ہیں جو تنقید اور ترتیب کے فرائض کی کھلّی اڑاتے ہیں۔فاروقی کی شاعری پر بھی جو تینوں مضامین ہیں، وہ بھی ایسی تنقید کی بدترین مثالوں کے طور پر سامنے رکھے جائیں گے۔

محبوب الرحمان فاروقی نے لکھا ہے: ''فاروقی صاحب کی تنقیدی بصیرت اور کارنامے کو اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو کے پہلے اور اکیلے نقاد ہیں جنھوں نے ہمیں احساسِ کمتری سے نکال کر اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنا سکھایا ہے۔'' (ص:۳۳)۔یہاں یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ اردو کے طلبہ کو عربی عنوانات اور فارسی شذرات و اشعار کے استعمال (بیش تر غیر ضروری یا بے محل) سے انھوں نے دوبارہ

احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال یا ایک صدی پہلے مغربی ادب کے زور پر اردو والے یہ سوچتے تھے کہ چلو کیا ہوا، باہر کی چیزوں سے بھلے ہم ناواقف ہیں لیکن اپنے سرمایے سے نابلد نہیں۔ فاروقی صاحب نے عربی اور فارسی کی ضرورت سے زیادہ دھونس جما کر ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو والے نہ دنیا جہان کے ادب سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ اپنے روایتی سرمایے سے انھیں آگاہی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اردو والوں کو اس طرح بے علم ظاہر کر کے، احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے اپنی ''ہمہ دانی'' کا رعب طاری کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی تنقید کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی یہ Perversion موجود ہے۔ دراصل موجودہ دور میں مغربی علوم وفنون سے واقفیت عام ہے۔ آزاد ہندستان میں پیدا ہوئی نسل حالات کے تقاضے کے تحت فطری طور پر عربی اور فارسی زبانوں سے رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئی۔ اس لیے فاروقی صاحب نے مشرقی علوم بالخصوص فارسی اور عربی کی ڈور ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے تحت پکڑی ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ آج کی اردو آبادی پر اسی سے رعب طاری ہوسکتا ہے۔ اس لیے گذشتہ بیس برسوں میں فاروقی صاحب کے کارناموں کا جائزہ لیجیے تو اس میں جدید ادبی رجحانات اور مباحث کی جانب توجہ کم ملے گی اور روایتی لفظوں اور محاورات کی طرف لپک زیادہ۔ کبھی کبھی محسوس ہوگا کہ ابتدائی انیسویں صدی میں اردو شعروادب میں جن موضوعات پر، جن الفاظ واصطلاحات کے حوالے سے گفتگو ہورہی تھی، فاروقی کی دل چسپی اور تنقیدی سطح اُسی کے آس پاس گھوم پھر کے پہنچ رہی ہے۔

ایسی کتابوں کی اشاعت کا مقصد اُس شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنا اور اس کی مکمل ادبی شبیہ واضح کرنا ہوتا ہے۔ مرتب کتاب نے فاروقی صاحب کی شخصیت اور شعروادب سے الگ کی زندگی کو اہمیت دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اُن کی خانگی زندگی، بال بچوں سے تعلق، اہلیہ کے تاثرات، کالج کی زندگی، دورانِ ملازمت کے نشیب وفراز، فاروقی کے ادبی اور غیر ادبی دوست احباب، ملاقاتی اور ایسے درجنوں موضوعات تھے، جن پر ضروری اطلاع فراہم کیے بغیر شمس الرحمٰن فاروقی کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ ۱۹۶ رصفحات کی کتاب میں مشکل سے پانچ صفحے ہوں گے جن پر فاروقی کی خامیوں یا کجی کا ذکر ہوا ہو۔ علی میاں کی کتاب ''پُرانے چراغ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ظ۔ انصاری نے لکھا تھا: ''یہاں مرحومین کی فہرست میں جتنے ہیں سب دین دار، سب پابندِ صوم وصلوٰۃ، سب جذبۂ اسلامی سے سرشار..... سب الحاد اور اہلِ الحاد کے دشمن! افسوس کہ ان اٹھارہ چراغوں

میں ایک بھی غیر مسلم یا بدعقیدہ مسلمان نظر نہیں آتا۔'' (کتاب شناسی؛ ص:۲۰۳)۔ادب سے لے کر ذاتی زندگی تک، شمس الرحمٰن فاروقی کو اس کتاب میں ایسا فرشتہ صفت دکھایا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے صراطِ مستقیم پر چلنے والے آدمی نے شعروادب کے شعبے میں کیوں داخلہ لیا؟ دراصل مرتب نے دانستہ ''بدعقیدگی'' کے حصے داخلِ کتاب نہیں کیے اور ایک غیر دل چسپ، سادہ نظر اور بے کھوٹ شخصیت کا پورٹریٹ تیار کر کے شمس الرحمٰن فاروقی کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

پچھلی تین دہائیوں میں شمس الرحمٰن فاروقی اردو ادب میں ایک ''پاور'' کے طور پر موجود ہیں۔ادبی اقتدار اور اجارہ داری کی پشت پر اُن کی عالمانہ تحریریں تو ہیں ہی، بعض غیر ادبی اسباب بھی قابلِ غور ہیں۔انھوں نے شب خوں کے توسط سے جو پیڑھی تیار کی، وہ ان کی ادبی لائحۂ عمل کا ایک حصہ ہے۔اس دوران کئی اہم اور غیر اہم لکھنے والے ''شب خوں'' کے سہارے فاروقی کی عطا کردہ شہرت حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور ریٹرن کے طور پر انھوں نے ایسے لوگوں کو اپنا Follower بنایا۔انھوں نے ''شب خوں'' کے بہانے ایک نجی ادبی فوج کھڑی کی جو اُن کے تنقیدی قلعے کی نگہبان ہے۔اس لیے فاروقی کے کارناموں پر گفتگو کرتے ہوئے ادبی اجارہ داری کے احوال اور اس سے پیدا ہوئے مسائل سے صرفِ نظر کرنا بے انصافی ہے۔

میرا ماننا ہے کہ یہ کتاب فاروقی صاحب کی نگرانی میں مرتب ہوئی ہے،اسی لیے اس میں اُن کی پسند کے تمام چہرے موجود ہیں۔فاروقی صاحب اپنی تنقید برداشت نہیں کرتے۔اُن کے معترضین اُن کے ذاتی دشمن کے شمار میں آتے ہیں۔''شب خوں'' میں ایک معمولی خط پر بھی چھوٹی عمر کے لوگوں تک کو ترکی بہ ترکی جواب دینے سے انھوں نے کبھی گریز نہیں کیا۔احمد محفوظ نے اس مسئلے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا دائرۂ کار طے کیا۔اپنی پسند کے لوگوں سے اور مَن چاہی گفتگو سننے کے خیال سے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے؛ اس لیے اس کا کوئی اعلا ادبی مقصد نہیں۔خاص طور سے فاروقی صاحب کے علم وفضل، کمالات اور شخصیت کے پیچ وخم کو سمجھنے کی نیت سے جو کوئی یہ کتاب پڑھے گا، اُسے مایوسی ہاتھ لگے گی۔یہ کتاب ایک مثال ہے کہ بڑی ادبی شخصیات پر کیسی کتابیں شائع نہیں ہونی چاہییں۔مستقبل کے مرتبین احمد محفوظ کی ترتیب دادہ کتاب کو اسی طور پر یاد کریں گے۔

(1997)

فرہنگِ لفظیاتِ غالب

غالب بُتِ ہزار شیوہ کی طرح ہیں۔ انھیں زاہد بھی پسند کرتا ہے اور مُلحد بھی۔ انھیں مفکّر عزیز رکھتا ہے تو ساتھ ہی بے فکری سے زندگی گزارنے والے کو بھی وہ کم عزیز نہیں۔ زبان کی سادگی کا شیدائی غالب کا دیوانہ ہے مگر فارسی اور عربی کی مشکل پسند کیفیت بھی بہتوں کو غالب کی جان معلوم ہوتی ہے۔ جام و مینا کے قتیل غالب کے اپنے ہیں تو مسجد و محراب کے باشندگان کے لیے بھی غالب کے اشعار روح کو گرمانے والے لگتے ہیں۔ جنھیں لفظوں اور ترکیبوں سے عشق ہے، انھیں غالب پسند ہیں اور جو شعر میں جہانِ معنیٰ ڈھونڈتے پھرتے ہیں، انھیں بھی غالب اپنی طرف بُلاتا دکھائی دیتا ہے۔ جنھیں قلب میں تیرِ نیم کش کا وار بہ خوشی جھیلنا ہے، وہ خرمن غالب کے خوشہ چیں ہیں اور جنھیں تصوّف کی گھنی چھاؤں چاہیے، وہ بھی غالب سے قربت کا ہی واسطہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے غالب شناسی ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ ہر محقق اور نقاد جب شعر فہمی کے منصب عالی پر ہوتا ہے تو اُسے ایک بار، کم از کم ایک بار دیوانِ غالب کی طرف رجوع کرنا ہی پڑتا ہے۔

معتبر نقاد اور شاعر سلیم شہزاد کی ضخیم کتاب 'فرہنگِ لفظیاتِ غالب' جب سامنے آئی تو پھر ایک بار غالب کی ہزار شیوگی پر یقین کرنا پڑا۔ ۶۷۵ رصفحات کی یہ کتاب مصنف کی غیر مطبوعہ 'فرہنگِ دیوانِ غالب' سے حصّہ تراکیب اور کچھ مخصوص الفاظ کو نکال کر علاحدہ طور پر کتابی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کام کے سلسلے سے اپنے بارہ برس کی مشقت کا ذکر کیا ہے۔ جب حصّہ تراکیب پونے سات سو صفحات پر مشتمل ہے، تو اصل فرہنگ کس قدر ضخیم ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اللہ کرے، یہ کام جلد از جلد شائع ہو کر سب کے مطالعے کا حصّہ بن جائے۔ جب جب غالب کے سلسلے کی فرہنگوں اور شارحین کے ضخیم کاموں پر نظر جاتی ہے اور سامنے دیوانِ غالب کی مختصر ضخامت نگاہ میں ہوتی ہے: اس وقت یہ احساس شدید تر ہوتا ہے کہ شعر ایسے ہوں کہ جن کے

مفاہیم کی تلاش میں نسل در نسل اپنی خدمات پیش کرتی رہے اور شاعر، اپنے نئے مفاہیم کی بساط بچھاتا پھرے۔

سلیم شہزاد نے غالب کی تراکیب کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ غالب کو بجا طور پر اپنی تراکیب اور زبان دانی پر ناز تھا۔ اسی لیے شارحین نے بھی اپنی سب سے زیادہ توجہ انھی تراکیب پر صَرف کی ہے۔ معنوی اعتبار سے اگر ان تراکیب کی کلیدی حیثیت ہے تو یہ بھی سچائی ہے کہ غالب کی مشکل پسندی اور معنوی نارسائی کے دھارے بھی یہیں سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے مرتباتِ غالب پر کام کرنے والے کے مقدر میں کامیابیوں کے ساتھ غالب ہی کی طرح معنوی نامرادی کا ٹھپّا لگنا لازمی ہے۔ جب شاعر پر نافہمی کا الزام ثابت ہو چکا ہو تب کسی شارح یا غالب کے فرہنگ نویس کو کیسے اِن مشکلات سے نجات مل سکتی ہے۔ اس لیے سلیم شہزاد کی یہ فرہنگ ان کی لاکھ کامیابیوں کے باوجود ان کی نارسائیوں اور کوتاہ دستیوں کی مظہر بھی لازماً ہوگی۔ اس تبصرے میں اختصار کے ساتھ دونوں پہلو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سلیم شہزاد نے شمس الرحمٰن فاروقی کی مشہورِ زمانہ کتاب ''شعرِ شور انگیز'' پر غالباً پہلا معترضانہ تبصرہ پیش کیا تھا۔ اُسی وقت سے تعبیر و شرح اور لفظ و معنی کے کوچے کی سیاحی میں ان کی مہارت ظاہر ہونے لگی تھی۔ ایک طویل مدّت سے، کم از کم چار دہائیوں سے وہ شاعری اور تنقید دونوں صنفوں میں سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے اکثر و بیشتر کام سرسری یا عمومی نوعیت کے نہیں ہوتے۔ یہ کتاب بھی ہمارے زمانے کی خاص کتابوں میں شمار کی جائے گی۔ اس کی افادیت طلبہ سے لے کر علما تک یکساں ہے۔ جنھیں اپنی زبان دانی پر بہت ناز ہے، انھیں غالب کا جب کوئی شعر نامرادانہ آئینہ دکھاتا ہے تب ایسی کتابوں یا فرہنگوں سے رجوع کیے بغیر اُن کے لیے چارہ نہیں رہتا۔ ہر چند آپ انھیں پڑھ کر اُن کے مفاہیم سے انکار فرمادیں لیکن ایک نظر ان پر ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ سلیم شہزاد نے انتخاب اور بے ترتیبی کے چلتے پھرتے اصولوں کا استعمال کر کے اس کام کو آسان بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس بات پر اصرار کیا کہ غالب کے ''معروف و غیر معروف اردو کلام کی شعری لفظیات'' کا اس میں احاطہ کیا جائے۔ اکثر شرحوں میں انتخاب اشعار فرار کا وہ ذریعہ ہوتا ہے جہاں شعر زیادہ الجھن پیدا کر رہا ہو تو اُسے اسقط کر دیا جائے۔ یہ کام طباطبائی سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک، سب نے کیا ہے۔ سلیم شہزاد نے اپنے لیے ایسی کوئی سہولت یا فرار کی راہ منتخب نہیں کی یا کم از کم ایسا کوئی اعلان نہیں کیا۔

تحقیقی اعتبار سے غور کریں تو اس فرہنگ کے ساتھ کئی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنا طویل،

وقت طلب، صبر آزما اور عالمانہ کام کرنے والے کو یہ کیوں نہیں یاد آیا کہ اپنے بنیادی اور ثانوی ماخذات کا اعلان کر دے۔ بڑی بڑی لغات جب علما اور محققین کو اپنے بیچ میں الجھا لیتی ہیں اور کسی ایک لفظ کے معنی کے تعین میں بُعدِ مشرقین سا اختلاف ہو جاتا ہے؛ ایسے میں سلیم شہزاد کے لیے لازم تھا کہ فرہنگ میں شامل الفاظ و تراکیب کے معنی پیش کرتے ہوئے بنیادی لغات کی صاف صاف نشان دہی کر دیں۔ الفاظ کے معنی متعین کرنے میں رشید حسن خاں نے اپنی فرہنگوں یا دیگر کتابوں میں جو تحقیقی اصول رائج کیے، وہ لائق اتباع ہیں۔ سلیم شہزاد شاید غیر ضروری طور پر علمی اعتماد میں گرفتار ہو گئے اور اپنے سابقین کے تحقیقی اصولوں سے دور جا گرے۔

یہی اس فرہنگ کے مقدمے کا بھی حال ہے۔ ہر آدمی کی یہ توقع ہوتی ہے کہ جس شخص نے ایک لمبی مدت کلامِ غالب کے مفاہیم متعین کرنے میں صَرف کی ہو، اس کے علمی تجربات اور مشاہدات بھرپور ہوں گے اور ان سے غالب فہمی کی نئی راہیں کھلیں گی۔ اسی کے ساتھ پڑھنے والوں کی یہ توقع بھی ہوتی ہے کہ غالب کے شارحین اور فرہنگ نویسوں سے جب آپ بالاستیعاب استفادہ کر رہے ہیں تو اس میں کون سی ایسی پریشانی ہے کہ آپ صاف صاف یہ نہیں بتاتے کہ کس شرح یا کس فرہنگ میں کون سا حصہ اچھا ہے یا کہاں خس و خاشاک کا ڈھیر ہے۔ پندرہ صفحات پر مشتمل مقدمہ ایسا رسمی تعارف نامہ ہے جس میں برائے نام کچھ فرہنگوں یا شارحین کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ تحقیقی کاموں کے لیے یہ شیوہ نامناسب اور علمی کوتاہ دستی کا مظہر ہے۔

دنیا کی ہر تحقیق میں یہ بتانا لازم ہوتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق موجود مواد کا مطالعہ آپ کو کس تحقیقی پڑاو تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوا، اس کی بہ صراحت وضاحت متوقع ہوتی ہے کیوں کہ یہیں سے نئے انکشافات اور ایجادات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ سلیم شہزاد نے جس انداز سے اس کتاب کے مشتملات پیش کیے ہیں، ان میں ایک تحکمانہ شان نمایاں ہے۔ بین السطور سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے حوالے سے شرح و تعبیر یا لفظیات کے سلسلے سے کوئی کار آمد عالمانہ کام ہوا ہی نہیں تھا۔ اسی میں وہ اپنے قاموسی کام کا علمی جواز پیش کرتے ہیں لیکن یہ علمی کوتاہ دستی اور تحقیقی بدتوفیقی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ فرہنگوں کا کام ''ایجادِ بندہ'' نہیں ہوتا۔ لفظوں کے معنی کا ابتدائی رُخ تو فرہنگ نویس ہی طے کرتے ہیں۔ اس کا اقرار کرنے کے بعد ہی یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ غالب کی شاعری کے مخصوص تناظر میں آپ اِن الفاظ یا تراکیب کے معنوی طلسم کو حل کریں لیکن اس کام میں آپ فرہنگ نویسوں کے احسانات کو کیوں چھپانا چاہتے ہیں؟ سلیم شہزاد کے اچھے کام میں یہ کوتاہی

زیب نہیں دیتی۔

ابتداً اس بات کے لیے معذرت کر لی جائے کہ ایک مختصر تبصرے میں اس قدر ضخیم کتاب کی تمام تراکیب کا جائزہ ناممکن ہے۔ اس عجز میں یہ مسئلہ بھی قائم رہے گا کہ اس فرہنگ کی بہت ساری خصوصیات یا تسامحات بھی اس طرح واشگاف نہیں ہو پائیں گی۔ لیکن بہ طور مثال چند امور کی طرف اشارہ کر دینے سے یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہیں لگتی کہ اس دریا میں کون کون سے موتی یا پتھر موجود ہیں:

۱۔ 'شہنشاہِ آسماں اورنگ' کے معنی درج ہیں: 'آسمان کے تخت والا بادشاہ' (ص:۴۲۹)۔ اس معنی سے اس ترکیب کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آتا۔ فرہنگ میں مزید صراحت چاہیے تھی۔

۲۔ 'شوخیِ تحریر' کے معنی درج ہیں: 'مصوری (فن کاری) کی شرارت / مہارت' (ص:۴۲۵)۔ یہ معنی نہ صرف نامکمل ہیں بلکہ غالب کے اس عظیم شعر کے حسن سے ہمیں دور کر دیتے ہیں۔

۳۔ 'آتش خانہ' کے معنی درج ہیں: 'عبادت کے مقصد سے جہاں ہر وقت آگ جلتی ہو' (ص:۲۷) اس تفصیل میں بھی وضاحت ادھوری رہ گئی ہے۔

۴۔ 'اشکِ دیدۂ خرشید' کے بارے میں لکھا گیا ہے: 'سورج کی آنکھ کا آنسو' (ص:۵۸) اس معنی سے بھلا کون غالب کی ترکیب کا لطف اٹھا سکتا ہے؟

۵۔ 'چشمِ نرگس' کے تعلق سے یہ تفصیل لکھی گئی ہے: 'گلِ نرگس کی آنکھ یعنی گلِ نرگس آپ جس کی بناوٹ آنکھ کی طرح ہوتی اور اسے نابینا سمجھا جاتا ہے' (ص:۱۱۷)۔ اس معنی سے سمجھا ہوا شعر غارت ہو سکتا ہے۔

۶۔ 'سرشک' اس کے معنی 'آنسو' (ص:۳۸۳) درج ہیں۔ مثال میں دو مصرعے پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ردیف الف کا مشہور شعر ندارد:

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

۷۔ 'عیسیٰ' :اس کے معنی مسیحائی (ص:۴۸۱) درج ہیں۔اس سلسلے سے عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی غالب کے یہاں اس کی دونوں شکلوں کے استعمال پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے (ملاحظہ ہو: حرفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا)

۸۔ 'محشرستانِ بے قراری' کے معنی لکھے گئے ہیں: 'بے تابیوں کے جمع ہونے کا مقام' (ص:۵۷۶)۔اسی طرح 'محشرستانِ نگاہ' کا مفہوم 'نگاہوں کا ہجوم' (ص:۵۷۶) لکھا گیا ہے۔اشعار کی تفہیم کے مرحلے میں ایسے معانی بدذوقی قرار دیے جائیں گے۔

۹۔ ''نبضِ رگِ گل'' کے معنی 'پھول کی رگیں' لکھا گیا ہے (ص:۶۱۹)۔ترکیب سے معنی کی پیش کش کے دوران نبض کہاں رفوچکر ہوگئی' سمجھ میں نہیں آتا۔

۱۰۔ 'یک بار' کے معنی 'دیکھتے دیکھتے/اچانک' (ص:۶۷۲) درج ہیں۔ 'یک قدم' کے معنی 'تھوڑی سی' (ص:۶۷۴) لکھے گئے ہیں۔یہ تمام معانی ناکافی ہیں۔

۱۱۔ 'زنارِ رگِ سنگ' اس کے معنی درج ہیں 'پتھر کی رگ کا زنار یعنی یہ رگ آپ' (ص:۳۵۶)۔اس معنی میں جو وضاحت ہے،اس سے معنی کی تفہیم میں مزید رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۲۔ 'رخشِ عمر' کے معنی اس طرح لکھے گئے ہیں: 'عمر (کی مدت) کا گھوڑا یعنی (تیزی سے گزرتی) عمر آپ' (ص:۳۲۳)۔یہاں بھی جو بات آسانی سے کہی جا سکتی تھی، اس کے لیے زبان کی ایسی کجی پیدا کی گئی کہ معنی خبط ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

۱۳۔ 'تاربستر' کے معنی درج ہیں۔بستر کا ہر حصہ/تار تار (ص:۱۲۶) غالب کا مصرع ہے:

تپش سے میری وقفِ کش مکش ہر تارِ بستر ہے

اس لیے معنی میں 'ہر' کا استعمال غیر ضروری ہے۔

۱۴۔ 'چشمِ نقشِ قدم' اس کے معنی اس طرح مندرج ہیں: 'نقشِ قدم کے نشان کی آنکھ یعنی قدم کا نشان آپ' (ص:۲۱۱)۔یہاں نقش اور نشان دونوں کو معنی میں شامل کرکے پتا نہیں فرہنگ نویس کیا کہنا چاہتے ہیں۔

۱۵۔ 'ساقیِ گردوں'۔اس کے معنیٰ لکھے گئے ہیں۔'آسمان کا ساقی یعنی آسمان آپ'
(ص:۳۶۷) غالب کا مصرع ہے:

ے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے

سلیم شہزاد نے معنیٰ میں گردوں کی اہمیت تو سمجھی لیکن ساقی کو ویس نکالا دے دیا ہے۔

فرہنگ نویس نے یوں تو اس کتاب کے دائرۂ کار میں مرکبات غالب کو مرکزی حیثیت دی ہے اور ننانوے فی صدی مرکبات ہی شاملِ متن ہیں لیکن نہ جانے کس عالم میں بعض سامنے کے الفاظ یعنی مفرد الفاظ یا محاورات اس میں شامل کر کے ان کے معنیٰ درج کردیے گئے ہیں۔ انھیں کسی بھی طرح سے مرکبات کا حصّہ نہیں مانا جا سکتا۔ مصنف نے کتاب کا نام ضرور 'فرہنگِ لفظیاتِ غالب' رکھا ہے۔ لیکن ان کا اصل معاملہ تراکیب سے ہے لیکن دیکھیے کہ ان جیسے سیکڑوں الفاظ آخر کس اصول کے تحت اس فرہنگ میں شامل ہو گئے: آرمیدن (ص:۳۰)، آرمیدگی (ص:۳۲)، اسامی (ص:۵۶)، اشارت (ص:۵۷)، بلد (ص:۱۰۲)، پیوند (ص:۱۴۳)، حجاب (ص: ۲۱۷)، خجستہ (ص:۲۲۳)، خراب (ص:۲۲۶)، ریختہ (ص:۳۳۵)، رہین (ص:۳۴۴)، زنہار (ص:۳۵۶)، زہے (ص:۳۵۹)، زیاد (ص:۳۵۹)، سبحہ (ص:۳۷۱)، سبیل (ص:۳۷۳)، سپہر (ص:۳۷۳) شیوہ (ص:۴۳۲)، صلا (ص:۴۴۱)، فنادگی (ص:۴۹۴)، نیستاں، نیستی، نیشتر (ص:۶۴۵)، ہرزہ (ص:۶۶۳)، ہمہ (ص:۶۶۵)، موحد (ص:۶۰۵)، ناطقہ (ص:۶۱۵)۔ اسی طرح مرکبات کے درمیان ذیل کے محاورات کی شمولیت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے: آفتابی کرنا (ص:۳۵)، ریختہ کہنا (ص:۳۳۵)، منطبع ہونا (ص:۶۰۱)، مہتابی کرنا (ص:۶۰۷)، بے کشیدن (ص:۶۱۰)، ناقوس کرنا (ص:۶۱۶)، ہوا باندھنا (ص:۶۶۷) وغیرہ۔

اس فرہنگ میں جگہ جگہ ادبی صنعتوں اور رعایاتِ لفظی و معنوی کے تعلق سے اشارے کیے گئے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں غالب کی زبان دانی کو بھی تختۂ مشق بنانے سے مرتب نے گریز نہیں کیا ہے۔ (ص:۵۱۵، ص:۳۷۵ اور ص:۱۴۷)۔ اس سے مصنف کی تنقیدی توجہ کا احساس ہوتا ہے لیکن جس انداز میں یہ اشارے لکھے گئے ہیں، وہ حددرجہ تحکمانہ اور دوسرے نقاد اور محققین کی تحریروں سے بے پروائی کی دلیل ہیں۔ معنیٰ کی تفصیل بتانے میں حالاں کہ فرہنگ نویس نے کم سے کم لفظوں میں کام مکمل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن

الف بائی ترتیب سے ان تراکیب کی یکجائی سے یہ لطف سامنے آتا ہے کہ ہم دیکھ سکیں کہ غالب ایک کلیدی لفظ سے کس طرح نو بہ نو معنوی فضا پیدا کرتے چلتے ہیں۔ غالب کی اس لسانی مہارت کو دیکھنے کے لیے آئینہ، پیانہ، سبک، شوخی، گرمی اور گرم جیسے لفظوں سے بنائی گئی ترکیبات کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ یہیں غالب کا جہانِ معنی پوشیدہ ہے یا گنجینۂ معنی کا طلسم اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

سلیم شہزاد کی یہ کتاب ہر غالب شناس کے لیے ایک لازمی فرہنگ ہے۔ اس کی ناکامیوں سے بھی غالب شناسوں کو روشنی حاصل ہوگی۔ زبان کی بعض خامیاں اس فرہنگ میں موجود ہیں۔ 'آپ' لفظ کا استعمال جن معنوں اور جس جس انداز میں فرہنگ میں ہزاروں جگہ ہوا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ایک علاحدہ فرہنگ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ فرہنگ تیار کرنے والوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے معنوں کو آخری سچائی کے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کی سطح پر حکمِ آخری کا انداز آشکار ہوتا ہے۔ بڑی بڑی لغات مثلاً 'فرہنگِ آصفیہ' اور 'نور اللغات' میں تو شعرائے کرام اور دیگر ادیبوں کے استعمال کو اہمیت دی گئی ہے اور ان کے اشعار سے اپنے پیش کردہ معنی کا جواز پیدا کیا گیا ہے۔ غالب کے اکثر و بیش تر شارحین نے ایک دوسرے کی تشریحات کا بہ غور مطالعہ کیا اور ان کی خوبیوں خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی نئے نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے لیکن سلیم شہزاد نے علمی کاموں کے اس جمہوری رُخ سے تعلق نہیں رکھا اور اتنے بڑے موضوع پر ایک ایسی کتاب تیار کر دی جو تنقیدی صلاح اور مشورے کے دروازوں کو کھولنا نہیں چاہتی ہے۔ میرے لیے یہ ماننا ناممکن ہے کہ سلیم شہزاد نے اس فرہنگ کی تیاری کے دوران غالب شناسی سے متعلق سیکڑوں بنیادی دستاویزات اور شارحینِ غالب کی جلد در جلد کوششوں سے خود کو غافل رکھا ہوگا۔ لیکن نہ جانے کس علمی جلال اور غالب کی مانوس انا پسندی کے زیرِ اثر آ کر ایسی خو اپنائی جس میں یہ لازم ہو گیا کہ پونے سات سو صفحات پر مشتمل فرہنگ نویس کسی ایک کتاب کے نتائج سے استفادہ کرنے کی بات کا بہ بانگِ دہل اعلان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ علمی بخل اور کوتاہ دستی نہیں، بے ایمانی ہے۔

(2011)

رسالہ 'استعارہ' کے اوّلین دو شمارے

گذشتہ چند برسوں میں ضخیم رسائل کی یلغار اردو میں کسی نئے ادارتی کلچر کا اشاریہ ہے۔ سو یا دو سو صفحات کے شمارے پہلے بھی شائع ہوتے تھے لیکن وہ سالنامہ، خصوصی اشاعت یا نمبر کے طور پر، ورنہ چالیس پچاس صفحے میں اردو کی ادبی تخلیقات کی ایک زندہ جاوید بزم سجا دینے کا حوصلہ ہمارے پُرانے مدیرانِ کرام میں ہمیشہ رہتا تھا۔ 'تہذیب الاخلاق'، 'مخزن'، 'ادبی دنیا'، 'ادبِ لطیف'، 'ندیم'، 'زمانہ'، 'نیا ادب'، 'شاہراہ' وغیرہ رسائل کے صفحات سے ہی بڑی تعداد میں ادیبوں اور شاعروں کی فوجیں تیار ہوئیں۔ انھی کے بَل بوتے ایک صدی کے اردو ادب کی تاریخ رقم ہے۔ اسی دوران علی گڑھ تحریک، ہندستان کی قومی تحریک، ترقّی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق، جدیدیت اور مابعد جدیدیت؛ تمام موضوعات سے متعلق اہم مباحث بھی انھی مختصر ضخامت والے رسائل کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

لیکن آج ہندستان سے پاکستان اور بنگلہ دیش تک، پانچ سو سے ہزار صفحات اور مقدور ہو تو اس سے آگے نکلنے کی ادارتی ہَوس کے پیچھے مختلف طرح کی ادبی اور نفسیاتی وجوہات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے مدیران معیار کو بالعموم مرکزِ نگاہ تصوّر کرتے تھے اور اپنے رسالے کو نمائندہ ادب کا ترجمان بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ انتخاب کا پیمانہ قدرے سخت ہوتا تھا اور کھُلے بندوں مصلحت کے جام چھلکانے کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لیے چالیس پچاس صفحات میں بھی اپنے زمانے کا بہترین اور تازہ کار ادب پیش کرنے میں انھیں کامیابی مل جاتی تھی۔ آج شعروں کے انتخاب میں رسوائی کون مول لے، اس لیے صلائے عام ہے۔ ادب لکھنے اور پڑھنے والا تقریباً ایک ہی حلقہ ہے اور رسالے کی اشاعت اکثر یاروں کا ادبی معاملہ ہے۔ تمام دوستوں کی تخلیقات حاصل کریں اور پریس کے حوالے کر دیں، ادارتی ذمّے داری تمام۔ دوستوں کی تحریروں کو مرحلۂ انتخاب میں رد کرنے

یا اُونا نے کا سوال آخر کیوں کر اُٹھے؟ کون ادب کے چکّر میں بنے بنائے تعلقات خراب کرے۔

اکثر رسائل نکالنے والوں کے بعض مخفی یا ظاہر مقاصد یا ارادے ہوتے ہیں۔ جیسے فلاں فلاں ادیبوں (یا دوستوں) کو آگے بڑھانا یا فلاں فلاں کو نیچے گرانا۔ ان بنیادی مقاصد کے لیے ہر شمارے میں کئی مضامین، تبصرے، نوٹس اور خطوط کی اشاعت لازمی ہوتی ہے۔ اس سے الگ، پورے ادبی ماحول میں کسی قبلہ یا قبلہ نما کی تلاش میں اکثر ہمارے مدیرانِ کرام ایک مرکز (یعنی شخصیت) پر ایجاب وقبول کی رسم ادا کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے، پوری ادبی دنیا کے قبلہ وکعبہ کی توصیف میں پچاس صفحات اور اس کے مخالفین کی قدح میں پچیس پچاس اوراق نہ صَرف کیے جائیں تو ماحول سازی کا اصلی فریضہ کیسے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ رسالے کے دوسرے مخفی مقاصد کے لیے بھی خاصے صفحات درکار ہوں گے۔ ایسے میں کوئی رسالہ پانچ سو اور ہزار صفحے تک پھیل جائے تو تعجب کی بات نہیں۔ رسالے کی قیمت ایک سو، ڈیڑھ سو اور ڈھائی سو ہو تو بھی کیا ہرج۔ ایک پس ماندہ اور مفلوک الحال معاشرے کی قوتِ خرید سے رسالے کی قیمت کا تعلق کیوں کر ہو؟ جب ہمیں معلوم ہے کہ یہ رسالہ صرف وہی لوگ پڑھیں گے جن کی تخلیقات یا ذکرِ خیر سے اس کے صفحات جگمگا رہے ہیں یا جن کی تحریریں آئندہ شمارے کی زینت بنیں گی۔

'استعارہ' اسی قسم کا ایک 'تندرست' اور 'صحت مند' رسالہ ہے۔ جس کا پہلا شمارہ ۴۱۶ صفحات پر مشتمل تھا اور ایک سو روپے قیمت رکھی گئی تھی۔ دوسرا شمارہ ۴۴۰ صفحات کی صحتِ مزید کے ساتھ ایک سو پچاس روپے میں دستیاب ہے۔ امریکی خریداروں کے لیے خصوصی رعایت کا اہتمام ہے کیوں کہ جہاں پہلا شمارہ انھیں ۳۰ رامریکی ڈالر میں مل رہا تھا، اس سے ڈیڑھ گنی ہندستانی قیمت والا شمارہ انھیں صرف پندرہ امریکی ڈالر خرچ کرنے پر ہی حاصل ہو جائے گا۔ روپے کی قیمت میں محض تین مہینے میں ایسا زوال آئے گا، شاید ہی کسی ماہرِ معاشیات کو اس کا اندازہ رہا ہو۔ استعارہ کے اہل کار اس کے مخفی اسباب وعلل کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ کچھ تو ہے جس کے سبب یہ بازار بھاؤ گرا۔ کاش! ہندستانی خریدار اسے سستی قیمت پر امریکہ میں خرید پاتے!

ہر رسالے کی طرح 'استعارہ' بھی مدیر کے عہدے سے خالی نہیں بلکہ اسے ایک نہیں، دو دو اصحاب میسّر ہیں۔ اس رسالے میں ایڈیٹر تو دو ہیں لیکن دو شماروں کے ۸۵۶ صفحات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہر سانس پر مدیرِ اول یعنی صلاح الدین پرویز کی حکمرانی ہے۔ صلاح الدین پرویز اردو کے معروف اہلِ قلم ہیں اور نثر ونظم

کی درجن بھر سے زیادہ کتابوں کے مصنف۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ جس زمانے میں ساہتیہ اکادمی کی اردو کمیٹی کے کنوینر تھے، انھی دنوں 'آئڈینٹی کارڈ' ناول پر صلاح الدین پرویز کو ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا تھا۔ [مزید تفصیلات کے لیے راقم کی کتاب 'صلاح الدین پرویز کا آئڈینٹی کارڈ'، (۱۹۹۴ء) ملاحظہ ہو]۔ 'استعارہ' کی اشاعت ان کی شخصیت کا ایک باب نو ہے، اس لیے اس کے مشتملات پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔

صلاح الدین پرویز کے ادبی کاموں پر توصیفی سند عطا کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، دیویندر اسر، آلِ احمد سرور، مغنی تبسم، شمس الرحمان فاروقی، شہریار، حامدی کاشمیری، اسعد بدایونی، آشفتہ چنگیزی، یوگیندر بالی جیسے لوگ ابتدائی زمانے سے ان کے ادبی بہی خواہ ہیں۔ حال کے زمانے میں شمیم حنفی، نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی، حقانی القاسمی وغیرہ صلاح الدین پرویز کی ادبی قدر و قیمت کو پہچاننے والوں میں تازہ واردان کہے جائیں گے۔ پاکستانی ارادت مندوں میں مرحوم سلیم احمد، احمد ہمیش، انتظار حسین، جیلانی کامران، نصیر احمد ناصر وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ حالاں کہ ان میں سے کئی تائب بھی ہوئے اور بعض خاموشی سے ارادت مندی کے راستے سے الگ ہو گئے لیکن صلاح الدین پرویز کے چاہنے والوں میں گوپی چند نارنگ اور محمود ہاشمی کی ہمیشہ قائم رہنے والی سرگرمی اور جاں نثاری اپنی مثال آپ رہی ہے۔

اردو کے ادبی حلقے میں صلاح الدین پرویز کے تعلق سے مختلف طرح کے تنازعات جنم لیتے رہے ہیں۔ ان کے مخالفین اور معاونین دونوں کی تعداد کبھی کم نہیں رہی۔ ان کے غیر ادبی کارناموں پر بھی شعر و ادب کے حلقے میں بات چیت ہوتی رہی ہے۔ گذشتہ تیس برسوں میں گوپی چند نارنگ جیسے اہم ناقد کی سرکردگی میں انھوں نے اپنا ادبی سفر طے کیا۔ کہنا چاہیے کہ نارنگ صاحب کی انھیں کُل وقتی پشت پناہی اور سرپرستی حاصل رہی ہے۔ 'استعارہ' میں تخلیق کار (صلاح الدین پرویز) اور نقاد (گوپی چند نارنگ) کی یکجائی کا باضابطہ اعلان تو نہیں ہے لیکن کھلی شہادتیں موجود ہیں کہ رسالے کی اشاعت کا ایک اہم مقصد یہ دوست داری بھی ہے۔ ان دونوں کے اِرد گرد رسالے کے مضامین، تبصرے، شذرات، مکاتیب اور کبھی کبھی شاعرانہ ٹکڑے بھی چکّر کاٹتے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مقابلے کی دوسری شخصیات [جیسے نارنگ صاحب کے لیے شمس الرحمان فاروقی] کو ہدفِ ملامت بنانا اور انھیں حاصل اوّل مقام کو چھین لینے کا منصوبہ بھی اس رسالے کا ایک اہم کام ہے۔ رسالے کا نوے فی صدی حصہ انھی مقاصد کے حصول کے لیے وقف ہے۔

افتتاحی شمارے میں صلاح الدین پرویز نے 'استعارہ' کی اشاعت کا جواز ان الفاظ میں پیش کیا ہے: 'اردو تخلیق اور ادب کی اندوہ ناک فضا کو جبر و یکسانیت سے نکالنے کے لیے ایک تازہ کار، آزادہ رو تخلیقی 'استعارہ' کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں: 'یہ ہر طرح کی ادبی سیاست، نان سینس سے پاک صاف رسالہ ہے'۔ لیکن اداریے میں بغیر نام لیے شمس الرحمٰن فاروقی کی مخالفت اور گوپی چند نارنگ کا دفاع کر کے رسالے کا اصلی مقصد بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ آدرش وادی جملے اور اعلانیے شاید ہاتھی کے دکھانے والے دانت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس داؤ پیچ کا کھلا اظہار دوسرے شمارے کے اداریے میں مدیرِ محترم کی زبانی سنیے: 'میں نے پہلے شمارے کے تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ رسالہ نکالنے کے لیے سیاست اور مصلحت پسندی کے آداب جاننا انیوار یہ ہے'۔ اس جملے کے بعد پہلے شمارے کا اعلان 'نئی نسل کے فن کاروں کو ایک آزادانہ ادبی ماحول فراہم کرنے کے لیے، یہ رسالہ شروع کیا گیا' اپنے آپ باطل ہو جاتا ہے حالاں کہ شمارہ در شمارہ یہ اعلان شائع ہوتا ہے: 'یہ رسالہ ہر قسم کی سیاست سے پاک ہے، ادبی سیاست معہ...... 'اس میں ذات کا مطلب جو بھی ہو، لیکن یہ یقین ہو جاتا ہے کہ صلاح الدین پرویز کو سیاست اور ادبی سیاست سے کوئی جبلی دل چسپی ضرور ہے، اسی لیے وہ کسی بھی صورت میں اِسے بھولتے نہیں۔ پہلے شمارے میں ادارتی آدرش کا چوغہ ذرا دراز ہو گیا تھا تو اس کی تصحیح دوسرے شمارے میں سیاست اور ادبی سیاست سے شغفِ خاص کے اظہار سے کر دی گئی۔ پہنچی وہیں پہ خاک ....۔

اس رسالے کی اشاعت کا اصل مقصد پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اردو تنقید کی سرخیلی عطا کرنا ہے۔ اس کے لیے ایک مدیر جتنے جتن کر سکتا ہے، اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ ایسے ایسے کرتب موجود ہیں کہ کوئی پڑھنے والا رسالے کی اشاعت کے 'مقصدِ خاص' سے غافل نہیں رہ سکتا۔ شمارۂ اوّل کے اداریے میں صلاح الدین پرویز بتاتے ہیں: ''ہمارا عہد 'قاری اساس تنقید' کا عہد ہے''۔ نارنگ صاحب کے کتابچے کے نام کو واوین میں محصور کر کے پڑھنے والوں کو اس کا موقع بھی نہیں دیا گیا کہ کسی غفلت کے مرحلے میں وہ اس جملے کا عمومی مفہوم بھی سوچ سکیں۔ یہ عمل قاری اساس تنقید کے اصول کے بھی منافی ہے۔ شروع میں ہی انتظار حسین کی ایک مضمون نما تحریر شائع کی گئی ہے جس میں مابعد جدیدیت کے نظریہ ساز کے بہ طور نارنگ صاحب کی عظمت اور سرداری کا والہانہ انداز میں غیر مشروط اعتراف کیا گیا ہے۔ محمود ہاشمی کے مضمون میں بھی بار بار پروفیسر نارنگ کا وردِ موجود ہے اور اردو تنقید میں اُن کے تاریخی رول کا اقرار ملتا ہے۔ جیسے: 'نارنگ صاحب کا یہ سوال: 'یہ مطالعہ

اور یہ تجزیہ بہت صحیح ہے: 'جن کے لیے پروفیسر نارنگ 'قاری اساس تنقید' لکھ چکے ہیں'، یا 'پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے حالیہ ادبی مباحث میں یہ اہم ترین سوال اٹھایا'۔ محترمہ زینب علی (؟) نے لکھا: 'حالی کے بعد وہ پہلا شخص گوپی چند نارنگ ہے جسے جدیدیوں نے لہولہان کردیا، صرف اس لیے کہ ادب کا 'مسیحا' وہ نہ بن سکے'۔

نارنگ صاحب کا تذکرۂ خاص یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بابِ جدید و قدیم میں مولا بخش اسیر کا ۱۷ صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی مضمون ''گوپی چند نارنگ اور قاری اساس تنقید'' عنوان سے رسالے کی زینت بنا ہے۔ یہاں صرف 'قاری اساس تنقید' کتابچہ زیر بحث نہیں بلکہ نارنگ صاحب کی دوسری کتابوں کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نارنگ صاحب کی نثر نگاری کا تعارف اس دل پذیر انداز میں یہاں موجود ہے: 'یہ وہ نثر ہے جو شبلی اور سرسید کے بیچ مفاہمت کی راہ نکالتی نظر آتی ہے'۔ مولا بخش اسیر نے نصیر احمد ناصر پر لکھتے ہوئے بھی نارنگ صاحب کے فضائل سے غفلت نہیں برتی۔ نثر اور نظم کی تعریف کے بیان میں بھی بار بار نارنگ صاحب کے اقتباسات کا استعمال ہوتا ہے۔ ناصر کی فتوحات کے مرحلے میں نارنگ صاحب کو اس طرح یاد رکھا گیا ہے: 'گوپی چند نارنگ کے بعد نصیر احمد ناصر ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے رسالے میں باضابطہ نثری نظم کے جواز کا مقدمہ قائم کیا'۔ نارنگ کی مرتبہ کتاب 'اردو میں مابعد جدیدیت پر مکالمہ' کو قدامت کے باوجود تبصرے کے لائق تصور کیا گیا اور جناب مجید مضمر کا تعریفی تبصرہ شامل کیا گیا ہے۔ عنبر بہرائچی کی کتاب 'سنسکرت شعریات' پر تبصرہ کرتے ہوئے 'استعارہ' کے مدیرِ دوم جناب حقانی القاسمی اس قسم کا ورد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں: ''بھلا ہو گوپی چند نارنگ جیسے ذی علم نقاد کا......''۔

'استعارہ' کے شمارۂ اوّل میں نارنگ صاحب کی براہِ راست شمولیت سے غالباً بالارادہ گریز کیا گیا تھا اور مدیران کرام نے ان کی بہ جسم و جان موجودگی کے بغیر رسالہ مکمل کرلیا۔ دوسرے شمارے میں بھی 'گریز' کی یہ صورت قائم ہے اور نارنگ صاحب کی کسی تحریرِ عالی مقام کی اشاعت نہیں ہو سکی ہے لیکن استعارہ کے صفحات میں ابرار رحمانی اور احمد صغیر سے نارنگ صاحب کی 'ادبی ملاقات' ارادت مندوں کو مایوسی سے بچنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اس رسالے کے پہلے شمارے سے ہی یہ کوشش رہی ہے کہ نارنگ صاحب کو موجودہ دور کے سب سے بڑے نقاد کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس کے لیے چھوٹی بڑی درجنوں تحریروں کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ نارنگ صاحب خود ہی اپنا مقدمہ پیش کریں اور اپنے رسالے میں، اپنے حق میں فیصلہ کرالیں۔ اس انٹرویو میں نارنگ

صاحب نے اپنی اوّلیات اور فضیلتوں کے باب میں کمال انکساری اور سادگی سے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا CLAIM رکھا ہے۔ایک سوال کے جواب میں نارنگ صاحب فرماتے ہیں: 'میری حیثیت فقط بحث اُٹھانے والے یا افہام وتفہیم کرنے والے یا طرفین کھولنے والے کی ہے، کسی ٹھیکے دار یا وکیل کی نہیں جو دفاع کرتا پھرے'۔نارنگ صاحب کے لاشعور میں سرداری (بہ قولِ نارنگ ٹھیکےداری یعنی ادبی ٹھیکےداری) بنیادی پتھر کی طرح موجود ہے،اس لیے سب سے پہلے وہ اس کے انکاری ہوتے ہیں۔نفسیات کا ایک معمولی طالب علم بھی ان کی اس شعوری نفی کو اِثبات ہی تصوّر کرے گا۔اس انٹرویو میں نارنگ صاحب نے اپنے سلسلے سے بالتفصیل وضاحتیں پیش کی ہیں اور اسی بہانے وہ اردو تنقید میں اپنی اوّلیات کے دفتر سجا دیتے ہیں۔مابعدِ جدیدیت سے شغفِ خاص اور سرداری کا تفصیلی انتہا..ان لفظوں میں کرتے ہیں: 'پچھلے تقریباً پندرہ بیس برسوں سے میرا موضوع نئی ادبی تھیوری اور اس کی فکریات ہے جس کی بنیادیں فلسفۂ لسان میں ہیں۔میری تربیت شروع ہی سے اس طرح کی ہے کہ زبان اور لفظ ومعنی کے اثرات میرے لیے کشش رکھتے ہیں۔نئی فکریات، نئی ادبی تھیوری نیز مابعدِ جدیدیت کی طرف کھنچنا اتنا بالقصد نہیں ہے جتنا فطری ہے۔'

نارنگ صاحب اپنے دفاع میں تنہا نہیں کھڑے ہوتے، 'استعارہ' کی بزم میں اُن کے طرف دارِسخن فہموں کی کمی نہیں۔اور طرّہ یہ کہ سب غیر مشروط طریقے سے ان کے لیے رطب اللسان ہیں۔وہاب اشرفی فرماتے ہیں: 'گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' میں اکثر مباحث کا عالمانہ انداز میں احاطہ کرلیا ہے'۔ظفر اقبال اپنی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے نارنگ صاحب کو نہیں بھولتے اور یہ اطلاع بہم پہنچاتے ہیں: 'ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جہاں میری شاعری کا اعتراف کیا ہے، وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ شاعری کچھ لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بھی بنی ہے'۔ناصر شہزاد، انتظار حسین کے مضمون کے دفاع میں اس طرح گویا ہیں: 'انتظار حسین نے یہ قطعی درست لکھا ہے کہ مابعدِ جدیدیت سے متعلق اب تک جو کچھ چھپا ہے، اس میں اہم نظریہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہی نے پیش کیا'۔الہ آباد کے جناب ڈی۔این۔آر یہ، جو غالباً نظام صدیقی کے دوست ہیں، اپنے مطبوعہ مکتوب میں فرماتے ہیں: 'واقعتاً پروفیسر نارنگ حالی کے بعد سب سے بڑے صاحب عہد ناقد ہیں'۔ریڈیو کے فرمائشی گانوں کے طرز پر اس رسالے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خصوصی فرمائش پر صلاح الدین پرویز نے اپنی نظم 'شب ماریہ اور رقص ہوا' شائع کی ہے۔

'استعارہ' کے پہلے شمارے میں صلاح الدین پرویز کی ایک مختصر تحریر پروفیسر نارنگ کی شان میں ہے جس کا عنوان ہے: 'سوریہ کی اگوائی — پریم پتر ایک قلم کار کا'۔ اس میں مصنف نے جہادی انداز میں صورتِ حال کا نقشہ کھینچا ہے۔ ادبی باطلوں کے خلاف مورچہ لیا جا چکا ہے۔ مہابھارت کی پوری تصویر سامنے ہے اور یہ مکالمہ ادا ہو رہا ہے: ''سوریہ! (نارنگ) تم کہاں ہو؟ کیا تم اس یدھ میں رتھ میں میرے ساتھ نہیں بیٹھ گئے''؟ نارنگ صاحب کو سارتھی بنایا جا رہا ہے اور ارجن کی عظمت صلاح الدین پرویز کے علاوہ کسی اور کو کیوں حاصل ہو؟ آگے مزید اطلاعات درج ہیں: ''آج پہلی جون ۲۰۰۰ء ہے۔ 'استعارہ' (ایک) آپ کے ہاتھ میں ہے۔ شاید یدھ شروع ہو چکا ہے''۔ مہابھارت کی مثالوں سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ واقعتاً حق و باطل کی کوئی صف بندی ہو چکی ہے۔ البتہ صلاح الدین پرویز اپنی مختلف تحریروں میں اسی شہیدانہ انداز میں جانبِ مقتل بڑھتے ہوئے بار بار اپنا ذکر کرتے ہیں۔ تحریر و تقریر میں صلاح الدین پرویز کا یہ جہادی رنگ غالباً اُن کا تکیہ کلام ہے، اس لیے اسے اصل معنوں سے جوڑ کر دیکھنا غیر ضروری ہے۔

حق اور باطل کی اس جنگ کا صلاح الدینی پیمانہ قدرے مختلف ہے۔ اُن کے لیے باطل وہ ہے جس نے اُن کی یا اُن کے وکیلوں یا مفسروں کی ادبی حیثیت پر لبیک نہیں کہا یا انھیں اہمیت نہیں دی۔ باطل وہ قوت بھی ہے جو اُن کے یا اُن کے کسی چاہنے والے کے مقابلے میں آ جائے۔ گذشتہ بیس برسوں میں شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھ اردو کی ادبی قیادت آ گئی اور نارنگ صاحب اسے حاصل کرنے میں ذرا پیچھے رہ گئے۔ اب حال میں نارنگ صاحب نے قیادت حاصل کرنے کے لیے 'کرو یا مرو' کا جو انداز اختیار کر لیا ہے تو یدھ کو کون روک سکتا ہے؟ 'استعارہ' کی رزم گاہ میں صلاح الدین پرویز کی سپہ سالاری میں اردو کی موجودہ ادبی قیادت کی جنگ کیسے ہو رہی ہے، یہ دیکھنے اور لطف حاصل کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اردو کی ادبی قیادت کی اس جنگ کو ذرا پیچھے جا کر دیکھنا چاہیے۔ ۱۹۶۶ء میں 'شب خوں' کی اشاعت کے ساتھ ہی شمس الرحمٰن فاروقی نے سرداری کا باضابطہ دعوا تو نہیں کیا لیکن اپنی تنقیدی تحریروں اور اس سے بڑھ کر نوجوان اہلِ قلم کے لیے اپنے پرچے کو وقف کرنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُن کی قیادت استحکام پانے لگی۔ دس پندرہ برسوں میں 'شب خوں' جدیدیت کا ترجمان بن گیا اور فاروقی اس کے قائد، وکیل اور نقاد۔ کلیم الدین احمد، احتشام حسین اور آلِ احمد سرور کی نسل کے بعد کے ناقدین میں شمس الرحمٰن فاروقی کی قیادت اپنے آپ اُبھر کر

سامنے آ گئی۔ اس میں جدیدیت کی فوج کی اجتماعی قوت اور نجی علمی دھاک دونوں کا بڑا رول تھا۔ لیکن گوپی چند نارنگ اس منظم طریقے سے ادبی قیادت حاصل کرنے کی مرحلہ وار ترکیب استعمال نہیں کر سکے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے ادبی کام کاج کے تعلق سے بھی کوئی خاص مستعدی انھوں نے نہیں دکھائی۔ فاروقی کی طرح وقفے وقفے سے ان کی 'اپنی' تنقیدی کتابیں بھی سامنے نہیں آئیں۔ شعبۂ اردو کی کل ہند شخصیت، سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے گہرا تعلق اور سیاسی اثر و رسوخ کے باوجود علمی قد و قامت میں نارنگ اُس طرح اُبھر نہیں سکے۔ نارنگ کلاسیکی ادب کی تفہیم سے اردو ادب میں داخلہ لیتے ہیں لیکن آج ان کے بارے میں کوئی جانتا بھی نہیں کہ وہ کلاسیکی ادب کے بڑے عالم ہیں جب کہ فاروقی نے جدید و قدیم دونوں مراحل میں اپنی مہارت کے ثبوت فراہم کر دیے۔ اب تو وہ داستانی ادب کے بھی سب سے بڑے رمز شناس بنے دکھائی دیتے ہیں۔

اس لیے صلاح الدین پرویز کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ صرف مدحِ نارنگ تک خود کو محدود نہ رکھیں بلکہ نارنگ کے اصل مقابل فاروقی کی قدح میں بھی میدان میں اتریں۔ اس اعتبار سے ایسے شذرات کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ 'استعارہ' کے شمارۂ اول میں اداریے سے ہی فاروقی کا ذکرِ خیر شروع ہو جاتا ہے۔ ناقدین سے شکایت کا باب اس طرح وا ہوا ہے: 'مضمون اگر میر پر لکھا گیا ہو تو عہدِ حاضر کے شہریاروں اور منصوریوں کے حوالے سے میر کو معتبر ثابت کرنا'۔ یہاں سیدھا نشانہ شمس الرحمٰن فاروقی ہی ہیں۔ محمود ہاشمی کا مضمون ''پیچ کشن'' بھی فاروقی کے ''میر شناس'' ہونے پر بعض معترضانہ سوالات قائم کرتا ہے۔ ایسے بنیادی سوالات کے لیے بھی محمود ہاشمی کسی اصولی نکتے کی طرف راغب نہیں ہوتے بلکہ رسالہ 'استعارہ' کے مخصوص اسلوب میں اس طرح کہتے ہیں: (۱) 'کسی شارح یا ناقد نے یا میر کے کسی مداح نے یہ نہیں بتایا کہ میر کو حسین عورتوں سے کتنا شوق تھا۔' (۲) 'میر کب اور کہاں اور فاروقی الہ آباد میں کس روڈ پر اپنی کوٹھی میں، اپنی لائبریری میں آرام فرما رہے ہیں'۔ عتیق اللہ کا مضمون شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری کی تفہیم سے متعلق ہے لیکن اس سے بھی ان کی تحریروں کی اہمیت اور عظمت سے انکار کی بُو آتی ہے۔ اسی طرح مولا بخش اسیر کا موضوع حالاں کہ نارنگ ہیں لیکن وہ بار بار فاروقی سے موازنہ کرانے اور فاروقی کو چت کرانے کی جگت میں گم رہتے ہیں۔ آخری ورق عنوان سے اداریہ دوم میں حقانی القاسمی کا فرمان ہے: 'ادبی افق پر 'شب خوں' مار کر کسی نے اس کی رعنائی، زیبائی چھین لی ہے'۔

'استعارہ' کے دوسرے شمارے میں بھی تدریج فاروقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فاروقی کے رشتے میں بھائی اور رسالہ آج کل، نئی دہلی کے مدیر اعلا جناب محبوب الرحمان فاروقی کے ایک مکتوب بہ نام صلاح الدین پرویز کو سوال و جواب کے کالم میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک صفحے کے خط کے جواب میں صلاح الدین پرویز نے چھے صفحات وقف کیے ہیں اور طنزاً وہ شمس الرحمٰن فاروقی کا نام لیے بغیر اس طرح کے جملے ادا کرتے ہیں: (۱) 'یہ اسلوب بھی میں نے آپ ہی کے خانوادے سے سیکھا ہے'۔ (۲) 'یہ تحریریں یا مباحث وہ ہیں جو آپ کے خانوادے کی فکر اور فلسفہ سے مختلف ہیں'۔ نارنگ صاحب نے اپنے انٹرویو میں جدیدیت کے تعلق سے فاروقی کے ذکر سے عمداً گریز کیا ہے لیکن ان کے بعض جملے یا بیانات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔ دیکھیے، کیا فرماتے ہیں نارنگ صاحب : 'جب کلاسیکیت کے کھنڈروں کا آسیب منہ چڑھانے لگے تو نئی پیڑھی کے افسانہ نگار اور شاعر اپنی برأت کا اظہار کرنے لگے'۔ نارنگ اپنی حیثیت کے مطابق ادب آداب کے دائرے میں رہتے ہیں لیکن اُن کے سرگرم اور جوشیلے وکیل 'استعارہ' کے صفحات پر منصب کی یہ لڑائی اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر لڑ رہے ہیں۔ شکیل اعظمی کے تیور دیکھیے: 'شمس الرحمٰن فاروقی کو واقعی اب شیروانی سے الگ کر کے دیکھنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ یہ بھی پتا چلنا چاہیے کہ ان کے پائپ میں جو تمبا کو سُلگ رہا ہے، وہ صرف دھواں ہی بناتا ہے یا کلیجے کو گرماتا بھی ہے۔'

افتتاحی شمارے میں صلاح الدین پرویز نے صحیح بتایا ہے کہ 'میری تخلیقات ہندو پاک کے عام ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں، اس لیے 'اپنے کلام کی اشاعت کے لیے' وہ یہ رسالہ نہیں نکال رہے ہیں کیوں کہ ان کے سامنے ایک بڑا اجتماعی مقصد ہے لیکن دونوں شمارے کے صفحات یہ بتا دینے کے لیے کافی ہیں کہ انھوں نے یہ رسالہ اپنے مخفی ادبی مقاصد، نارنگ کی وکالت اور اپنی ہر قماش کی تحریروں اور اس پر تعریف و توصیف کی اشاعت کے مقصد سے ہی نکالا ہے۔ رسالے کا آخری کور پرویز نے اپنے خط میں اپنی نظم کے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ اداریہ تو یوں بھی مدیر کی ملکیت ہے ہی۔ اس کے علاوہ وارث علوی، محمود ہاشمی، گوپی چند نارنگ، جیلانی کامران، انتظار حسین، وی۔ پی سنگھ اور دوسرے شمارے میں پھر جیلانی کامران، وہاب اشرفی، عین رشید، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، سیّد محمد اشرف، مظہر الزماں خاں، شعیب شمس اور ترنم ریاض کے تعلق سے صلاح الدین پرویز کے مختصر اور تفصیلی شذرات ہیں۔ ان سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ تحریریں مذکورہ

اصحاب کی شخصیت اورفن کے لیے وقف ہیں بلکہ سچائی یہ ہے کہ ان شخصیات کے بہانے صلاح الدین پرویز نے خود کو یاد کیا ہے۔ ان یادداشتوں میں دوسروں کی مضحکہ خیز تصویروں سے بھی اپنی امیج بنانے کا حربہ استعمال میں لایا گیا ہے۔ ان ادیبوں سے متعلق جو واقعات درج کیے گئے ہیں، ان پر محض صلاح الدین پرویز کی روایت کی بنیاد پر اعتبار کرنا ممکن نہیں۔ بعض تو اللہ کو پیارے ہوگئے، اس لیے ان کی توثیق ممکن نہیں۔ وہاب اشرفی کے تعلق سے جو واقعہ درج ہے، اس سے خود وہاب اشرفی انکار کرتے ہیں۔ اتنی مقدار میں اس قسم کی تحریر کسی دوسرے رسالے میں صلاح الدین پرویز نہیں چھپوا سکتے تھے، اس لیے انھیں اپنا ذاتی رسالہ نکالنے کی ضرورت پڑی۔ وہ غلط کہتے ہیں کہ نئی نسل کی آزادانہ شناخت مستحکم کرنے کے لیے اس جریدے کا اجرا کر رہے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ اپنی ہر قسم کی تحریروں کی بے روک ٹوک اشاعت کے ایک منچ کی انھیں تلاش تھی اور 'استعارہ' یہی فریضہ ادا کر رہا ہے۔

استعارہ کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد صلاح الدین پرویز کے سلسلے سے ایک ادبی ماحول کی تعمیر ہے۔ یہ کیا کہ اُن کی نرگسیت صرف اپنی تحریروں کی بے محابا اشاعت سے سَیر ہو جائے۔ مزا تو جب ہے کہ لوگ باگ بھی اُن کی عظمت کا اعتراف اُسی شد و مد سے کریں۔ مستند لکھنے والوں سے لے کر نو واردین تک ایک تسلسل قائم ہو اور سب بتائیں کہ صلاح الدین پرویز کی ادبی اہمیت کیا ہے؟ ابھی تک رسالے کے صرف دو شمارے آئے ہیں لیکن کس کس طرح سے لوگوں نے پرویز کا ذکرِ خیر روا رکھا ہے، اسے دیکھ کر عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اداریے میں وہ کہتے ہیں: 'اس شمارے میں اردو نظم پر جو مضامین ہیں، ان میں بیش تر حوالوں سے میں نے اپنا نام نکال دیا ہے۔' اس انکسار اور خاکسارانہ اظہار کے بعد رسالے کے اوراق پلٹیے تو 'زخم ہی زخم ہوں تمام فراق' کے مصداق وہ کون سی جگہ ہے جہاں حضور مدیرِ گرامی کا تذکرۂ خاص موجود نہیں۔ اب یہ سوچنا محال ہے کہ مدیر نے 'کرفیو نامحتی' اپنے لکھنے والوں پر نہیں لگا رکھی ہوتی تو رسالے میں ان کی مدح میں آخر کیا کیا ہوتا۔

پہلے شمارے میں محمود ہاشمی نے اپنے مضمون میں صلاح الدین پرویز کی نظم سے دو اقتباسات دیے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی اپنے مضمون میں انھیں 'ایک اہم ترین شاعر' قرار دیتے ہوئے نظم کا حصہ پیش کرتے ہیں۔ مدیرِ دوم حقانی القاسمی کے مضمون میں صلاح الدین پرویز کا ذکر نہیں ہوتا تو تعجب کی بات ہوتی۔ ان کا کہنا ہے: 'صلاح الدین پرویز نے غالب کے لیے جو سات نظمیں لکھی ہیں، اُن میں غالب کی اس جنسی سائیکی کی طرف

شمارے ہیں'۔ یہاں غالب اوران کے قارئین کے ساتوں طبق روشن کرنے کے بعد اصل راز وہ اس طرح افشا کرتے ہیں: 'واتسائن کے کام سوتر کو اُس کی مکمل معنویت اور تہذیبی سیاق وسباق کے ساتھ Re-create کرنے والے شاعر صلاح الدین پرویز.....'۔ مولا بخش اسیر اپنے مضمون میں کہتے ہیں: 'مجھے اردو کے ایک اہم ترین شاعر صلاح الدین پرویز کی ایک بات یاد آتی ہے'۔ دوسرے شمارے میں صلاح الدین پرویز کی شاعرانہ خصوصیات پر تنقیدی مہر ثبت کرنے کی ذمے داری ملک کے ممتاز ناقدین نے سنبھال رکھی ہے۔ نارنگ صاحب نے اپنے انٹرویو میں حسب توقع (یا فرمائش) 'استعارہ' کے مدیرِ محترم کی توصیف میں الفاظ وبیان کے پھول کچھ اس طرح نچھاور کیے ہیں: (۱) 'صلاح الدین پرویز کی شاعری کو دیکھیے' اس کی تعریف تو اَب مخالفین بھی کرنے لگے ہیں۔ (۲) 'جس طرح ہندستان کی شاعری میں پہلا واضح موڑ صلاح الدین پرویز کی شاعری سے شروع ہوتا ہے'۔ (۳) 'ہندستان میں نئی پیڑھی کے ادیبوں نے بعض اچھے ناول بھی لکھے ہیں۔ مثلاً صلاح الدین پرویز کا 'نمرتا'۔ وہاب اشرفی اپنے مضمون میں نارنگ صاحب کے ارشادِ عالی پر آمین کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں: 'صلاح الدین پرویز کے ناول اساطیر، قدیم وجدید ثقافتی تلازمات اور شعری آمیزشوں سے ایک مابعدِ جدید مثال پیش کرتے ہیں' اور ''صلاح الدین پرویز کے یہاں موضوعات اور زبان وبیان کی ایک عجیب وغریب دھنک ملتی ہے'۔۔۔ مجھے اس بیان میں بڑی صداقت نظر آتی ہے''۔ نظام صدیقی 'مابعد جدید تخلیقیت افروز نظمیہ شاعری کی سب سے نمایاں، مختلف اور اہم ترین تخلیق کار' اور ظفر اقبال 'تازہ و نادر کار شاعر' کے طور پر صلاح الدین پرویز کو یاد کرتے ہیں۔ احمد ہمیش اور دیویندر اسّر کے دو پُرانے اور تفصیلی مضامین صلاح الدین پرویز کے فکروفن کے ذرّوں کو آفتاب بناتے ہوئے پھر سے شائع کیے گئے ہیں۔ حقانی القاسمی نے دنیا کی مختلف بڑی زبانوں کے نمایندہ شعرا کی فہرست میں اردو کی طرف سے صلاح الدین پرویز کو شامل کیا ہے۔

اس رسالے کا اچھا خاصا حصہ ادبی ٹوٹنکی کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ تھوڑے وقفے کے بعد مدیر نے جو اپنے نثری شہ پارے بکھیر رکھے ہیں، وہ اصل میں ادبی لطائف کے زمرے میں آتے ہیں۔ فلمی یا بچوں کے رسائل میں ایسے لطائف کی اشاعت کا رواج ہے لیکن اُن کے لکھنے والوں کا نام شائع نہیں ہوتا۔ 'استعارہ' میں مدیر نے باضابطہ ایسے تمام لطیفوں پر بہ طورِ مصنف اپنا نام ٹانکنا ضروری سمجھا۔ چند ایسی تحریریں اور بھی ہیں، لیکن مصلحت کی بنا پر مدیرِ محترم نے اُن پر دوسروں کے نام تفریحاً ڈال دیے ہیں لیکن اندازِ بیان،

مافی الضمیر اور ضمنی شہادتوں کی بنیاد پر اُن کے پیچھے صلاح الدین پرویز کی شخصیت کا عکس جھانکتا نظر آتا ہے۔
زینب علی، میر مہدی تفتہ، اسد محمد خاں (مناجات) اور 'اردو کا ایک پاکستانی قاری' اور 'فریادی' جیسے ناموں کے پردے میں صلاح الدین پرویز کے ماسوا اور کون ہو سکتا ہے؟ ادارتی نوٹنکی کی مثال کے طور پر یہ اعلان ملاحظہ کریں: 'محسن خاں اور طارق چھتاری، تم نے اردو کو بہترین افسانوی سوغات ادا کی ہے لیکن ادھر تمہاری خاموشی بہت کھل رہی ہے۔ زمانہ تمھاری تازہ ترین تخلیقات کا بے چینی سے منتظر ہے۔ لکھنا شروع کردو ورنہ......'
جملہ مکمل کرنے میں فوج داری کا خطرہ ہے۔ شعیب شمس کے مکتوب بہ نام صلاح الدین پرویز کے بارے میں پرویز نے بتایا کہ اس کے متن کو انھوں نے سات بار پڑھا۔ چھٹی بار پڑھتے ہوئے مدیرِ محترم نے جو محسوس کیا، اس کا تاثر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: 'چھٹی بار اس خط کو پڑھا تو ایک ''شدت'' میں گرفتار ہوا اور یہ ''شدت'' اتنی طویل ہوئی کہ میں عشا سے تہجد تک جاگنے میں ''نیند'' کرتا رہا۔'

وہاب اشرفی کے سلسلے سے ایک واقعہ ہے، جو سراسر غلط ہے اور وہاب اشرفی بھی اس سے انکار کرتے ہیں۔ اس میں نوٹنکی دیکھیے: 'اس وقت میرے مَن میں جانے کیا آئی کہ میں نے وہ رقعہ جو اُن (وہاب اشرفی) کی سجدہ گاہ پہ بہت دیر سے پڑا ہوا آنسوؤں میں بھیگ رہا تھا، اٹھالیا۔ اُس پر لکھا ہوا تھا—مابعدِ جدیدیت'۔ دوسرا واقعہ، صداقت اس کی بھی مشتبہ؛ دیکھیے: 'نظم سنتے ہی سَنت (علی سردار جعفری) کی آنکھیں غبار آلود ہو گئیں۔ ''بڑی سہانی نظم ہے''۔ سنت نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا اور بہت دیر تک یوں ہی سنت مجھے اپنے سینے سے لگائے رہا'۔ اس نوٹنکی میں انھوں نے مذہب اور تصوّف کا چھونک دے کر اپنے پڑھنے والوں کو کنفیوژن میں ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن غور کیجیے تو یہ سوچی سمجھی حکمتِ عملی ہے۔ ان کی الوہیت اور کیف و مستی میں سرشاری کا اعلان ایک طرف لیکن اپنا ادبی مفاد سب سے افضل۔ اس لیے رقت جس پہ بھی طاری ہو، کمال یہ ہے کہ باریاب صرف صلاح الدین پرویز ہوتے ہیں۔

طرح طرح کے غیر ذمے دارانہ، بے تکے اور بعض اوقات غیر شریفانہ بیانات مدیر نے صرف اپنے لیے روا نہیں رکھے بلکہ اپنے رفقا اور دوسرے اہلِ قلم کو بھی ایسے کرتب دکھانے کی اجازت دی ہے۔ خود صلاح الدین پرویز کہتے ہیں: 'میری سولہ برس کی عمر ترقی پسند تحریک کے لیے بڑی خطرناک سمجھی جاری تھی'۔ اردو ادب کے ایک درویش کا نقشہ وہ یوں کھینچتے ہیں: 'یہ سمجھتا ہے کہ اب اردو ادب کا سارا علم پڑوس کے ملک میں

پیدا ہورہا ہے اور اس کے ملک میں صرف کدّو کی فصل ہی پھل پھول رہی ہے'۔ مولا بخش اسیر لکھتے ہیں: 'شہریار، ندا فاضلی اور اس قسم کے دوسرے چھوٹے کینوس کے شعرا گھبرا کر اپنے پرانے آشیانے میں چلے آئے'۔ محمود ہاشمی نے اختر الایمان کی شاعرانہ محرومیوں میں ان کی صورت وشکل کو محور بنا کر رنگ ونسل کے امتیاز کا علَم بلند کر دیا ہے۔ شکیل اعظمی صاحب فرماتے ہیں: 'میرے خیال میں نقاد کو گوشت خور ہونا چاہیے، سبزیاں تو گایوں اور بکریوں کے لیے ہوتی ہیں'۔

حقانی القاسمی، 'استعارہ' کے شریک مدیر نے 'بدن کی جمالیات' کے عنوان سے ایک سلسلے وار مقالے کی اشاعت کی ہے۔ جس کی دو قسطیں ہمارے سامنے ہیں۔ قاسمی نے بہت لطف لے لے کر موضوع کے مختلف حصّوں کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ اخلاق اور شرافت کو پسینہ آجائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جذبات بھڑکانے والے اقتباسات مختلف جگہوں سے لے کر مضمون کی شکل دے دی گئی ہے۔ موضوع کے ساتھ ایسا سستا برتاو سید ھے صلاح الدین پرویز پر لکھے گئے مضامین میں بھی نہیں ہے۔ اس تحریر کے مقابلے زبیر رضوی کی خودنوشت ''گردشِ پا'' میں تو بہت کم عریانیت یا فحش نگاری تھی لیکن کوثر مظہری کے تقدیسی تبصرے میں وہ لعن طعن ہے کہ اب سے کوئی ادبی تحریر میں اپنے جذبات یا مدعا کے سچّے اظہار پر روک ہی لگا دے۔ اس تبصرے کو زیادہ اہمیت اور مدیر کے اعزازی نوٹ کے ساتھ مضمون کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرِ 'استعارہ' بھی اسی تقدیسی اور اخلاقی مرکز سے بندھے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات سے طے کیجیے کہ 'استعارہ' کس قسم کی اخلاقیات کی تبلیغ واشاعت میں مصروف ہے: (۱) 'جوان عورتیں اپنے بیٹوں کی قلفی کراتی ہیں اور نامرد اپنے نیفوں میں مُردوں کو چھپانے لگتے ہیں'۔ (صلاح الدین پرویز)۔ (۲) 'جب بوڑھے مرد لونگ کھانے لگتے ہیں اور بوڑھی عورتیں اپنی چھاتیوں سے لونڈوں کو دودھ پلانے کی ناکام کوشش میں مصروف نظر آتی ہیں'۔ (صلاح الدین پرویز)۔ (۳) 'بوڑھے نامردوں کی ذہنی چہل بازیوں کے درمیان مردانہ وار لکھا گیا تخلیقیت پسند آرٹیکل ہے'۔ (نظام صدیقی)۔ (۴) 'یہ زمانہ نامردوں کی چہل بازیوں اور تشریحی ناقدوں کی سوزش کا عہد ہے'۔ (محمود ہاشمی)۔ یہ تمام جملے تفریحی مضامین سے نہیں لیے گئے ہیں بلکہ اکثر تنقیدی مضامین یا نوٹس سے اخذ شدہ ہیں۔ 'استعارہ' کے تنقید نگاروں کی علمی سنجیدگی کا اندازہ ہمیں انھی جملوں سے لگا لینا چاہیے۔

ادبی اعتبار سے اس غیر سنجیدگی کا کلائمکس حقانی القاسمی کے تبصروں میں دیکھنے کو ملتا ہے جنھیں وہ حقانی

تبصرے' کہتے ہیں لیکن یہ ہیں سراسر 'غیر حقانی'۔ بے انصافی، مصلحت اندیشی اور آخری حد تک غیر ذمے دارانہ بیانات سے ان تحریروں کو سجایا گیا ہے۔ ان کے چند جملے ملاحظہ کریں: (۱) 'کتاب (باقر مہدی کی) کے ٹائٹل پر قینچی اور کٹے ہوئے دھاگوں، رسیوں کی ایسی شبیہ بنائی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی درزی کے مضامین کا مجموعہ ہے'۔ (۲) 'باقر مہدی کو اس کتاب کا نام رکھنا چاہیے: 'شعری عدم آگہی'۔ (۳) 'اگر میں وہاب دانش کی نظموں کے مکمل سیاق وسباق میں یہ کہوں کہ وہ میراجی، ن۔م۔راشد اور اختر الایمان سے اچھے شاعر ہیں تو اردو کے سارے نقاد لٹھ لے کر پیچھے پڑ جائیں گے'۔ (۴) 'ان (سیّد محمد اشرف) کو یقیناً افسانے کی اُس کڑی سے نہیں جوڑا جا سکتا جو تصنع سے لپٹی ہوئی قرۃ العین حیدر کے فکشن میں ملتی ہے'۔ ایسے تنقیدی فیصلوں اور تجزیوں کو 'حقانی' کہنا بے حیائی ہے۔ ایسے موقعے سے اختر الایمان کی نظم 'میرا نام' کے چند مصرعے حقانی صاحب کی خدمت میں بلا تبصرہ پیش ہیں:

ہیں بہت ایسے لوگ بھی جن کے
نام تو ٹھیک ہیں مگر اطوار؟
بیچتا ہے، مدک، چرس، کوکین
روز ملتا ہے راہ میں غفار
ایک بدر الدجےٰ ہیں برسوں سے
ایسے ہوتے ہیں شب کو جلوہ بار
شاہدِ مے کی اُن سے فرمائش
کیجیے، چٹکی بجی کہ سب تیار
کیسا موزوں ہوا ہے اُن پہ نام
بخشیے اُن کو خلعت و دستار!

دونوں شمارے میں فکشن کے موضوع سے مشرف عالم ذوقی کا ایک ایک مضمون شامل اشاعت ہے۔ شمارۂ اوّل میں ۲۵ صفحات میں پھیلا ہوا ہے: 'اردو فکشن۔ تیس برس'۔ اسے بھی افسانہ سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ غیر ضروری بیانات، متنازعہ ریمارکس، بے سر پیر کے فتووں کے دھوئیں میں یہ مضمون اپنے علمی انجام سے بے خبر

ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے 'ادیب بہ نام جاہل مدیر' کا ایک سوال قائم کیا ہے اور انجانے میں کیا خدا لگتی کہہ دی ہے: ''پچھلے دس برسوں کا المیہ یہی ہے کہ ہمارے پٹے 'ادیب مدیر بن گئے'' ۔کیا یہ جملہ وہ صلاح الدین پرویز کے حضور پیش کررہے ہیں؟ دوسرے شمارے میں ذوقی کا مضمون تین خواتین افسانہ نگاروں ترنم ریاض، تبسم فاطمہ اور غزال ضیغم کی قدر شناسی کے لیے وقف ہے۔ پرانے اور نئے افسانوں کے موضوعات اور رویّوں سے موازنے میں عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کو تہہ تیغ کر کے مذکورہ افسانہ نگاروں کے سر پہ تاج فضیلت رکھنا ادبی اور تنقیدی مذاق کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حالی بہت پہلے کہہ گئے ہیں: خاک کو آسماں سے کیا نسبت؟ 'اردو نظم کی تہذیبی تخلیقیت کی نیوکلیائی فوق متنی تنقید' عنوان سے سولہ صفحات پر مشتمل نظام صدیقی کا مضمون ایسی زبان میں لکھا گیا ہے کہ اگر مدیر محترم اس کے اردو یا انگریزی ترجمے کی سہولت بہم پہنچاتے تو کچھ لوگوں کا بھلا ہو جاتا۔ اس مضمون کے چھے صفحات تو سیدھے صلاح الدین پرویز کی بارگاہ میں خراج عقیدت ہی ہیں۔

'استعارہ' کے صفحات پر اردو کے ادبی ماحول اور ہمارے لکھنے والوں کے مزاج و اطوار کے بعض اہم نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بالخصوص 'باب ربط' میں جو مکتوبات شامل ہیں، اُن کے لکھنے والوں کے نام اور ادبی مرتبے کے ساتھ متن اور اس کے معنی پر غور کریں تو ذہن کام نہیں کرتا کہ ایک زوال آمادہ معاشرے میں اخلاقی زوال اور تہذیبی گراوٹ کا یہ عالم ہو جائے گا۔ وہاب دانش اچھے بھلے شاعر تھے، کہتے ہیں کہ 'اس صدی کے تم واحد شاعر ہو جس سے میں عشق کرتا ہوں'۔ ایک صاحب ڈی۔ این۔ آریہ کہتے ہیں: 'استعارہ' ہندستان کے تمام پرچوں کو صدیوں پیچھے چھوڑ گیا ہے''۔ اسی طرح ظفر اقبال جیسے اہم شعرا 'استعارہ' کی بزم میں فاروقی سے برأت اور نارنگ کی حلقہ بہ گوشی کا خوشامدانہ اعلان کرتے ہیں اور درمیان میں صلاح الدین پرویز کے لیے بھی چاپلوسی بھرے الفاظ کی گنجایش نکالتے جاتے ہیں۔ مکتوبات میں پاکستان سے ناصر بغدادی اور ہندستان سے ساجدہ زیدی نے بچے اور کھرے لکھنے والوں کی طرف سے اپنی باتیں رکھ دی ہیں۔ ساجدہ زیدی نے گوپی چند نارنگ کے تعلق سے چند بے حد دل چسپ جملے بھی لکھے ہیں، ملاحظہ کیجیے: 'گوپی چند نارنگ پر تو پچھلے چند سالوں میں اتنی تنقیدیں دیکھی ہیں کہ غالب کی دو صد سالہ جوبلی کے دوران غالب پر بھی نہ دیکھی ہوگی۔ اُن کی ایک کتاب نکلتی ہے تو اس پر کئی کتابیں آجاتی ہیں اور ایک مضمون شائع ہوتا ہے تو اس پر مضامین کے ڈھیر لگ جاتے ہیں'۔

'استعارہ' صلاح الدین پرویز نے اپنے ادبی کیریر کے استحکام کی غرض سے آخری حربے کے طور پر نکالا ہے۔ نارنگ صاحب بھی عمر کی اُس منزل میں پہنچ گئے ہیں کہ زیادہ دیر صبر کا یارا نہیں رہتا۔ دونوں اپنی بچی کھچی فوج اور طاقت جمع کر کے 'استعارہ' کے راستے ادبی قیادت کا منصب پانا چاہتے ہیں۔ اس لیے 'پسندیدہ' لکھنے والوں کا بے طرح اجتماع اس رسالے میں دیکھنے کو ملے گا۔ ایک ہی شخص کی غزل بھی ہے، نظم بھی، خط بھی۔ اُسی پر ایک عدد مکمل مضمون ہے تو دوسرے مضمون میں ضمنی طور پر ذکر۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کی کتاب، چاہے وہ دس برس پُرانی کیوں نہ ہو، اس پر تبصرہ بھی شاملِ رسالہ ہوگا۔ چوں کہ نارنگ صاحب کی قیادت میں، صلاح الدین پرویز کی نظامت میں بہ خوشی چلنے والے لوگوں کو ہی استعارہ کی بزم میں نمایندگی ملتی ہے، اسی لیے اتنی ضخامت کے باوجود لکھنے والوں کی تعداد کم ہے اردو ادب کے 'آفتاب و ماہتاب' قرار دیے جانے کے باوجود 'استعارہ' کے مدیر اور دوسرے لوگوں کو ادب کے عوامی منچ پر پھر سے سرفرازی حاصل کرنے کے لیے امتحان سے گزرنا ہوگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایسے محدود مقاصد کے تحت شائع ہونے والے رسائل ہزار دولت اور بڑے بڑوں کی پُشت پناہی کے باوجود نہ زیادہ دنوں تک جاری رہ پاتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شعر و ادب میں اعتبار حاصل کرنے کا کام اتنا آسان ہوتا تو سب تیس مار خاں وقت کی دھول چاٹنے کے بہ جائے سورج، چاند اور ستارے کی طرح روشن ہوتے!!!

(1999)

بہت شور سُنتے تھے.........

(ادبی اخبار 'نقاد' کا جائزہ)

تیسری بار شہرِ عظیم آباد سے اخبار 'نقاد' زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء کے دوران کئی ماہ تک اس کے آٹھ صفحاتی شمارے شائع ہوتے رہے۔ پھر اب سے تین چار برس قبل چند شمارے اہم افسانہ نگار جناب شموئل احمد کی نگرانی میں شائع ہوئے۔ اِدھر کئی اخباری اعلانات کے بعد سولہ صفحات پر مشتمل یکم تا ۱۵ ر اکتوبر ۲۰۰۵ء کا افتتاحی شمارہ سامنے آیا ہے۔ ظاہری شکل و صورت میں "نقاد" ہر دور میں پچھلی اشاعت سے آگے بڑھتا گیا۔ تازہ شمارہ تو یقیناً صوری اعتبار سے بے انتہا جاذبِ نظر دستاویز بن گیا ہے۔ شعر و ادب کو موضوع بنا کر کبھی کبھار اخبارات نکلتے رہتے ہیں اور ان کی اکثر و بیشتر ادبی سے زیادہ ہنگامی یا گاسپ کی حیثیت ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے مناسب معلوم ہوا کہ اس اخبار کے پہلے شمارے پر اُسی اخبار کے مخصوص انداز میں کچھ نرم گرم تبصرہ کروں۔ حلقۂ احباب کے علما و فضلا پر لکھنا عام طور پر سخت امتحان کا باعث ہوتا ہے لیکن بہ حکمِ اقبال : چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ!

مجھے یاد آتا ہے کہ نقاد کے دورِ اوّل میں پہلے صفحے پر شہریارؔ کے ایک انٹرویو میں بہار کے طلبہ کی صلاحیت سے انکار کرنے کے لیے اُن کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ تازہ شمارے کی بسم اللہ شہریار کی نظم "برہنہ پاؤں" سے ہو رہی ہے۔ ۱۸ ر برسوں میں شاید یہ نقطۂ نظر کی واضح تبدیلی کا ثبوت ہے۔ مجھے اختر الایمان یاد آتے ہیں : یہ لڑکا پوچھتا ہے، اختر الایمان تم ہی ہو؟

'منظر، پس منظر' میں مدیرِ اعزازی معروف افسانہ نگار جناب رحمان شاہی کا تفصیلی مضمون بہار میں انجمن ترقی اردو کے تنازعات اور ڈرامائی مفاہمت و ایا خلیق انجم کے بیچ مالی معاملات کے اندیشوں کا احاطہ کرتا

ہے۔ خبر نویسی میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے لیے ایک خودساختہ کردار 'خبرچی' (ترکیب کے لیے داد دیجیے؛ چہ معنیٰ دارد؟) پیدا کر کے قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ پتا نہیں کیوں ساری باتیں کہنے کے باوجود اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ رحمان شاہی کسے قصوروار سمجھتے ہیں؟ آخر کون سا خوف ہے کہ وہ کچھ واضح، حتمی یا فیصلہ کُن انداز میں گفتگو کرنے سے گریز کرتے ہیں؟ نقّادی اور مصلحت اندیشی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کیا یہ معقول وقت نہیں کہ انجمن ترقّیِ اردو کے مفاد پرست اور اسے ذاتی اجارہ سمجھنے والے عناصر کے خلاف 'نقّاد' مورچہ بندی کرے اور اردو کے سچّے چاہنے والوں کا دل جیت لے؟

تخلیقی شہ پاروں کے انتخاب میں 'نئے فن کار' کے بہ طور محترمہ صدف معصوم کی چار نظمیں اور محترم جابر حسین صاحب کی کتاب ''بے اماں'' سے ایک کہانی شامل ہیں۔ دونوں فن کاروں کے تعارف میں بے جا مدافعت یا وکالت اس بات کا اشاریہ ہے کہ انھیں اب تک ادبی حلقے میں پوری شناخت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ دونوں مصنّفین کی کوئی نئی تحریر شامل کرنے کے بجاے مدیران نے ان کی کتابوں سے اخذ شدہ مواد پر ہی صبر کر لیا۔ شمارۂ اوّل میں جب نئی تخلیقات کی حصولیابی کا یہ عالم ہے تو آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

اخبار کا ایک چوتھائی حصّہ ممتاز نقّاد پروفیسر وہاب اشرفی سے عالم خورشید، اختر واصف اور رحمان شاہی کی تفصیلی گفتگو کے لیے وقف ہے۔ یہ بات چیت اگر مرتّب کردی جاتی تو اس کی غیر ضروری تفصیل سے پڑھنے والے محفوظ ہو جاتے۔ کام کی بہت ساری باتیں ہیں، صرف انھیں ہی پیشِ نظر رہنا چاہیے تاکہ قارئین انھیں گرہ میں باندھ سکیں۔ اس طرح اخبار کے دو صفحات بچائے جاسکتے تھے۔ اس ایڈیٹنگ میں فضول سوالات یا ذیلی سوالات کے نام پر غیر ضروری مداخلت سے پڑھنے والوں کا وقت بچایا جا سکتا تھا۔ ''تخلیقی تنقید'' کے سلسلے سے وہاب اشرفی کے معروضات بڑے فیصلہ کُن ہیں۔ انھوں نے بھینس کی مثال دے کر طنز کا گہرا وار کیا ہے۔ تخلیقی تنقید کے علَم برداروں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ انٹرویو لینے والے تینوں تخلیق کاروں کو تخلیقی تنقید، تاثراتی تنقید، تنقید کی زبان، ترقّی پسندی، جدیدیت، مابعدِ جدیدیت، افکار و نظریات میں لین دین وغیرہ متعدد موضوعات کے تعلق سے وہاب اشرفی نے جس درسی انداز میں سلسلے وار طریقے سے تعلیم دی ہے، اس سے انٹرویو لینے والے طفلِ مکتب سے زیادہ معلوم نہیں ہوتے۔ ایک جگہ بھی وہاب اشرفی نے انھیں موقع نہیں دیا اور ان موضوعات پر انٹرویو لینے والے دَم بہ خود رہ کر پروفیسر موصوف کی عالمانہ گفتگو سننے سے زیادہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ حالاں کہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مذکورہ موضوعات پر اس انٹرویو میں وہاب اشرفی نے جو کچھ کہا

ہے، وہ اپنی گذشتہ کتابوں میں مزید صراحت کے ساتھ انھیں پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔ ادب اور سماج کی مبادیات اور علوم وفنون کے ارتقائی عمل سے غافل لوگوں کی عالم ناقدین کیسی حجامت بناتے ہیں، اس کا یہ انٹرویو بہترین ثبوت ہے۔ اس لیے یہ گفتگو نہیں، ایک غیر مرتب سوالنامے کا جواب محض ہے۔

وہاب اشرفی نے اپنے انٹرویو میں انیس رفیع اور عبدالصمد کے بارے میں بہت کام کی باتیں کہی ہیں۔ رحمان شاہی نے انیس رفیع کو نمائندہ افسانہ نگار کے بہ طور پیش کیا لیکن وہاب اشرفی نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا کہ وہ مین اسٹریم کے لکھنے والے ہیں ہی نہیں۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ وہ ریجنل یعنی علاقائی اہمیت کے افسانہ نگار ہیں۔ اسی طرح عبدالصمد کے تعلق سے ''بڑے ناول نگار'' کی صفت پیش ہونے پر وہاب اشرفی نے زبردست اعتراض کیا ہے۔ بڑے ناول نگار کے معنیٰ انھوں نے قرۃ العین حیدر یا اُن کے رینک کے لکھنے والوں سے لیے ہیں۔ عبدالصمد کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اگر انھیں آگے بڑھنا ہے تو ''دوگز زمین'' سے الگ راہ منتخب کرنی ہوگی۔ وہاب اشرفی نے نہ جانے کس جذب اور سرشاری کے عالم میں عبدالصمد کو مشورہ دیا کہ سماجیات، سیاسیات اور معاشیات کو تیاگ کر انھیں ''جنسیات'' کو موضوع بنانا پڑے گا تب جا کر وہ اردو ناول کا نیا منظر نامہ مرتب کر سکتے ہیں۔ وہاب اشرفی بالعموم اپنے خیالات پیش کرنے میں اس قدر لبرل ہیں کہ کئی بار دوٹوک باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے میں انیس رفیع اور عبدالصمد کے بارے میں اس انٹرویو میں اُن کے خیالات دل چسپ اور نہایت افادہ بخش معلوم ہوئے۔

وہاب اشرفی صاحب سے انٹرویو کے دوران '۱۹۷۰ء کی نسل' اور '۱۹۸۰ء کی نسل' کو موضوع بنا کر کئی سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ وہاب اشرفی نے جواب دیتے ہوئے انٹرویو لینے والے اصحاب کے ذہن کو کشادہ کرنے اور کنفیوژن کو گھٹانے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہالیانِ 'نقاذ' خود کو ''۱۹۸۰ء کی نسل'' کے نمائندہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کہیں کہیں ''ہماری نسل'' کے پُر تکبّر تمغے بھی بٹھائے گئے ہیں۔ تاریخ سے نسل کا تعلق جتنا حتمی سمجھا جا رہا ہے، ویسا ہوتا نہیں۔ پانچ، دس یا بیس برس میں سب کچھ بدل جائے گا، یہ سمجھنا بھی معقول بات نہیں۔ ادب تواتر اور تسلسل میں فروغ پاتا ہے اور ایک ایک اینٹ رکھ کر عمارت تیار کی جاتی ہے۔ دونوں نسلوں میں کون زیادہ طاقت ور ہے اور اردو میں کس کا سکّہ چلنا چاہیے، اس پر بار بار 'نقاذ' کے صفحات میں سرگوشی ملتی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے دوران جن لوگوں نے لکھنا شروع کیا، ۱۹۸۰ء کے بعد، ۱۹۸۰ء کی نسل سے زیادہ تجربہ کار، پختہ قلم، مشّاق اور جہاں دیدہ انھیں بہر طور ہونا تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ ۱۹۸۰ء کے آتے ہی ۱۹۷۰ء کے لوگوں نے قلم کاغذ دریا بُرد کر

کے جنگل کی راہ لے لی۔ ایسی صورتِ حال میں ۱۹۸۰ء والوں کے مقابلے اب بھی ۱۹۷۰ء کی نسل کی زیادہ پذیرائی ہو تو اسے ''نسلی نابرابری'' کے بجائے لکھنے کے معیار و مقدار کے حوالے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

آخر سلام بن رزاق اور شوکت حیات کے مقابلے رحمان شاہی اور اختر واصف کی بہ حیثیتِ افسانہ نگار اردو ادب میں آج کی تاریخ میں کیسے جگہ بن سکتی ہے؟ انصاف اور معروضیت بھی کوئی شے ہے یا نہیں؟ آپ کے پاس جو ادبی پونجی ہے، اسی کی بنیاد پر قارئین یا ناقدین آپ کے حق یا مخالفت میں فیصلہ کریں گے۔ اسی لیے پٹنہ میں منعقد ''۱۹۸۰ء کے بعد اردو افسانہ'' سے می نار میں ۱۹۷۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کرنے والوں کو مقابلتہً زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ رحمان شاہی صاحب تین دنوں تک لگاتار سے می نار کے تمام جلسوں میں شریک نہ ہو سکے ورنہ انھیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا کہ سے می نار میں اُن کے حلقۂ دوستاں یا اُن کی 'نسل' سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں میں مشرف عالم ذوقی، شاہد اختر، غزال ضیغم، شمس الرحمان فاروقی، خورشید اکرم، صغیر رحمانی وغیرہ پر خصوصی مقالے پڑھے گئے۔ جی ہاں، شمس الرحمٰن فاروقی بھی ۱۹۸۰ء کے بعد کے ہی افسانہ نگار ہیں۔ اس کے علاوہ عمومی مقالات میں تو کئی بار اختر واصف یا رحمان شاہی صاحبان کا بھی بہ اہتمام ذکر ہوا۔ اس سے زیادہ ایک قومی سے می نار سے ایک ایک فرد کو انفرادی طور پر اور کیا چاہیے؟

ایک صفحے پر خالد عبادی کی چند غزلیں، اس پر جناب آفاق عالم صدیقی (غالباً یہ خالد عبادی کے عزیز ہیں) کے تاثرات شائع کیے گئے ہیں۔ جناب آفاق نے اپنے برادرِ بزرگ کی شاعری کو شکیب جلالی سے آگے کی شاعری قرار دیا ہے۔ اسی لیے ''نقاد'' نے ایک صفحے پر شکیبؔ کی چند غزلیں شائع کر دی ہیں کہ لوگ موازنہ کر کے خود فیصلہ کر لیں۔ اہالیانِ نقاد کے لیے میرا یہ مشورہ ہوگا کہ ایسے لایعنی دعوؤں کے رد و قبول دونوں سے گریز کرنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ جناب آفاق نے صرف شکیب کا نام لیا، انھوں نے اختصار اور انکسار سے کام لیا، وہ چاہتے تو بانی، زیب غوری، حسن نعیم، ظفر اقبال، شہریار، سلطان اختر، محمد علوی، عرفان صدیقی سب کا نام لے سکتے تھے کہ اُن سے آگے کی شاعری حضرتِ خالد عبادی فرما رہے ہیں۔ حالیؔ کہہ گئے ہیں: خاک سے آسماں کو کیا نسبت؟

آج کے مشہور زود نویس مشرف عالم ذوقی کے ناول ''پو کے مان کی دنیا'' پر تقریباً ڈھائی صفحات پر مشتمل اختر واصف کا تبصرہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کالم کا نام ایک جگہ ''اردو ادب کے مینار'' اور دوسری جگہ ''اردو ادب کے نئے مینار'' مندرج ہے۔ وہاب اشرفی نے ''بڑے'' لفظ پر اعتراض کیا تھا، اب ''مینار'' پر کون کس کو ٹوکے۔ مینارِ اوّل ہیں مشرف عالم ذوقی اور مینارِ دوم ہوں گی محترمہ ترنم ریاض۔ یعنی مینار ہونے کے لیے قطب

مینار کے شہر یعنی دہلی میں بسنا ضروری ہے۔ آیندہ شمارے میں مشرف عالم ذوقی کا خصوصی انٹرویو اُن کے تازہ ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' کے حوالے سے شامل کیے جانے کا اعلان شائع کیا گیا ہے۔ ابھی حال میں اُن کے پرانے ناول ''بیان'' پر ''جہانِ اردو'' رسالے کے ایک خصوصی شمارے اور مکمل کتاب کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ سولہ صفحات کے اخبار کے تن بدن کو ملحوظ رکھتے ہوئے تناسب اور توازن کے تعلق سے کسی کے ذہن میں بعض سوالات قائم ہو سکتے ہیں۔ کہیں کسی شخص خاص یا مخصوص گروہ کو مرکز میں رکھ کر اس ادبی اخبار کے تار و پود تو نہیں بُنے گئے ہیں؟ خاص طور سے یہ شبہ اس وقت یقین میں بدلتا نظر آتا ہے جب اختر واصف یعنی رسالے کے ترتیب وتہذیب کے لیے ذمے دار ادیب اپنا مضمون مشرف عالم ذوقی کی خدمت میں اس انداز سے عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں: ''انسانی تجربات سے نچوڑا گیا یہ ہے وہ وژن جو ایک نیا ادیب ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ گذشتہ کئی دہائیوں سے ہمارے سامنے وہ ادب لایا جا رہا تھا جو وژن سے عاری تھا۔ صرف وقوع کو بیان کر دینے یا وقوعے پر اپنا (اپنے) ری ایکشن (تاثرات) کو دہرا دینے سے ادبِ عالیہ کی تخلیق ممکن نہیں۔ یہ چند دہائیاں انتہائی حد تک مایوس کُن رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اردو کا دامن اعلا تخلیقی ادب سے خالی ہو چکا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول ایک نئی جوت جگا رہا ہے۔ اردو ابھی زندہ ہے اور اس کا دامن اعلا تخلیقی ادب سے خالی نہیں ہوا ہے''۔ یہ نہ تنقید ہے، نہ تخلیقی تنقید اور نہ ہی اسے تاثرات کے ذیل میں رکھنا چاہیے۔ یہ بیان شعر و ادب کی تاریخ اور تخلیقی بہاو سے غافل ایک انجان شخص کی بڑبڑاہٹ سے زیادہ کچھ نہیں۔ ''چند دہائیاں'' مایوس کُن رہیں اور اچانک مشرف عالم ذوقی ادبِ عالیہ لے کر ۲۰۰۵ء میں نمودار ہو گئے۔ ادبی تاریخ سے ایسا مذاق بے وقوفی کے علاوہ ظالمانہ اور مجرمانہ حرکت ہے۔

اس ادبی اخبار کا نام یوں تو ''نقاد'' ہے لیکن اسے سب سے زیادہ چڑ تنقید سے ہی ہے۔ وہاب اشرفی کا انٹرویو نہ جانے کس وجہ سے شامل ہوا ہے ورنہ قیصر رضا اور شکیل الرحمان کے یک صفحاتی مضامین تنقید نگاروں پر یا اردو ادب پر حملہ کے بہ طور شامل کیے گئے ہیں۔ قیصر رضا صاحب ''نقاد'' کے عہدِ گذشتہ کے نقاد ہیں، اس لیے تقریباً دو دہائیوں کے زنگ آلود قلم کو باہر نکالتے ہوئے انھوں نے تنقید کو ''خرافات'' قرار دے دیا۔ ان کے مضمون کا عنوان ہے ''اجتماعی تنقید'' جس کا مطلب مجھ کم علم کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مالِ غنیمت کو مل بانٹ کر کھانے کی تاکید کی جاتی ہے۔ شاید یہاں ''اجتماعیت'' کا یہی مقصد ہے۔ لاش کو گِدھ مل جُل کر نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ خدا ایسی تنقید (اجتماعی) سے اردو معاشرے کو محفوظ رکھے۔ ہماری ''خرافاتی'' تنقید میں ابھی بہت دَم خم

ہے۔ پتا نہیں کیوں، ایسے دعووں سے قبل قیصر رضا اور پھر 'نقاد' کے مدیران نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ ''خرافاتی تنقید'' کا کوئی نیا دبستان وہ خود تو نہیں قائم کر رہے ہیں؟

جس طرح جواں سال ادیبوں میں زود نویسی کے لیے مشرف عالم ذوقی شہرت رکھتے ہیں، اسی طرح کہنہ سال مصنفین میں محترم شکیل الرحمان صاحب اپنے بے تحاشا لکھنے، شائع ہونے کی وجہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ گذشتہ دو دہائیوں میں شکیل الرحمان صاحب کے ہاں یہ رفتار آئی ہے ورنہ اُن کی افسانہ نگاری اور تنقید نگاری ابتدائی تیس برسوں میں بہت کاہلی سے قدم دو قدم چلتی رہی۔ ''جمالیات'' ان کا خاص میدان کہا جاتا ہے اور دنیا کے شعر و ادب میں اس اصطلاح کے جو بھی مفاہیم رہے ہوں گے، شکیل الرحمان ان سب سے لاتعلق ہو کر کچھ اپنی راگنی چھیڑتے ہیں۔ ان کے متفرق مضامین کی تعداد واقعتاً ہزاروں میں ہوگی لیکن کوئی بتادے کہ ایک عدد ایسا مضمون بھی اُن کے قلم سے نکلا جس میں صاف صاف یہ بتایا گیا ہو کہ جمالیات کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ کون سے اجزا ہیں جن کی بنیاد پر ادبی تخلیق کو جمالیات کی ترازو پر تولا جاسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے، میری یہ باتیں بعض سنجیدہ ادیبوں کو ناگوارِ خاطر لگیں لیکن میری گزارش ہوگی کہ کبھی شکیل الرحمان صاحب کے دس بیس مضامین ایک ساتھ مطالعے کی میز کی زینت بنائیں۔ یا اُن کی کسی کتاب کو صفحۂ اول تا آخر ایک یا دو چار لگاتار نشستوں میں پڑھنے کی زحمت فرمائیں۔ وہ کس طرح غیر متعلق یا بے سروپا یا لایعنی باتوں کو نہایت غیر سلسلے وار ڈھنگ سے اپنے مضامین اور کتابوں میں شامل کیے بیٹھے ہیں، اس کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا۔

''نقاد'' کے شمارۂ اول میں ''ادبی نظریے'' عنوان سے شکیل الرحمان صاحب کا جو مضمون شامل ہے، اس میں ترقی پسند تحریک کے بارے میں ان کا یہ کہنا ''نام نہاد تحریک کے پورے دور میں کوئی بڑی تخلیق سامنے نہیں آئی''، علمی اعتبار سے غفلت شعاری کے علاوہ اور کیا ہے؟ جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت کے بارے میں بھی اسی طرح کے ارشاداتِ عالیہ شکیل الرحمان صاحب کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان کا ایک اور قولِ زرّیں ملاحظہ کریں : ''اردو میں فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ ادب و شاعری پر گفتگو کرنے کا اہل نہیں''۔ انھوں نے کہیں صاف لفظوں میں بتایا نہیں لیکن وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''اس باب میں خاکسار کی خدمات عمارتِ تنقید پر کلغی کی طرح نمایاں ہیں''۔ غرض پورا نوشتہ فضولیات، ذہنی ترنگ یا 'بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ' انداز کا ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ بے تکان لکھتے رہنے اور خود پر بحجم شحیم کتابیں چھپوانے کے باوجود شکیل الرحمان کو کسی بھی اہم نقاد نے اردو کے معروف نقادوں کی صف میں جگہ نہیں دی۔ کسی موضوع کے تعلق سے شکیل الرحمان کا ایک اقتباس بھی

کسی سنجیدہ عالم نے کہیں استعمال کیا؟ "نقاد" کو قارئین کے درمیان مقبول بنانا ہے اور بعض بنیادی موضوعات پر بحث قائم کرنی ہے تو قیصر رضا یا شکیل الرحمان جیسے افراد کے مضامین کی اشاعت سے گریز کرنا چاہیے۔

اخبار کے سولھویں صفحے پر "آڑی ترچھی خبریں" عنوان سے پانچ مختصر نوشتے پیش کیے گئے ہیں۔ "ذکر ادیبوں کی خستہ حالی کا" عنوان سے جو تراشا شامل کیا گیا ہے، اُس میں "بغضِ معاویہ" کی بو آتی ہے۔ شگفتگی کے بجائے زہرناکی اور کردار کشی کا معاملہ ہو جائے تو ظرافت درجۂ اعتبار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ظرافت لازماً نیک لوگوں کا فن ہے؛ ذہن اور دل دونوں صاف ہوں، تب یہ لطف دیتی ہے۔ "نقاد" کے مدیران یا تو قلب کی صفائی کرائیں یا ایسے کالموں سے پرہیز کریں۔

اداریے میں رحمان شاہی صاحب نے تجدید اشاعت کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ادبی گروہ بندیوں کے خلاف صدائے احتجاج کے طور پر "نقاد" کی اشاعت کا اعلان کیا ہے لیکن شمارۂ اوّل اس کی تائید نہیں کرتا۔ خدا کرے، آیندہ شمارے اپنے اعلان شدہ مقاصد کے قریب ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ "نقاد" بجائے خود ادبی گروہ بندی کا ایک اکھاڑا نہ بن جائے۔ اپنے دورِ دوم میں 'نقاد' اسی وجہ سے ذاتی مِلک بن کر راندۂ درگاہ ہوا تھا۔ ادارتی نوٹ اکثر نہایت کمزور اور انشا یا زبان دانی کی کم مائگی کا اعلانیہ ہیں۔ پروف کی خامیاں تو اردو رسائل و اخبارات کا زیور ہیں، اس لیے نقاد نے بھی اس کا لحاظ رکھا ہے۔ ہاں، انگریزی کے الفاظ بے تحاشا رومن خط میں لکھے گئے ہیں اور ان میں سے اکثر عام استعمال کے الفاظ ہیں لیکن بیش تر کی ہجے غلط ہے جس سے مدیرانِ محترم کی زبان دانی اور علمی آن بان شان کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نظامِ املا کے بارے میں بھی خاصا انتشار ہے۔ مدیران نے اخبار کا بیش تر حصہ خود اپنی تحریروں سے پُر کیا ہے، ایسے میں کسی جمہوری منچ کے طور پر اس اخبار کے قائم رہنے کی زیادہ توقع نہیں۔ اس کے باوجود میں دعا کرتا ہوں کہ "نقاد" اردو کے سچے ادیبوں اور نیک جذبے سے لکھنے پڑھنے والوں کا آزادانہ منچ بنے۔ آمین۔

(2005)

"مُعلّمِ اُردو" کا گوشۂ احمد جمال پاشا

"مُعلّمِ اُردو" لکھنؤ کا گوشۂ احمد جمال پاشا آدھے شمارے پر مشتمل ہے۔ جنوری ۱۹۸۸ء میں مُعلّمِ اُردو نے ایک خصوصی شمارہ کوئی ۱۴۰ صفحات کا شایع کیا تھا جس میں اردو کے دو نامور ظرافت نگاروں کو اُن کی موت کے فوراً بعد خراجِ عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ ستمبر ۱۹۸۷ء میں فکرؔ تونسوی اور احمد جمال پاشا یکے بعد دیگرے اس دارِفانی سے رخصت ہوئے۔ اس لیے ان کی یادوں کو مرکز میں رکھ کر محض چند مہینوں کے اندر یہ شمارہ ترتیب دیا گیا تھا۔ اوّلاً فکرؔ تونسوی کا گوشہ ہے اور اس کے بعد احمد جمال پاشا کا۔ یہاں ہماری گفتگو گوشۂ احمد جمال پاشا تک محدود رہے گی۔

احمد جمال پاشا کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں ہوئی اور ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کو انھوں نے اپنی آخری سانسیں لیں۔ الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی، سیوان میں شادی اور مستقل رہائش کا ارادہ کیا اور عظیم آباد میں مسافر کی حیثیت سے انتقال فرمایا۔ ان کی زندگی اسی طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔

ان کی موت کے بعد نذرانۂ عقیدت کے طور پر اردو کے چند رسائل نے ان کے گوشے شائع کیے یا اُن پر خصوصی اشاعتیں نکالیں۔ ان میں پہلا نمبر تو مُعلّمِ اُردو (لکھنؤ) کا ہی ہے جس نے ان کی موت کے چوتھے ماہ میں ہی کوئی ۷۵ صفحات کا گوشہ شائع کر کے ایک گراں قدر کارنامہ انجام دیا۔ اس کے بعد حکومتِ اتر پردیش کے رسالے "نیا دور" نے "یادِ رفتگاں نمبر" حصہ اوّل میں خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، صباح الدین عبدالرحمان، فکرؔ تونسوی اور احمد جمال پاشا کو شامل کیا۔ پاشا کے لیے ۵۹ صفحات مخصوص کیے گیے ہیں۔ "نیا دور" نے حالاں کہ اپریل تا ستمبر ۱۹۸۸ء کی تاریخ درج کی ہے لیکن واقعتاً یہ شمارہ اس کے کافی بعد منظرِ عام پر آیا۔ پاشا صاحب کی حیات و خدمات پر تیسرا گوشہ "کتاب نما"، دہلی نے شائع کیا جس کے مرتب ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

ہیں۔ یہ جنوری ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا اور اس حصے میں کل ۶۰ صفحات ہیں۔ اس کے بعد ''کوہسار جرنل''، بھاگلپور نے اپنے ۱۶ صفحات پر مشتمل ۶ تا ۱۳ جولائی ۱۹۹۰ء کا شمارہ پاشا صاحب کے نام وقف کیا ہے۔ مُعلّمِ اُردوُ کے گوشے پر گفتگو کرتے ہوئے ان رسالوں کی بعض تحریروں پر بھی ضمنی طور سے بات چیت ہوتی جائے گی اور حسب ضرورت تقابلی نتائج بھی اخذ کیے جائیں گے۔ میں نے دانستہ طور پر مُعلّمِ اُردوُ کے علاوہ ان دوسرے رسائل کا ذکر اس لیے بھی کیا ہے کہ آنے والے دنوں میں جب پاشا صاحب کی حیات و خدمات پر زیادہ مواد کی ضرورت ہوگی تو لوگ ان رسائل سے رجوع کر سکتے ہیں۔

مرتب نے فہرست کو پانچ شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ 'واردات' کے عنوان سے ظفر کمالی کا مقالہ 'احمد جمال پاشا کا آخری سفر' شامل ہے۔ ''تاثرات'' کے عنوان سے رام لعل، شہریار، عثمان غنی، حتیش بترا، شکیب رضوی اور اظہار احمد صاحبان کے مضامین ہیں۔ ''مشاہدات'' عنوان سے اقبال پاشا اور عائشہ صدیقی کی تحریریں ہیں۔ ''تجزیات'' کے عنوان سے کاظم علی خاں، اخلاق حسین عارف اور شہنشاہ مرزا کے مضامین ہیں۔ ''یادداشت'' میں پاشا صاحب کے تین خاکے (خواجہ احمد عباس، رتن سنگھ اور اقبال مجید پر) شامل کیے گئے ہیں۔ فہرست میں تو اتنی ہی صراحت ہے لیکن مشتملات اس سے زیادہ ہیں۔ جو اضافی چیزیں ہیں۔ اُن میں اسرار جامعی کی نظم احمد جمال پاشا (ص ۱۱۱)، پاشا صاحب کی مطبوعات و مسوّدات کی فہرست (ص: ۱۳۶) کے علاوہ عظیم فیروز آبادی، نثار احمد فاروقی، وارث ریاضی، مہدی جعفر کے پاشا صاحب پر اور ہمت رائے شرما اور اسلم حنیف کے فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا دونوں پر تاثراتی بیانات ہیں۔ دونوں گوشے کے آغاز سے قبل فکر اور پاشا کے لیے مشترکہ طور پر وقار ناصری کی نظم 'گھنے جنگلوں میں جب رات ہوئی' شائع کی گئی ہے۔ ص: ۸ پر فاطمہ وصیہ جائسی صاحبہ کا قطعہ بھی ہے جو اپنے موضوع سے احمد جمال پاشا کے لیے ہی لکھا گیا لگتا ہے۔ ص: ۱۰ تا ۱۲ پاشا صاحب اور ان کے احباب کی کوئی تیرہ تصویریں ہیں۔ ص: ۲۱ تا ۲۴ پاشا صاحب کے چار خطوط ان کی رائٹنگ میں ہی شائع کیے گئے ہیں۔ ایک خط اظہار احمد کے نام ہے اور بقیہ تینوں خط شہنشاہ مرزا کے نام ہیں۔ سرورق اور ص ۶۱، جہاں سے گوشہ شروع ہوا ہے، وہاں وقار ناصری کا ایک شعر پاشا صاحب کی شگفتہ یادوں کے نام ہے؛ آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

جس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے تھے
آنکھ اشکوں سے بھر گیا وہ شخص

' مُعلّم اردو' کے گوشۂ احمد جمال پاشا کی کُل ظاہری کائنات یہی ہے جو اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ گوشۂ احمد جمال پاشا کا پہلا مضمون 'احمد جمال پاشا کا آخری سفر' ظفر کمالی نے لکھا ہے یہ ص ۶۳ تا ۷۶ تک کوئی چودہ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ جس میں پاشا صاحب کے سیوان سے عظیم آباد آنے، وہاں اچانک بیمار پڑنے اور پھر جسم و جاں کی قید سے گزر جانے کے بعد سیوان میں دفن ہونے تک کے تمام واقعات کو ریکارڈ کر لیا گیا ہے۔ یہ مضمون اگر کوئی دوسرا لکھتا تو شاید وہ موضوع کا حق ادا نہیں کر پاتا اور اس سے بڑھ کر وہ تمام باتیں بھی احاطۂ تحریر میں نہیں آپاتیں جو ضمنی طور پر ظفر کمالی کے ذریعہ سمیٹ لی گئی ہیں۔ ظفر کمالی موجودہ دور میں نوجوان نسل میں اُن چند لوگوں میں سے ایک ہیں جنھیں ادب و تحقیق سے گہرا شغف ہے اور چوں کہ وہ پاشا صاحب کے عزیز شاگرد ہیں اور کوئی ایک دہائی سے بھی زیادہ انھوں نے پاشا صاحب کو بہت قریب سے دیکھا۔ مزید یہ کہ پاشا صاحب اپنے آخری سفر کے لیے جب پٹنہ تشریف لائے تو ظفر کمالی کے یہاں ہی ٹھہرے۔ ظاہر ہے، وہ ہر جگہ سایے کی طرح ان کے ساتھ رہے اور یہاں سے سیوان وہ پاشا صاحب کے قبر میں اُترنے تک ایک ایک لمحے کے عینی شاہد ہوئے۔ اسی لیے ظفر کمالی کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ ان تمام واقعات و احوال کو قدرے تفصیل سے بیان کریں۔ یہ اردو دنیا کے لیے ایک گراں قدر دستاویز ہے۔ جس میں ایک بڑے مصنف کے آخری سفر سے متصلاً قبل کے چند دنوں کی ہر بات بالتحقیق درج کر دی گئی ہے۔ اس مضمون سے پاشا صاحب کی ذات و شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں اور اُن کے انداز و اطوار کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مُعلّم اردو نے اسے شائع کر کے ایک اہم ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ مُعلّم اُردو کے علاوہ اردو کے کسی دوسرے رسالے کو ایک نوجوان مصنف کے ذریعہ لکھے گئے اس قدر طویل مضمون کو تمام و کمال شایع کرنے میں کافی سنکوچ ہوتا۔ موضوع اور تحریر سے زیادہ آج کل صاحب تحریر کے قد اور شہرت کو دخل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ظفر کمالی کی وہ حیثیت نہیں تھی کہ کوئی اہم رسالہ اپنے چودہ صفحات ان کی تحریر کے لیے قربان کر دیتا۔ اس کے لیے ایڈیٹر مُعلّم اُردو کو میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پاشا صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا اور سیوان آنے سے پہلے ہی وہ ادبی دنیا کے لیے مشہور و معروف ادبی شخصیت کا مرتبہ حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے فطری طور پر ان کے حلقۂ احباب میں لکھنؤ کی کئی اہم ادبی شخصیات شامل رہی ہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ میں چند برسوں کی تعلیم کے سبب ان کے بعض احباب وہاں سے بھی متعلق رہے۔ اس لیے ان کے چند منتخب دوستوں کی تحریروں سے استفادہ کیے بغیر

کام نہیں چل سکتا ہے۔ رام لعل، عثمان غنی، قاضی عبدالستار، عابد سہیل، شہریار، اقبال مجید، شکیب رضوی، کاظم علی خاں، وجاہت علی سندیلوی وغیرہ چند ایسے نام ہیں جن کے تاثرات سے پاشا صاحب کی گذشتہ زندگی کے زیر و بم کو بہت اپنائیت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کی تحریروں سے جو باتیں سامنے آئیں گی، وہ محقق و مستند بھی ہوں گی، کیوں کہ یہ لوگ برس ہا برس پاشا صاحب کے ساتھ رہے۔ اتنے کم وقفے میں معلّمِ اُردوؔ نے رام لعل، شہریار، عثمان غنی، شکیب رضوی، کاظم علی خاں وغیرہ کے مضامین حاصل کر کے شائع کردیے ہیں۔ اس کے علاوہ پاشا صاحب کے چھوٹے بھائی اقبال پاشا، پڑوسن یعنی عبدالباری آسی کی صاحب زادی عائشہ صدیقی، حتیش بترا، اظہار احمد اور شہنشاہ مرزا کے مضامین بھی پاشا صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

معلّمِ اردوؔ نے ظفر کمالی کے مذکورہ مضمون کے علاوہ پاشا صاحب پر گیارہ مضامین شائع کیے ہیں۔ ہر چند کہ انھیں 'تاثرات'، 'مشاہدات' اور 'تجربات' کے ذیلی عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تاثراتی ہی مضامین ہیں۔ ان مضامین کو بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں ہم ن لوگوں کے مضامین رکھ سکتے ہیں جن کے یا تو پاشا صاحب سے گہرے تعلقات رہے ہیں یا جنھوں نے اُن کو ہت اپنائیت سے چاہا ہے۔ عثمان غنی، شکیب رضوی، اظہار احمد، اقبال پاشا، عائشہ صدیقی اور شہنشاہ مرزا کے ضامین اس قبیل کے ہیں۔ دوسرے حصے میں ہم اُن اصحاب کی تحریروں کو شامل کر سکتے ہیں جن سے پاشا صاحب کے قریبی تعلقات تو ضرور رہے ہیں لیکن ایک تکلّف کی فضا بھی ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ شہریار، رام لعل، حتیش بترا اور کاظم علی خاں کے مضامین ایسے ہی تاثرات پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم بے تکلفانہ لکھے گئے مضامین پر توجہ دیتے ہیں۔ 'ہو چکا تحریر اے بہزاد خط' عنوان سے عثمان غنی صاحب کی تحریر شامل کی گئی ہے۔ عثمان غنی، پاشا صاحب کے اُن دوستوں میں ہیں جو یونی ورسٹی کے ور سے آخری زمانے تک کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے قریب تر رہے۔ انھوں نے ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۸۷ء تک مختلف اوقات میں پاشا صاحب کی زندگی کے انداز و طریق میں جو فرق اور تبدیلی آتی گئی، اس کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے۔ مختلف لوگوں سے اور خاص طور سے دوستوں سے پاشا صاحب کی رسم و راہ کو عثمان غنی صاحب نے بہت محبت اور دردِ دل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مضمون اپنے اختصار کی وجہ سے ان تمام تعلقات کو سمیٹ پانے میں ناکام رہا ہے جو عثمان غنی اور پاشا صاحب کے درمیان رہے ہوں گے۔ پھر بھی، تین

صفحات میں تاثرات کی شکل میں جو کچھ آسکا، وہ بہت کارآمد ہے۔

شکیب رضوی کا مضمون "جمال: میرا دوست" اس وجہ سے بہت اہم ہے کہ اس میں کالج کے ایک دوست کے ذریعہ کالج کے زمانے اور پھر اس کے بعد کی ادبی زندگی کو اپنے محبت آمیز رویّے کے ساتھ پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں خاص طور سے ۱۹۵۵ء کے آس پاس لکھنؤ کی اُن ادبی محفلوں کی باتیں بھی درج ہوگئی ہیں جن میں پاشا صاحب "جانِ محفل" ہوا کرتے تھے اور ادبی زندگی کی سیڑھی در سیڑھی انھی محفلوں کی بہ دولت وہ چڑھتے گئے۔ رضوی نے پاشا صاحب کی زندگی کے سنجیدہ پہلوؤں اور دوستوں سے اُن کے روابط اور رکھ رکھاو پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "پاشا کی چٹکیں اور اُردو" کے عنوان سے اقبال پاشا (جو اُن کے چھوٹے بھائی ہیں) نے بے حد جذباتی انداز میں ایّامِ گذشتہ کے بعض ایسے واقعات ریکارڈ کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے، جن سے پاشا صاحب کی شخصیت کے نئے نئے اور رنگا رنگ پہلو اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے اتنے دل دار بھائی کی موت کے فوراً بعد گہرے صدمے میں مبتلا ہونے کے سبب وہ خود کو ایک تفصیلی مضمون لکھنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں کر سکے ہوں گے ورنہ ادب کے طلبہ کے لیے وہ بہت کام کی چیز ہوتی۔ عائشہ صدیقی کا مضمون "جمال پاشا: یادوں کی دھند سے جھانکتا چہرہ" اُن کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے کے نئے زاویے فراہم کرتا ہے۔ عائشہ صدیقی چونکہ پاشا صاحب کی ہم محلّہ ہیں اور انھوں نے بچپن سے پاشا صاحب کو مختلف رنگ روپ میں دیکھا ہے۔ اس لیے انھوں نے پورے جذباتی انداز میں یادوں کے البم سجا کے رکھ دیے ہیں۔ پاشا صاحب کی زندگی کے بہت سارے ایسے واقعات جو اُن کے گھر کے اندر لڑکپن میں ان کی شرارت کے زیرِ اثر پنپے گئے، انھیں مختلف وسائل سے عائشہ صدیقی نے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں پاشا صاحب کے والدِ مکرم کے بھی مختلف روپ سامنے آتے ہیں۔ واضح ہو کہ پاشا صاحب کے والد کے بارے میں اس کے علاوہ اقبال پاشا کے مضمون سے ہی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

"ایک سنجیدہ طنز نگار" شہنشاہ مرزا کا مضمون ہے جو غالباً ادھورے طور پر پاشا صاحب کی حیات میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ موت کے بعد اسے بیچ میں ہی تکمیل کے مراحل سے گزار دیا گیا۔ یہ مضمون بھی شہنشاہ مرزا کے تاثرات پر مبنی ہے لیکن درمیانی حصے میں ذرا سا تنقیدی رُخ بھی سامنے آگیا ہے۔ اس سے پاشا صاحب کی زندگی کے گوناگوں واقعات و حالات اُبھرتے ہیں۔ شہنشاہ مرزا سے جس قدر بھرپور مضمون کی توقع تھی، وہ اس ادھوری تحریر سے پوری نہیں ہوتی۔ غالباً عارضۂ قلب کے بجنور میں ہونے سے ایسا ہوا ہوگا۔

تاثراتی مضامین کے حصے میں معلمِ اُردو کے مدیر اظہار احمد کے مضمون "پاشا: میرے محسن، میرے آقا" کی بے ساختگی، واقعات وحالات کی کرب زا کیفیت اور اس سے پاشا صاحب کی ایسی شخصیت جو مردم ساز اور مددگار ہو، اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ ۷۵ صفحات کے اس گوشے میں اظہار احمد کے مضمون سے زیادہ "زندہ" کوئی دوسری تحریر نہیں ہے۔ پاشا صاحب کے قریب رہنے کا بہت لوگوں کو موقع ملا ہوگا اور بہت سارے لوگوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات بھی رقم کیے ہیں لیکن پاشا صاحب کی خلیق، محبت دار اور ہمدرد شخصیت کو اظہار احمد کے مضمون سے جس گہرائی کے ساتھ سمجھ پانے میں قاری کو مدد ملتی ہے، وہ کسی دوسرے مضمون سے نہیں۔ یہاں صاحب موضوع اور صاحب مضمون دونوں کی شخصیت نے مل کر ایک سحر آفریں کیفیت پیدا کر دی ہے۔

رام لعل نے اپنے مضمون میں بہت سارے ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں جو مستقبل کے مورخ کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ شہریار نے علی گڑھ کے قیام کے دوران پاشا صاحب کی سرگرمیوں کا مختصراً ذکر کیا ہے اور بعد میں اپنی ملاقاتوں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ حتیش بترا کے مضمون "میرا دوست، میرا ہم درد جمال" میں اِس بات کا اشارہ بھی ہے کہ اُن سے گہرے تعلقات نہیں رہے۔ رام لعل کے ذریعہ ملاقات ہوئی اور پھر تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ لکھنؤ کے علاوہ عظیم آباد میں بھی ایک بار کی ملاقات رہی۔ بترا صاحب نے اپنی خوشگوار یادوں کو پاشا صاحب کے حوالے سے مجتمع کر کے قارئین کے لیے ایک اچھی تحریر پیش کی ہے۔ کاظم علی خاں کے مضمون "یارِ طرح دار احمد جمال پاشا" میں بھی اُن کے متعلق یادوں کے بہت سارے پھول سمائے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بھی کوئی تین دہائی سے زیادہ کے تعلقات رہے۔ کاظم علی خاں کے مضمون میں ایک خاص امر کی جانب اشارہ ہے جو غالباً اس کے علاوہ کسی دوسرے مضمون میں نہیں ہے۔ خاں صاحب نے اپنے لطیف انداز سے درد کی پرت کو ہلکا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ میں ان کا اقتباس نقل کرتا ہوں، قارئین خود اُس موضوع سے غور کر لیں گے:

> "احمد جمال پاشا کی ازدواجی زندگی کی داستان بھی ستم ظریفی سے خالی نہیں۔ وہ اپنی زندگی میں شادی کے بندھن میں دو بار بندھے۔ اُن کی پہلی گھر والی نے تو خود اُن کا گھر چھوڑا تھا مگر دوسری رفیقۂ حیات سرور جمال نے خود جمال کو اُن کے گھر "سروری منزل" سے چھڑا دیا۔ دوبارہ شادی کے باوجود اولاد کی صورت میں وہ خانہ آبادی سے زندگی بھر محروم رہے۔ لاولدی کا غم انسان کو توڑ کر رکھ دیتا ہے مگر جمال

نے اپنی زندہ دلی اور مزاج کی یہ دولت اِس غم کو بھی شکست دے دی۔ جمال کی شخصیت کے بانکپن کی یہ بھی ایک قابلِ ذکر مثال ہے۔" (ص:۱۰۱)

ڈاکٹر اخلاق حسین عارف کا مضمون "باغ و بہار پاشا" اپنے انداز سے تنقیدی مضمون کی طرح شروع ہوتا ہے لیکن بات بن نہیں سکی ہے۔ یوں ہی سی کچھ باتیں شخصیت اور کارناموں سے متعلق پیش کر کے انھوں نے اپنی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہو لیا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس گوشے کی یہ سب سے کمزور تحریر ہے۔

"تاثرات" کے عنوان سے جو چیزیں شامل ہیں، ان میں عظیم فیروز آبادی کی تجربے پر مشتمل مختصر تحریر بے پناہ اثر رکھتی ہے اور پاشا صاحب کی شخصیت کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ نثار احمد فاروقی نے بھی محبت اور ہمدردی سے پاشا صاحب کو یاد کیا ہے اور اُن کے کاموں کی داد دی ہے۔ مظہر امام نے خط کے کالم (زبانِ خلق) میں پاشا صاحب کی موت کا ذکر کیا ہے اور اُن کی بے باکی اور شائستگی کی داد دی ہے۔ اگر ایڈیٹر صاحب چاہتے تو خط کے اِس حصّے کو یہاں سے نکال کر "تاثرات" کے خانے میں ڈال سکتے تھے جس سے اس کالم کی اہمیت بڑھ جاتی۔

اس شمارے میں پاشا صاحب سے متعلق جو شاعری ہے، اس میں اسرار جامعی کی نظم سے پاشا صاحب کی بعض ذاتی خصوصیات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ خاص طور سے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کرتے تھے چپکے چپکے حاجت روائی سب کی
محتاج و بے نوا کے تھے غم گسار پاشا

اسرار جامعی کی نظم حیاتِ پاشا سے واقفیت کے اعتبار سے کار آمد ہے۔ بہ طور شاعری وقار ناصری کی نظم اپنے گہرے تجربات اور خلاّقانہ قوتوں کی وجہ سے بہت دلآویز اور پُر اثر ہے۔ شخصی مرثیے کی تاریخ میں اِس نظم کو تاثرات اور وجدان کے سبب اہم مقام حاصل ہوگا۔ فاطمہ وصیہ جائسی کا قطعہ رسمی زیادہ ہے اور دیرپا اثرات قایم کرنے میں ناکام۔

اس گوشے میں جو تیرہ تصاویر شایع کی گئی ہیں، ان میں طالب علمی کے زمانے سے لے کر حج بیت اللہ سے مشرّف ہونے کے بعد داڑھی رکھ لینے تک مختلف ادوار کی پانچ تصاویر ہیں۔ دو تصویریں اُن کے گھر والوں کے ساتھ ہیں جن میں سے ایک لکھنؤ اور دوسری سیوان کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ چھے تصاویر اردو

ادب کی اہم شخصیات جن میں اُن کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہے، کے ساتھ ہیں۔ ان تصویروں میں احمد جمال پاشا کے ساتھ عابد سہیل، آنند نرائن ملا، رتن سنگھ، حسن کمال، بشن کپور، احمد ابراہیم علوی، عبدالسلام صدیقی، عبدالعلیم خاں، احسن رضوی، احمد وصی، انیس اشفاق، خواجہ وجیہہ الدین، رویندر اگروال، شہنشاہ مرزا، خلیق نگرامی، بشیر فاروقی، جمیل الرحمان، اطہر نبی، اخلاق حسین عارف، شفق شاہانی، شاہ نواز قریشی، بشیشر پردیپ، ساحر لکھنوی، نجمہ اخلاق، سلیمان عباسی اور بیگم احمد وصی وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ تصاویر اردو ادب کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں شمارے میں شامل کر کے اس کے مجموعی تاثر اور افادیت میں اضافہ کیا گیا ہے۔

'معلّمِ اُردو' کے اس گوشے میں پاشا صاحب کے چار خطوط شامل ہیں۔ پہلا خط اظہار احمد ایڈیٹر 'معلّمِ اردو' کے نام ہے جس کے ساتھ ہی انھوں نے رتن سنگھ اور اقبال مجید پر لکھے اپنے خاکے بھیجے تھے۔ ساتھ ساتھ انھوں نے تاکید کی ہے کہ جس شمارے میں اسے شایع کریں، اس کی دو کاپیاں اور شایع خاکے کے تراشے رجسٹرڈ ڈاک سے ضرور بھیج دیں۔ پاشا صاحب کے محتاط اور محقق ذہن کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تین خطوط شہنشاہ مرزا کے نام ہیں جو اپنی شگفتگی اور برجستگی کی وجہ سے بے حد پُر لطف ہیں۔ جیسا کہ مرزا نے اپنے مضمون میں خود بھی اشارہ کیا ہے کہ پاشا صاحب اُن کے نام ''شہنشاہ'' کی مناسبت سے جہاں پناہ، ہز مجیسٹی، ظلِ سبحانی جیسے القابات سے انھیں خطوط لکھا کرتے تھے۔ اندازِ تحریر کے لیے ملاحظہ کریں شہنشاہ مرزا کے نام پہلے خط کو جس میں انھیں ہارٹ اٹیک ہونے پر وہ لکھتے ہیں: ''یہ ہارٹ اٹیک کہاں سے امپورٹ کرلائے، یہ تو سیاسی بیماری ہے۔ آپ کو کون سی وزارت مل گئی''؟ ایک دوسرے خط میں پاشا صاحب شہنشاہ مرزا کو اس بات کی اطلاع دیتے ہیں کہ خواجہ احمد عباس پر بڑی محنت سے خاکہ لکھا ہے، اسے ٹھیک ٹھاک کر رہا ہوں''۔ اس لیے اس کا ''جہاں پناہ'' بے چینی سے انتظار کریں۔'' اس خط میں '' یکے از بندگانِ عالی'' لکھ کر اپنا دستخط کر کے پاشا صاحب نے ظرافت کا ایک خوب صورت موقع تلاش کرلیا ہے۔ ان چار خطوط کے پڑھنے کے بعد پاشا صاحب کے اندازِ خطوط نگاری کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن تشنگی باقی رہتی ہے۔ ایڈیٹر حضرات چاہتے تو پاشا صاحب کے بعض خطوط جو مشاہیر کے نام تھے یا بعض اُن کے شاگردوں کے نام لکھے گئے ہوں گے، انھیں بھی شامل کر لیتے۔ اس سے اس گوشے کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

اس گوشے میں پاشا صاحب کے لکھے تین خاکے شامل ہیں۔ خواجہ صاحب کا خاکہ بھرپور ہے اور

واقعی محنت سے لکھا گیا ہے جب کہ بقیہ دو حضرات کے خاکے بہت مختصر اور تشنہ ہیں لیکن شگفتہ ہیں۔ ایڈیٹر نے یہ بہت اچھا کیا کہ پاشا صاحب کی ایک طرح کی تحریر دے کر پڑھنے والوں کو ان کی خاکہ نویسی کے فن کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

ص ۱۳۶ پر ''پروفیسر الحاج احمد جمال پاشا صاحب کی طبع زاد مطبوعہ کتابیں'' کے عنوان سے ایک فہرست دی گئی ہے جس میں ان کی تیرہ طبع زاد کتابوں کے نام، ناشر کا پتا اور اشاعت کی تاریخ درج ہے۔ اس کے علاوہ دو ترتیب دی ہوئی کتابوں کا بھی ذکر ہے۔ چھے کتابوں کے زیرِ طبع ہونے کا اشارہ ہے اور آٹھ موضوعات پر تفصیل سے کیے گیے کاموں کا ''مسودات'' کے عنوان سے ذکر ہے۔ اس گوشوارے کے مرتب کا نام نہ جانے کیوں پردۂ خفا میں رکھا گیا ہے۔ اس کی وضاحت ضروری تھی کیوں کہ اس کی تحقیقی اہمیت ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، یہ گوشوارہ نامکمل ہے اور یہاں تفصیلات بھی بہت کم ہیں۔ میرے استفسار پر ظفر کمالی نے بتایا یہ گوشوارہ جناب ابوالبرکات کربلائی کا تیار کردہ ہے۔ اگر ظفر کمالی صاحب یا کوئی دوسرے شخص جو اس سلسلے میں کافی محنت کرنے کے لیے تیار ہوں، اس موضوع سے کام کریں اور پاشا صاحب کی مطبوعہ، مرتبہ، غیر مطبوعہ ''مسودات'' کی تفصیلی صورتِ حال عالمِ تحریر میں لے آئیں تو اس سے تحقیق کے طلبہ کو بہت سہولت ہوگی۔ یہ کام سرراہے طریقے سے کرنے کا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک معاملہ پاشا صاحب کی تاریخِ پیدائش کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں پاشا صاحب نے خود ہی اپنی تحریروں میں کئی طرح کی تاریخیں پیش کی ہیں۔ خود ''معلمِ اردو'' میں بھی پراگندگی موجود ہے لیکن اصل تاریخِ پیدائش کی جانب توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جناب رضوان احمد خاں کا تفصیلی مقالہ ''ایوانِ اردو'' میں اسی سال شایع ہو چکا ہے اور اب یہ طے ہو چکا ہے کہ پاشا صاحب کی تاریخِ پیدائش ۱۹۲۹ء ہے۔ ''معلمِ اردو'' میں اس سلسلے میں بحث ہونی چاہیے تھی۔

گذشتہ صفحات میں ''معلمِ اردو'' کے گوشۂ احمد جمال پاشا کے تمام مشمولات پر اپنے تاثرات کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احمد جمال پاشا سے متعلق دوسرے رسائل کے جو خاص شمارے یا گوشے شایع ہوئے، ان سے بھی موازنہ کر کے دیکھا جانا چاہیے کہ ''معلمِ اردو'' کا یہ گوشہ کس معیار کا ہے۔ ''معلمِ اردو'' میں جو مضامین شایع ہوئے ہیں، غالباً ان میں سے تمام کی تمام چیزیں اس سے قبل کسی رسالے میں شایع نہیں ہوئی تھیں۔ کسی رسالے کے خاص نمبر میں یہ خصوصیت کہ اس کی تمام تحریریں غیر مطبوعہ ہوں، ایک بڑی بات ہے۔ یہ بھی سچائی

ہے کہ 'مُعلّمِ اُردو' سے ہی دوسرے رسائل نے بعد میں نقل در نقل کا سلسلہ قائم کیا اور بیش تر معاملات میں اس کی صراحت تک نہیں کی گئی۔ 'نیا دور' کے ''یادرفتگاں نمبر'' حصہ اول میں 'مُعلّمِ اردو' میں شایع رام لعل کے مضمون کی تلخیص چھاپی گئی ہے۔ اس کے علاوہ شہریار کے مضمون اور نثار احمد فاروقی کے تاثراتی بیان سے اقتباسات لیے گئے ہیں۔ 'مُعلّمِ اُردو' میں ہی شایع وقار ناصری اور اسرار جامعی کی نظمیں بھی 'نیا دور' کے مذکورہ نمبر میں موجود ہیں۔ اسی طرح ''کوہسار جرنل'' میں رام لعل، شہریار، کاظم علی خاں، جتیش بترا اور اظہار احمد صاحبان کے مضامین 'مُعلّمِ اُردو' کے اسی گوشے سے لیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے 'مُعلّمِ اُردو' کے اس گوشے کو Term of reference قرار دیا جاسکتا ہے۔

'مُعلّمِ اُردو' کا یہ گوشہ بلاشبہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ۷۵ صفحات پر مشتمل اس گوشے میں ایک بھی ایسا تنقیدی مضمون نہیں ہے جس سے احمد جمال پاشا کی ظرافت نگاری کے معیار و مرتبے کا تعین ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ موت کے فوراً بعد تاثرات کو زیادہ دخل ہوتا ہے لیکن آدمی جذبات میں اس قدر بھی نہ بہہ جائے کہ اسے معروضی اندازِ نظر کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اس گوشے کا کم از کم ایک تہائی حصہ پاشا صاحب کی تحریروں کے تنقیدی محاسبے پر مبنی ہونا ہی چاہیے تھا تاکہ اردو ادب میں اُن کا قد کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے، اس کا تعین ہو سکے۔ اس کے علاوہ پاشا صاحب کی اہلیہ، جو خود بھی ادیبہ ہیں، اُن سے ان کے تاثرات ضرور قلم بند کرا کے شایع کرانا چاہیے تھا۔ بعد میں 'کتاب نما' نے یہ کام کیا۔ پاشا صاحب کی حیات اور اُن کے خیالات کو جاننے کے لیے یا تو کوئی Factual مضمون ہوتا (توقیت قسم کا) یا پھر اُن کی حیات میں لیے گیے کسی تفصیلی انٹرویو کو اس گوشے میں شامل کیا جاتا جس سے اُن تمام امور کو سمجھا جا سکتا تھا۔ 'کتاب نما' نے ظفر کمالی کا لیا ہوا انٹرویو شایع تو کیا لیکن وہ بہت تشنہ ہے اور اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں۔

احمد جمال پاشا اردو ادب کے ایک قد آور ادیب تھے۔ اُن کی بے وقت موت پر 'مُعلّمِ اُردو' کا یہ نذرانۂ عقیدت اُن کی عظمت کے عین مطابق ہے۔ اس گوشے میں پاشا صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ یہ اس رسالے کی بڑی کامیابی ہے۔ مستقبل کا مورخ احمد جمال پاشا کے فن اور شخصیت پر جب بھی گفتگو کرے گا، وہ 'مُعلّمِ اُردو' کی اس کاوش کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(1990)

زبان وادب کا حفیظ بنارسی نمبر

بہار اردو اکادمی ایک طویل مدت سے کسی مخصوص علمی اور ادبی کام کے بغیر اپنی محدود دنیا میں سرگرم رہی ہے۔ سہیل عظیم آبادی، ش۔ مظفر پوری، کلیم الدین احمد کی محنت سے اس ادارے کا ادبی ترجمان 'زبان وادب' اہم ادبی اور علمی رسائل میں شمار کیا جانے لگا تھا لیکن وہ بھی کبھی پابندیٔ وقت سے نہیں شائع ہو سکا۔ ایک دہائی پہلے اردو اکادمی نے 'زبان وادب' کے ہر نئے شمارے کی رسم اجرا کا پروگرام شروع کیا تو لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ ہر شمارے کے اجرا کی تقریب کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اگلا شمارہ ایک برس یا بہت دنوں کے بعد شائع ہوگا۔ ہر چند کہ اُس زمانے میں اسے دوماہی سے ماہانہ کر دیا گیا تھا۔

جب سے جناب شہزاد انور بہار اردو اکادمی کے سکریٹری بنائے گئے ہیں، اس کے بعد سے 'زبان وادب' کی اشاعت میں تھوڑی باقاعدگی آئی ہے اور کچھ ادبی گوشے یا خصوصی نمبر کی اشاعت کا سلسلہ بھی قائم ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تازہ ترین شمارہ حفیظ بنارسی نمبر بھی اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء پر مشتمل ہے جو واقعتاً جون ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ یعنی اشاعت کا یہ سلسلہ اب بھی چھ ماہ پیچھے چل رہا ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے اطمینان کی بات یہ ہے کہ سلسلہ دو برس اور تین برس پیچھے کا نہیں ہے۔ پتا نہیں، یہ سلسلہ اپنے آپ قائم ہوا یا سوچ سمجھ کر طے کیا گیا لیکن پچھلے ایک برس میں بعض مرحومین کے سلسلے سے 'زبان وادب' میں گوشے مرتب کرکے سلیقے سے شائع ہوئے۔ پرکاش فکری جیسے البیلے جدید شاعر کی وفات کے فوراً بعد اُن کی حیات، شخصیت اور خدمات پر 'زبان وادب' نے خراجِ عقیدت پیش کیا اور اب حفیظ بنارسی کی وفات کے ایک سال کے اندر اُن پر مکمل اور بھرپور نمبر شائع کر دیا جس میں چھوٹے بڑے ۲۹ رمضامین شامل ہیں۔ پرکاش فکری اور حفیظ بنارسی دونوں کی شہرت بہت تھی۔ حفیظ بنارسی مشاعروں کے ذریعے اعتبار بنانے میں کامیاب ہوئے

تھے اور پرکاش فکری جدیدیت کے عہدِ شباب میں بالکل الگ انداز کی شاعری کی وجہ سے ہندوپاک کے سنجیدہ علمی حلقوں میں ممتاز تسلیم کیے گئے۔ لیکن ان دونوں شخصیات پر نقادوں نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ شاید 'زبان وادب' کے گوشے یا خصوصی نمبروں کو اس سمت ایک معقول پہل اور مداخلت تسلیم کیا جائے۔

حفیظ بنارسی نمبر کے حرفِ آغاز میں سکریٹری، بہار اردو اکادمی کا یہ کہنا مناسب ہے کہ انھوں نے مشاہیر کے ساتھ بعض نئے نقادوں کے مضامین بھی اس رسالے میں شامل کیے ہیں لیکن لکھنے والوں کی دوسری صف تیار کرنے کی مہم پر جس طرح دادطلب نگاہوں سے انھوں نے اپنے اداریے میں توقع کی ہے، وہ شاید قبل از وقت ہے۔ نیاز فتح پوری، صلاح الدین احمد، شاہد احمد دہلوی، ظ۔ انصاری، محمود ایاز یا شمس الرحمٰن فاروقی یہ بات اپنے رسائل کے تعلق سے کہتے تو کچھ بات سمجھ میں آتی لیکن پانچ دس شمارے کی ترتیب میں اپنے دعوے، اشارے، ہر چند کہ وہ انکساری کے ساتھ ہوں؛ مناسب نہیں۔

اس نمبر کی یہ خصوصیت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ صفِ اول کے نقاد کا کوئی مضمون اس میں شامل نہیں ہے۔ اس شمارے میں لکھنے والوں کی دوسری یا تیسری صف کے افراد اور بالخصوص نوواردینِ ادب کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ اس میں بہار اردو اکادمی کا شاید کوئی قصور نہ ہو کیوں کہ اُس نے مشاہیر سے مضامین لکھنے کی گزارش ضرور کی ہوگی لیکن شاید حفیظ بنارسی کی شاعری اور شخصیت باعثِ کشش نہیں بن سکی۔ قومی سطح پر بڑے نقادوں کو چھوڑیے، بہار سے متعلق افراد میں نہ وہاب اشرفی اس میں موجود ہیں نہ شکیل الرحمٰن نہ مظہر امام، نہ لطف الرحمٰن اور نہ ہی ابوالکلام قاسمی یا اعجاز علی ارشد۔ خورشید سمیع کی بھی کوئی تحریر نہیں شامل ہو سکی۔ علیم اللہ حالی، مناظر عاشق ہرگانوی کے مضامین بھی اس شمارے میں شریک نہیں۔ ہم عصر شعرا اور افسانہ نگاروں سے بھی مضامین لکھوائے جا سکتے تھے لیکن اس شمارے میں نہ سلطان اختر شامل ہیں نہ شوکت حیات اور نہ حسین الحق، جو ان دنوں مضمون نویسی کی طرف خوب خوب متوجہ ہیں۔ اس کے باوجود ۲۹ مضامین حاصل کر لینا اور 140 صفحے کا صاف ستھرا کمپیوٹر کے باریک پوائنٹ کا مرصّع رسالہ تیار کر دینا حیرت انگیز بات ہے۔ اس کے لیے 'زبان وادب' کے اہالیان لائقِ مبارک باد ہیں۔

پُرانے زمانے کے مدیران اس صلاحیت کے ہوتے تھے کہ ان کے اعلان شدہ نمبر میں اگر لکھنے والے خاطر خواہ تعاون نہیں کریں تو وہ خود ہی مختلف عنوانات سے درجنوں مضامین لکھ کر اپنے منصوبے کے مطابق

خصوصی نمبر شائع کر لیتے تھے۔ نیاز فتح پوری کی شہرت اسی وجہ سے تھی کیوں کہ انھیں لکھنے والوں پر لازمی طور پر منحصر نہیں رہنا تھا۔ 'زبان وادب' کا حفیظ بنارسی نمبر شاید اس اعتبار سے بہار کے مشاہیر اہلِ قلم کے لیے تازیانہ ثابت ہو کیوں کہ اُن کے قلمی تعاون کے بغیر یہ نمبر منظرِ عام پر آ گیا۔ شاعر کی زندگی اور ادب کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو اِس میں زیرِ بحث نہ آیا ہو۔ اس طرح سے اس خصوصی اشاعت کا خاکہ نہ صرف یہ کہ مکمل ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ کسی چیز کی شمولیت مناسب نہیں تھی۔ اندازہ یہی ہے کہ لکھنے والوں کو خاص طور سے موضوعات فراہم کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے دہراو یا بکھراو دونوں کیفیات نہیں کے برابر ہیں۔

اس خصوصی نمبر میں حفیظ بنارسی کی شخصیت کے حوالے سے بھی مضامین ہیں اور ان کے ادبی مرتبے کا تعین کرنے والے مضامین بھی۔ ان کی غزل، نظم، قطعات و رباعیات، یہاں تک کہ نثر نگاری پر بھی معتدد مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ شخصیت کے تعلق سے 'توقیتِ حفیظ' عنوان سے مدیرِ محترم کا نوشتہ شامل کیا گیا ہے جس میں حفیظ بنارسی کی زندگی کی پوری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جہاں جہاں تفصیل کی ضرورت تھی، وہاں تفصیل بھی فراہم کر دی گئی ہے۔ حیات سے متعلق مضامین میں تین نہایت اہم ہیں: عبید الرحمان (آنکھ جھپکی بدل گیا منظر)، رضوان احمد (بلا کی چمک اُس کے چہرے پہ تھی) اور شمیم قاسمی (حفیظ بنارسی کا شعری مسئلہ)۔ ان مضامین کے مطالعے سے حفیظ بنارسی کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے ممتاز احمد خاں اور کوثر مظہری نے حفیظ بنارسی کی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن غزل کی تاریخ اور روایت میں حفیظ بنارسی نے کیا اضافہ کیا، یہ ان مضامین سے پورے طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ نظم نگاری کے تعلق سے 'زبان وادب' میں چار مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ منظر اعجاز کا مضمون (شاعرِ قول و قسم حفیظ بنارسی) تجزیے کے اعتبار سے بھرپور ہے لیکن یہاں بھی اردو کے اہم نظم نگاروں میں حفیظ بنارسی کا مقام کیا ہے اور ان کی نظموں کو کون سا مرتبہ حاصل ہے، اس سلسلے میں جائزہ نہیں لیا جا سکا۔ نظم نگاری کے حصے میں محترمہ تسنیم فاطمہ کا مضمون (حفیظ کے شخصی مرثیے) اس اعتبار سے غنیمت ہے کیوں کہ انھوں نے ایسے موضوع کو مرکزِ نگاہ بنایا ہے جس پر نہ زیادہ مواد تھا اور نہ اس خصوصی اشاعت میں دوسرے کسی نقاد کی اس طرف توجہ گئی۔ انھوں نے بے باکی کے ساتھ حفیظ کی شاعری کی حدود بھی واضح کی ہیں۔

اس خصوصی اشاعت میں حفیظ بنارسی کی قطعہ گوئی اور رباعی نگاری پر بھی ایک ایک مضمون شامل

کر کے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حفیظ کی شاعرانہ شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں پر نگاہ ڈالی جارہی ہے۔ ڈاکٹر عابدہ پروین کے مضمون ''حفیظ بنارسی کی قطعہ گوئی'' میں اردو قطعہ گوئی کی تاریخ میں اُن کے مقام کے تعین کی ایک ابتدائی کوشش کی گئی ہے۔ حفیظ کی رباعیات پر محترمہ ترنم جہاں کے مضمون میں اولاً فنِ رباعی کی تاریخ اور فنّی نزاکتوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے؛ پھر حفیظ کی رباعیوں کے سہارے اُن کے فکری نظام کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے یہ نتیجہ بھی خوب اخذ کیا کہ ساقی کو مخاطب کر کے لکھی گئی حفیظ بنارسی کی رباعیات سب سے زیادہ پُر اثر اور ادبی اعتبار سے گراں مایہ ہیں۔ ایسی رباعیوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے محترمہ نے حفیظ بنارسی کے نظریۂ کائنات پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

حفیظ بنارسی کی مذہبی شاعری کے سلسلے میں چار مضامین شامل ہیں۔ محمد ولی اللہ قادری اور ڈاکٹر حبیب الرحمان علیگ کے مضامین اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ محمد ولی اللہ قادری نے حمد ومناجات کے تعلق سے اور حبیب الرحمٰن صاحب نے نعتیہ شاعری کے حوالے سے مفصل مضامین لکھے ہیں۔ حفیظ بنارسی نمبر میں 'خصوصیات ومحاسن' کی ایک علاحدہ شق قائم کر کے اجمالی نوعیت کے مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔ اس حصّے میں ڈاکٹر ولی احمد ولی کا مضمون 'حفیظ بنارسی کا شعری آہنگ' حاصلِ شمارہ ہے۔ کہنا چاہیے کہ پورے شمارے میں حفیظ کی شاعری کے تعلق سے یہ سب سے بھرپور مضمون ہے۔ حفیظ بنارسی کی نثر نگاری کے حوالے سے جناب انوار محمد عظیم آبادی کا ایک مضمون شامل ہے جس سے حفیظ بنارسی کی بکھری ہوئی نثری تحریروں کے بارے میں اطلاع ملتی ہے۔ مضمون نگار نے یہ اچھا کیا کہ ان نایاب اور گمشدہ مضامین کے معتد بہ اقتباسات اپنے مضمون میں شامل کردیے جس سے پڑھنے والوں کو مضمون نگار کے نتائج کے احتساب کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ تحقیقی اور تعارفی مضمون ہے۔ 27 حوالہ جات حواشی کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار نے مختلف بکھری ہوئی تحریروں کا تعارف کرانے کے ضمن میں ہی بعض تنقیدی یا احتسابی جملے شامل کردیے ہیں۔ حفیظ بنارسی کے سلسلے سے جو کوئی بھی تحقیق کرے گا، اسے اس مضمون سے لازماً فائدہ اٹھانا ہوگا لیکن پتا نہیں کیوں اس مضمون کا عنوان ''حفیظ بنارسی: ایک لیکھک'' منتخب کیا گیا؟

40 صفحات سے زیادہ حصّے میں حفیظ بنارسی کی تحریروں کا انتخاب اس خصوصی اشاعت کی ایک اہم خوبی ہے جس میں ان کی شاعری کے ہر پہلو کی نمائندگی بھرپور طریقے سے ہوجاتی ہے۔ حفیظ بنارسی کا ایک تنقیدی

مضمون اور ایک انشائیہ بھی شامل کر کے اس انتخاب کو اور بھرپور بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پورے رسالے میں Filler کے طور پر حفیظ کے مضامین یا ان کے سلسلے میں لکھے گئے مضامین سے اقتباسات شائع کیے گئے ہیں۔ شعری حصے میں انتخاب کرتے ہوئے کہیں مطلع در مطلع ہے تو کہیں مقطعے جمع کر دیے گئے ہیں۔ انتخاب کے سلسلے میں اور بھی تجربے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالے کی ترتیب و تہذیب میں شامل افراد نے سرسری قسم کا کوئی کام نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے جو موضوع لیا، اس کے ہر پہلو پر اُن کی نظر ہے اور جو دستاویز وہ تیار کر رہے ہیں، اس میں ان کی محنت اور مشقت شامل ہے۔ وہ جی چُرا کر کام نہیں کر رہے ہیں بلکہ جی لگا کر اپنے کام کو بیش از بیش بہتر بنا رہے ہیں۔ شاید انھی وجوہات سے 'زبان و ادب' کا یہ شمارہ ایک کامیاب ادبی کام قرار دیا جائے گا۔

میں ذاتی طور پر حفیظ بنارسی سے اپنے طفلی کے زمانے سے واقف ہوں اور تقریباً تین دہائیوں تک انھیں مشاعروں میں پڑھتے ہوئے سنتا رہا۔ شاید یہ میری کج فہمی ہو کہ انھیں کوئی معتبر شاعر کی حیثیت سے کبھی اہمیت نہیں دے سکا۔ ان کی شاعری کا عامیانہ رنگ اور مبلّغانہ طور مجھے ہمیشہ سرسری قسم کی صفات معلوم ہوئیں۔ شاعری اور ادب سے جس گہرے معنوی طلسم کی مجھے توقع تھی، وہ حفیظ بنارسی کی شاعری میں کبھی نہ مل سکی۔ اسی لیے بہار اردو اکادمی کے سکریٹری کی گزارش کے باوجود مجھے بھی نہیں لکھنے والوں کی فہرست میں بہ خوشی شامل رہنا پڑا۔ لیکن جب یہ نمبر منظرِ عام پر آیا تو مضامین اور منتخب کلام کی ورق گردانی کرتے ہوئے حفیظ کے کئی اشعار چمکتے ہوئے دکھائی دیے۔ شاید ایسے نمبروں یا خصوصی اشاعتوں کا ہی یہ فیضان ہے کہ شاعر کا بہترین کام نمونے کے طور پر سامنے آ جاتا ہے تاکہ لوگ اسے گانٹھ میں باندھ لیں اور رطب و یابس کو بھول جائیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شہر کا شہر ہو گیا پتھر — آنکھ جھپکی، بدل گیا منظر

لہو کی مے بنائی، دل کا پیمانہ بنا ڈالا — جگر داروں نے مقتل کو بھی مے خانہ بنا ڈالا

رخصت کی گھڑی جب آ پہنچی تب ہم کو حفیظ احساس ہوا — ہم آبِ رواں کے ماتھے پر کچھ نقش بنانے آئے ہیں

دستور کچھ عجب ہے محبت کے شہر کا — دل کو ملیں سزائیں، نظر کا قصور تھا

جگنو بن کر تری یادوں کے اجالے چمکے — جب اندھیرے نظر آئے گھنے جنگل کی طرح

اسی سے لڑتے ہوئے ایک عمر بیت گئی — مری اَنا ہی مرے راستے کا پتھر ہے

حق بات میں نے کہہ دی، یہی میرا فرض تھا — اب کاٹ لو زباں کہ مرا سر قلم کرو

حفیظ اپنی شکستوں سے بھی اکثر عزائم کو توانائی ملی ہے
خوشی سے چھوڑتا ہے کون اپنے آشیانے کو وہاں جانا پڑا ہم کو جہاں کا آب و دانہ تھا
دنیا اسے سُنے گی تو بس مسکرائے گی جگنو پکڑ رہا تھا، مرے ہاتھ جل گئے

یہ اشعار حفیظ بنارسی کی شاعری کا کچھ دوسرا رنگ پیش کر رہے ہیں جن میں گہرائی، تفکر اور ادب کا سنجیدہ شعور موجود ہے۔ ممکن ہے اس خصوصی شمارے کے مطالعے سے بعض اور شاعرانہ نکتے بھی پڑھنے والوں کے دماغ میں آسکتے ہیں۔ کسی رسالے کے خصوصی شمارے سے اس سے زیادہ کوئی توقع کیسے رکھ سکتا ہے؟

بہار اردو اکادمی کے سکریٹری شہزاد انور اور ان کے رفیقان اس کارآمد خصوصی شمارے کی اشاعت کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آگے احمد یوسف کی یاد میں بھی ایک خصوصی شمارہ نکالنے کا اعلان شائع ہوا ہے۔ شہزاد صاحب نے اردو اخباروں کو جاری کردہ اپنے بیان میں کلیم الدین احمد کے سلسلے سے بھی ایک بھرپور شمارہ ۲۰۰۹ء میں ان کی صد سالہ تقریب کے تعلق سے شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ شاد عظیم آبادی پر بھی بلاشبہ ایک نیا خصوصی شمارہ 'زبان وادب' کا آنا چاہیے۔ قاضی عبدالودود، احمد جمال پاشا، فضل حق آزاد، راسخ، جوشش، غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، زکی انور وغیرہ کے سلسلے سے بھی 'زبان وادب' کی آیندہ اشاعتیں مخصوص کی جا سکتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ خاص نمبر اور عام شمارہ باری باری سے شائع کیے جائیں۔

موجودہ حالات میں بہار اردو اکادمی ہی کیا، ہندستان کی اکثر وبیشتر اکادمیوں سے اردو کے فروغ کے ٹھوس اقدامات کی توقع لائق قیادت کے فقدان میں ناممکن ہے۔ اکادمیاں کچھ ملازمین اور چند ادیبوں اور شاعروں کو تنخواہ، مالی اعانت یا انعام واکرام بانٹنے کا پلیٹ فارم بن کر رہ گئی ہیں۔ ایسے میں بہار اردو اکادمی محنت اور سلیقہ مندی کے ساتھ اپنے رسالے کو لگاتار شائع کرتی رہے اور ایک خاص علمی وابستگی کے ساتھ اس کے شمارے منظر عام پر آتے رہیں تو یہ نیک اور خوش آیند کام بھی ضرور ہوگا۔ اردو کے ایک مدرس اور ٹوٹے بکھرے لفظوں کے لکھنے والے کی حیثیت سے سکریٹری محترم سے میری یہ محدود التجا ہوگی بہ قولِ مخدوم:

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہ کن کی جیت ہو

(2009)

نگارشاتِ خواتین نمبر

بہار اردو اکادمی کا ترجمان 'زبان وادب' ملک کے طول وعرض میں اس بات کی شناخت رکھتا ہے کہ یہ کبھی تواتر کے ساتھ نہیں نکلا اور چاہے جتنے بھی بیش قیمت شمارے شائع ہوئے ہوں لیکن کبھی بھی انھیں ملک گیر سطح پر پھیلانے کا کوئی نظم نہیں کیا گیا۔ یہ دونوں باتیں یعنی بے قاعدگی سے چھپنا اور ملک کے گوشے گوشے میں دستیاب نہیں ہونا جیسی خصوصیت ہر دور میں ایک سچائی کی طرح اس رسالے سے چمٹی رہی ہے۔ چاہے وہ زمانہ سہیل عظیم آبادی کا ہو یا کلیم الدین احمد کا؛ چاہے ش۔ مظفر پوری کا زمانہ ہو یا مشتاق احمد نوری کا؛ اس بات کی تصدیق لازمی طور پر بہار اردو اکادمی کے دستاویزات سے ہو سکتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس رسالے کے مشتملات از کار رفتہ، بے مغز اور غیر معیاری ہوتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، جمیل مظہری وغیرہ کی حیات وخدمات سے متعلق ماضی میں جو ادبی گوشے یا خصوصی شمارے شائع ہوئے، وہ بے حد قیمتی تھے اور ان کی بے انتہا پذیرائی ہوئی۔ شاد عظیم آبادی نمبر تو دوسری بار شائع ہوا اور پھر بازار سے ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود کبھی بھی 'زبان وادب' کو ایک مستقل رسالے کی طرح ماہ بہ ماہ یا طے شدہ وقفے کے ساتھ سلیقے سے شائع کرنے اور ملک کے دوسرے اچھے رسائل کی طرح کاروباری انداز میں پھیلانے کا لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی جس کی وجہ سے ہر نئے شمارے کی آمد سے اس کے زندہ ہونے کا پتا چلتا ہے اور کبھی مہینوں اور کبھی برسوں انتظار کے بعد نئے سرے سے یہ رسالہ شائع ہو کر ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اس رسالے نے آخری جام نہیں پیا اور ابھی اس کی سانس باقی ہے۔

گذشتہ دنوں بہار اردو اکادمی کی جو نئی کمیٹی حکومت بہار نے تشکیل کی، وہ کئی اعتبار سے حیرت انگیز تھی۔ ایک نائب صدر جو دوبارہ برسرِ اقتدار ہوئے، وہ پچھلے دور میں عہدہ داران کی آپسی لڑائی کے سرخیل ثابت

ہوئے تھے۔ حالاں کہ حکومت نے انھیں شاید ایک ساتھ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں درک کاملہ کی بنیاد پر اس عہدے کے لیے منتخب کیا تھا۔ خدا کی مہربانی سے انھوں نے اپنے پچھلے تجربے کو مزید استحکام کے ساتھ آزمایا اور یہ تین برس بھی آپسی نفاق اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے ہی میں گزر گئے۔ دوسرے نائب صدر کے عہدے کو ایک میڈیکل سرجن کو عطا کیا گیا جن کی تین برس کی حصولیابی یہی رہی کہ وہ نائب صدر اول کے ذریعہ جنگ و جدال کی فضا قائم کرنے میں مستعدی سے سرگرم عمل رہے۔ تعمیری یا زبان و ادب کے فروغ کا کوئی کام ان کی کوششوں سے انجام تک پہنچا ہو، یہ مجھے معلوم نہیں۔

انھی دونوں صاحبان کے ساتھ جناب شہزاد انور انصاری اردو اکادمی کے سکریٹری بنائے گئے تھے۔ یہ بھی حکومت کا چونکانے والا فیصلہ تھا۔ اردو ادب سے اس وقت تک شہزاد انور کا یہی تعلق تھا کہ انھوں نے کسی زمانے میں ایم اے اردو زبان و ادب مضمون کے ساتھ پاس کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے اس عہدے کے لیے اہل ہونے کے بارے میں کوئی اور بنیادی خدمت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن حکومتِ بہار نے انھیں اس معتبر منصب کے لیے منتخب کیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح خاکسار کو بھی بہار اردو اکادمی کی اس تشکیل سے بے حد مایوسی ہوئی تھی کیوں کہ تین برس کے لیے پھر اس ادارے کو اندھیرے میں گم ہو جانا تھا۔ خدا خدا کر کے اکتوبر ۲۰۱۰ء میں ان تمام عہدہ داران کی میعاد پوری ہوئی۔ اخبارات میں دونوں نائب صدور بار بار ایسے الزامات عائد کرتے رہے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اکادمی کے سکریٹری مَن مانی کرتے ہیں اور قوم کے پیسوں کا زیاں کر رہے ہیں۔ تقسیم انعامات کی تقریب یا بعض فضول قسم کے مشاعرے شہزاد انور انصاری کے دور میں انجام پذیر ہوئے؛ وہ نہ شفاف تھے اور نہ ہی اکادمی کے اعلا ادبی معیار کے مطابق تھے۔

لیکن اس دوران بہار اردو اکادمی کے ادبی ترجمان 'زبان و ادب' میں کچھ نمایاں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ اچانک کچھ خاص شمارے یا گوشے بہت سلیقے سے آنے لگے۔ پرکاش فکری اور احمد یوسف کی وفات کے بعد 'زبان و ادب' میں اُن پر جو گوشے مخصوص کیے گئے، وہ حیرت میں ڈالتے ہیں۔ ایک مردہ قسم کے رسالے میں یہ تیزی کیسے پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے ہونہار اور جیالے ادیبوں اور شاعروں کی وفات کے بعد فوری طور پر نذرانۂ عقیدت پیش کرے۔ حفیظ بنارسی کی وفات پر تو اس رسالے نے پورے ایک سو ساٹھ صفحات کا ایک مکمل نمبر شائع کر دیا۔ ایسی روایت زندہ اداروں میں تو پَل، بڑھ سکتی ہے لیکن مُردنی کی فضا قائم رہنے والی جگہ میں ایسی

خوش گوار تبدیلیاں کیسے پیدا ہونے لگیں؟ اس دوران کچھ عام شمارے بھی شائع ہوئے۔ مواد کے علاوہ ان شماروں میں پیش کش کا ستھراپن بھی جھلکتا تھا۔ اسی دوران اچانک معاون مدیر کے طور پر انوار محمد عظیم آبادی کا نام حروف جلی میں رسالے کی زینت بنا، تب جا کر یہ کہانی سمجھ میں آئی کہ شہزاد انور انصاری کی سکریٹری شپ میں اچانک 'زبان و ادب' جیسے مُردہ رسالے میں کیوں کر جان آ گئی اور کوئی ایک سرسری سا رسالہ اتنے منصوبہ بند طریقے سے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر مقبولیت کی کیوں نئی تاریخ لکھ رہا ہے؟ حالاں کہ رسالے سے الگ، بہار اردو اکادمی کی دوسری ذمّے داریوں کے بارے میں بہ قولِ شاعر یہی حال ہے: وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی، وہ اب بھی ہے۔

شہزاد انور انصاری اور انوار محمد عظیم آبادی کی جوڑی نے زبان و ادب کا جو تازہ شمارہ 'نگارشاتِ خواتین نمبر' شائع کیا ہے، وہ زبان و ادب کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس شمارے کی میعاد اکتوبر ۲۰۱۰ء تک پوری ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے شہزاد انور انصاری نے انوار محمد عظیم آبادی کی مدد سے قابلِ اتباع سلسلہ شروع کیا کہ ان کی سکریٹری شپ کے زمانے میں بہار اردو اکادمی کا ترجمان Up-to-date ہو گیا۔ اب کوئی دوسرا سکریٹری آئے یا وہی دوسری بار برسرِ اقتدار ہوں، ہر صورت میں یہ سہولت رہے گی کہ دوسرا اس رسالے کی بروقت اشاعت کو یقینی بنا سکتا ہے۔

زبان و ادب کا یہ شمارہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ شمارے کو دیکھتے ہی سہیل عظیم آبادی نمبر کی ضخامت یاد آ گئی۔ پیش کش میں ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ رسالہ بہار سے شائع ہوا ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب اور پُراز معنیٰ ہے۔ کوئی کم علم ایڈیٹر ہوتا تو چٹخارے کی شمولیت سے اسے بارونق بنانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اردو آبادی کے مزاج اور آداب کے ساتھ تہذیب، نفاست اور شائستگی کا اس قدر پاس رکھا گیا ہے کہ اہالیانِ زبان و ادب کے سلیقے پر فدا ہو جانے کا جی چاہتا ہے۔ کاغذ منتخب کرنے میں تو اور بھی پیشہ ورانہ ذہانت کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ ضخیم رسالے یا کتابوں کو انگریزی کے بین الاقوامی سطح کے ناشرین وزن میں ہلکے کاغذوں کا استعمال کرتے ہیں جس سے کتابوں کی پوسٹنگ یا رسد آسان ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے ہندی کے ناشرین نے اس جانب توجہ کی ہے لیکن میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا جب زبان و ادب نے کاروبارِ اشاعت کے اس جدید ترین انداز کو اپناتے ہوئے اس خاص نمبر میں اسی انداز کا تاثیر میں دبیز لیکن وزن میں نہایت ہلکا کاغذ جس کا

رنگ سفید کی جگہ بادامی ہو، استعمال کر کے واقعتاً اردو اکادمی کے لیے ایک نئی تاریخ لکھ دی ہے۔

'زبان وادب' کے اس شمارے میں ۶۷ خواتین کی تحریریں شامل ہیں۔ ان میں صرف نو خواتین بہار سے باہر کی ہیں اور ایک کہکشاں پروین کا تعلق اُس جھارکھنڈ سے ہے جو دس برس پہلے تک بہار کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس شمارے کو 'نگارشاتِ خواتین بہار نمبر' کے طور پر پیش کرنے کا حوصلہ کیوں نہیں کیا گیا۔ جو شمارہ شائع ہوا ہے، وہ بھی نوّے فیصدی بہار کی خواتین پر مشتمل ہے۔ باقی ماندہ چیزوں کو یا تو کسی دوسرے شمارے میں شامل کر لیا جاتا یا موازنہ کی غرض سے موجودہ شمارے میں ہی ایک الگ گوشہ بہار سے باہر کی خواتین پر قائم کر دیا جاتا۔ ایسا لگتا ہے کہ شمارے کے بارے میں ابتدائی طور پر خاکہ بناتے ہوئے مدیرانِ محترم نے ان امور پر زیادہ غور نہیں کیا۔ ایسی صورت میں یہ رسالہ مزید دستاویزی حیثیت اختیار کرتا اور محققین کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوتا۔ اس رسالے میں مشہور اور معروف خواتین کے شانہ بہ شانہ نوآموز خواتین بھی شامل ہیں لیکن پٹنہ شہر سے کوئی رسالہ نکلے، اور اس میں خواتین کی ہی لازمی شمولیت بھی ہو، تب یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں ذکیہ مشہدی کی کوئی تحریر شامل نہ ہو۔ ممکن ہے انھوں نے کوئی افسانہ رسالے کو اشاعت کے لیے نہیں دیا ہو لیکن مدیر کی پیشہ ورانہ مہارت اور ذہانت آزمائی گئی ہوتی تو ذکیہ مشہدی پر ایک مضمون شائع کرنے میں کیا قباحت تھی؟ ان کے کسی افسانے کا تجزیہ ہی شامل کیا جا سکتا تھا جس سے رسالے کا مزید اعتبار اور وقار بڑھتا۔

پتا نہیں کیوں اتنے نادر اور نایاب موضوع کا انتخاب کرنے کے باوجود مشتملات کے سلسلے سے کوئی ٹھوس موضوعاتی درجہ بندی نہیں کی گئی۔ کیا یہ بہتر موقع نہیں تھا کہ بہار سے متعلق خواتین کے ادب کا ایک منصفانہ جائزہ اس شمارے کا اصلی شناخت نامہ ہوتا۔ شکیلہ اختر اور جمیلہ خدا بخش کے سلسلے سے علاحدہ مضامین تو ہیں لیکن دونوں تشنہ ہیں۔ رشیدۃ النسا کا ایک سے زائد جگہ تذکرہ ہے لیکن کہیں بھی اس خاتون کی خدمت کے لیے شایانِ شان محاسبہ روا نہیں رکھا گیا۔ شمیم صادقہ، اعجاز شاہین، عصمت آرا، ذکیہ مشہدی، صبوحی طارق، شمیم افزا قمر، نزہت نوری، قمر جہاں، تبسم فاطمہ، شاہدہ یوسف، تسنیم کوثر، آشا پربھات، افسانہ خاتون، فرزانہ اسلم، رابعہ مشتاق وغیرہ کی خدمات کا بالاستیعاب مطالعہ موجود نہیں۔ اسی کے ساتھ اگر اہم اصناف کے حوالے سے باضابطہ ایسے تحقیقی مضامین کی شمولیت کی جانی چاہیے تھی جن میں خواتین کی خدمات کا لیکھا جوکھا ہوتا۔ افسانہ،

ناول، تنقید، تحقیق جیسی صنفوں میں تو بہار کے حوالے سے بھرپور گفتگو کی ہی جاسکتی تھی لیکن اس قبیل میں صرف ایک مضمون نازیہ نوشاد کا 'بہار کی خواتین افسانہ نگار' ہی کو شامل کرکے کام مکمل سمجھ لیا گیا ہے۔

اس خاص شمارے میں جہاں ۳۹ خواتین کی تنقیدی اور تحقیقی نگارشات شامل ہیں، وہیں تخلیقی ادب کے حوالے سے ان کی خدمات مقدار کے اعتبار سے بہت کم معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۶/افسانے، ۵/نظمیں اور محض ۷/غزلیں اس شمارے کو نئے اصولی چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے کے لیے ہمیں مجبور کرتے ہیں۔ کبھی خواتین کا پہلا جھکاو افسانے اور ناولوں کی طرف ہوتا تھا۔ اردو کی ادبی تاریخ اس سلسلے سے ہماری واضح رہنمائی کرتی ہے۔ پُرانے زمانے میں تنقید اور تحقیق کی طرف عورتیں کہاں آتی تھیں لیکن اب اگر 'زبان و ادب' کے اس شمارے کو ایک پیمانہ تصور کیا جائے تب یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فی زمانہ خواتین کا جھکاو تخلیقی ادب سے زیادہ تنقید و تحقیق کی طرف ہے۔ پہلے یہ تاویل دی جاتی تھی کہ عورتوں کے ذہن کا سانچہ زیادہ جذباتی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ مزاجاً فکشن کی طرف مُڑ جاتی ہیں۔ تنقید اور تحقیق میں اُن کی عدم موجودگی سے یہ بھی نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ بالعموم اُن کے ذہن کا سانچہ معروضی نہیں ہوتا، اس لیے تنقید و تحقیق ان کے بس کا روگ نہیں۔ آج اگر انھی پُرانی تاویلات پر خود کو مرکوز کریں تو یہ کہنا چاہیے کہ آج کی خواتین بالخصوص صوبہ بہار کی خواتین کے ذہن کا سانچہ معروضی اور تنقید و تحقیق کے لیے نہایت سوزوں ہو گیا ہے۔ لیکن اس مفروضے کی درستگی قابلِ یقین نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ درس و تدریس سے وابستہ خواتین پیشے ورانہ ترجیحات کی وجہ سے تنقید و تحقیق کی طرف ضرورتاً آ گئی ہیں۔ اس لیے ایسے افراد کی تعداد اور تناسب حیران کُن ہے۔ ادب اور سماج کے ماہرین کو اس صورتِ حال پر گہرائی سے غور کرنا چاہیے۔

'نگارشاتِ خواتین نمبر' میں جو افسانے، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں، ان کے مقابلے میں حصّہ مقالات زیادہ وقیع ہے۔ اس شمارے کا آغاز پروفیسر ایس۔ کے۔ جبیں کے مضمون ''خواتین اور اردو ادب'' سے ہوا ہے۔ عام طور سے آغاز میں غزل کے مطلع کی طرح زور آور مضامین کی شمولیت کا رواج رہا ہے۔ لیکن جس قدر موضوع وسیع ہے، اسی قدر تنگنائے غزل ہے۔ اس لیے حد درجہ سرسری مطالعہ کا طَور یہاں اپنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر آصفہ واسع کا مضمون بھی بے دلی سے لکھا گیا ہے لیکن بہار کے قدیم ادب پر اُن کی گہری نگاہ ہے، اس لیے رشیدۃ النسا اور ان کی صاحب زادی کبریٰ عظیم آبادی کے تذکرے سے ان کا مضمون قابلِ مطالعہ ہو گیا ہے۔

رنجور عظیم آبادی کے فن کا پروفیسر ثریا جبیں نے محض دو صفحے میں جو جائزہ لیا ہے، وہ تعارفی نوعیت کا ہے جب کہ ماضی میں خود وہ اس موضوع پر اچھی خاصی تحقیق کر چکی ہیں۔

شعبۂ تنقید میں زکی انور اور کلیم الدین احمد کے تعلق سے دو دو مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ انھیں اطمینان بخش تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان مضامین سے اتنا اندازہ ہو جاتا ہے کہ لکھنے والوں نے سرسری مطالعے سے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ نشاط کوثر کے مضمون 'زکی انور کے افسانوں میں سماجی معنویت' میں زکی انور کی خصوصیات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر زکی انور کا افسانوی مقام ان کے ہم عصروں سے موازنہ کر کے طے کر دیتیں۔ محترمہ افشاں نگار اجمل کا مضمون 'کلیم الدین احمد کی انتقادی خدمات' میں جن مباحث کو شامل کیا گیا ہے، مصنفہ کا یہ فریضہ تھا کہ انھیں تفصیل کے ساتھ انجام تک پہنچائیں۔ 'سجاد ظہیر کی تنقید نگاری' پر ڈاکٹر نور سیما رضوی کا مضمون نہایت تشنہ ہے۔ وہ چاہتیں تو اس سلسلے سے مواد کے حصول میں زیادہ دشواری نہیں تھی۔ لیکن سجاد ظہیر کی کتابوں سے براہ راست واقف ہوئے بغیر ان کا مضمون کس طرح باوزن ہو سکتا تھا؟

اس شمارے میں فکشن پر اچھا خاصا زور ہے اور کئی نقادوں نے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی خدمات کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے سے سب سے تفصیلی مضمون سیدہ پروین انور کا 'قرۃ العین حیدر اور ان کا فکشن' ہے۔ حالاں کہ یہ تعارف کی حد سے زیادہ آگے نہیں بڑھتا اور نہ ہی قرۃ العین حیدر کے اثرات اردو ادب پر کس طرح ہوئے، اس کی یہاں نشان دہی ہوتی ہے۔ فکشن کے تعلق سے بعض اچھے مضامین وہ ہے جنھیں عُرفِ عام میں ہم "افسانوی تجزیہ" کہہ سکتے ہیں۔ دوزخی (زکی انور): تسنیم فاطمہ؛ مسنگ مین (غضنفر): علینہ علی ملک؛ ابراہیم سقہ (سلام بن رزاق): ترنم جہاں اور پنچایت (پریم چند): الفیہ نوری چار تنقیدی تجزیے اس خاص نمبر کی زینت ہیں۔ 'مسنگ مین' کا تجزیہ کرتے ہوئے علینہ علی ملک نے مابعد جدید اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے، جس کے سبب غضنفر کے اس افسانے کے بعض نئے مفاہیم ہمیں قابلِ غور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایک حوصلہ افزا صورتِ حال ہے کہ نئی نسل کی خواتین بھی جدید ادبی اصول و نظریات پر اس طرح گہرائی کے ساتھ نظر رکھتی ہیں۔ غضنفر کا یہ افسانہ جس قدر شاعرانہ اسلوب کا حامل ہے، تجزیہ نگار نے اپنی نثر میں جگہ جگہ مصرعے اور مصرعوں کے ٹکڑے شامل کر کے غضنفر کی زبان دانی کے ساتھ نہایت موزوں اور

شایانِ شان سلوک کیا ہے۔ سلام بن رزاق کے مشہور افسانے 'ابراہیم سقّہ' کا ترنم جہاں نے جو تجزیہ پیش کیا ہے، اس میں فکشن سے متعلق ان کے تاریخی اور اصولی علم کا تو بھرپور اظہار ہوا ہی ہے لیکن اس افسانے کے داخلی سوز کو پکڑنے میں تجزیہ نگار پورے طور پر کامیاب نہیں۔ افسانے کی تکنیک پر بھی انھوں نے بہت مناسب گفتگو کی ہے لیکن ابراہیم سقّہ کی زندگی کے اندھیروں کو ذرا مزید باریکی اور گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت تھی۔ Subaltern تھیم کو انھوں نے جس سلیقے اور اعتماد کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے لیکن ابھی مزید گہرائی کی ضرورت ہے۔ الفیہ نوری نے پریم چند کے مشہور افسانے ''پنچایت'' کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ عنوان ہی میں انھوں نے پنچایت کو ''فرض شناسی کا افسانہ'' قرار دے کر یہ بتا دیا ہے کہ وہ پریم چند کے بدلتے ہوئے ذہن سے پورے طور پر واقف ہیں۔ وہ بجا طور پر یہ مانتی ہیں کہ 'پنچایت' آدرش وادی سے زیادہ سائنسی فکر کا افسانہ ہے۔ ان کا کہنا ہے:

> ''پریم چند کا کہنا ہے کہ انسان کے کاندھے پر جیسی ذمّے داری عائد کی جاتی ہے، وہ اس کے مطابق نئے حالات میں کام کرنے لگتا ہے۔ پنچ بن کر الگو یا بھی شیخ جمّن نے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیے، وہ اصل میں فرائض اور ذمّے داریوں کی بھٹی میں تپ تپا کر کندن بنے ہوئے افراد کی زندگی سے عبارت ہے۔''

پریم چند کو سمجھنے کے لیے یہ نیا زاویۂ نظر ہے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ انھوں نے بہت سارے فنّی اور تکنیکی پہلو بھی بحث کے دوران پیشِ نظر رکھے ہیں۔ شعرائے کرام کے حوالے سے بھی معتدبہ مضامین اس رسالے میں موجود ہیں۔ شاہد پٹھان کی شاعری پر ڈاکٹر اسما مسعود اور گوتم متراگوتم پر گل آفریں صاحبہ کے مضامین اچھے خاصے اور بھرپور ہیں۔ غالب، فیض، اقبال اور ڈاکٹر شیراز کے حوالے سے جو مضامین اس رسالے میں شامل ہیں، وہ ان شعرا کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ ڈاکٹر جمال فاطمہ کا مضمون 'مولانا جامی کے ادبی کارنامے' بے حد سرسری ہے۔ اسی طرح 'مصلا میں اردو نثر کا ارتقا' مضمون بھی موضوع کے ساتھ تحقیقی طور پر انصاف نہیں کرتا۔ یہاں تحقیقی آداب سرے سے ناپید ہیں جس کی وجہ سے یہ مضمون معلّق اور پڑھنے والوں کے لیے معلّق ہو گیا ہے۔ شائستہ خاتون کا مضمون ناوک حمزہ پوری کے تعلّق سے غنیمت ہے۔ اس میں جو جرح کا انداز ہے، وہ بہت قیمتی ہے۔

اس رسالے میں بعض لکھنے والوں کے نہایت عمدہ اور اچھوتے موضوعات پر سیر حاصل مضامین شامل ہوئے ہیں جن کی وجہ سے اس رسالے کا شاید اعتبار قائم ہو۔ سلمیٰ کبریٰ کا مضمون 'اردو غزل میں تصوف کے مختلف نکتوں کی تلاش' اچھا خاصا ہے۔ اشعار کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے جتنی مشقت کی ہے، اگر تجزیے میں اس کا نصف دھیان بھی شامل ہو جاتا تو اس مضمون کی علمی لو لہلہا اٹھتی۔ ابھی یہ صرف Fact Finding Report کی حد میں سمٹا ہوا ہے۔ 'نیرنگِ خیال' کے حوالے سے محترمہ عابدہ پروین کا مضمون 'زبان وادب' کے علمی مزاج کے شایانِ شان ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں محمد حسین آزاد کا اسلوب کس جگہ موزوں بیٹھتا ہے، اس کو انھوں نے حل کرنے کی موثر کوشش کی ہے۔ ان کے اس نتیجے سے بحث کی جاسکتی ہے کہ بیسویں صدی میں اسلوبیاتی سطح پر میر امن کے مقابلے محمد حسین آزاد کی نثر کا زیادہ جادو قائم ہوا اور ممکن ہے بعض لوگ اس سے اتفاق نہیں کریں۔ لیکن انھوں نے اس موضوع پر عالمانہ گفتگو کی ہے، وہ نہایت کارآمد اور مناسب ہے۔ ڈاکٹر خالدہ خاتون کا مضمون 'محمد حسن کی ڈرامہ نگاری' کے اکثر و بیش تر پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح 'جنگ آزادی میں بہار میں مسلم خواتین کا حصہ' مضمون نہایت کارآمد ہے اور جنگ آزادی کی چند گم شدہ کڑیوں کو جوڑنے میں مددگار ہے۔ تبسم جہاں نے 'وحدتِ ادیان میں داراشکوہ کے نقوش' کو موضوع بنایا ہے۔ یہ مضمون تحقیقی آداب سے لیس ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'زبان وادب' شعروادب سے الگ حلقے میں بھی لکھنے والوں کا مستقل گروہ قائم کر رہا ہے، یہ خوش آیند بات ہے۔

'نگارشاتِ خواتین نمبر' میں ۱۶ افسانہ نگاروں کی شمولیت یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اب بھی افسانے کی بزم میں ایک کشش باقی ہے۔ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ شمارہ بہار کی سب سے معروف افسانہ نگار ذکیہ مشہدی کے افسانے سے خالی ہے۔ ان کی غیر موجودگی میں قدرے معروف افراد میں قمر جہاں اور اشرف جہاں کے افسانے ہی اس شمارے کی شناخت بن سکے ہیں۔ اس حلقے میں ایسے افسانہ نگار کم دکھائی دے رہے ہیں جن کی تخلیقات دوسرے ادبی رسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی ہوں۔ ان افسانوں میں عورتوں کا سوز اور اس کے داخل کا زور ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ کم وبیش یہی حالت شاعری کی ہے۔ نہ اس میں اُن کا نسوانی کردار اس انداز سے اُبھرتا ہے کہ ہمیں یقین ہو جائے کہ آج کی عورت کس انداز سے سوچتی ہے اور نہ ہی ان کا کوئی بھرپور شعری پیکر سامنے آتا ہے۔ اس اعتبار سے اس خاص شمارے کا تخلیقی حصہ کمزور ثابت ہوتا ہے جو اس

بات کی دلیل ہے کہ بزمِ خواتین میں اب پُرانی صورتِ حال نہیں رہی۔ اب ان میں سے نقاد اور محقق بھلے ابھریں لیکن آسانی سے کوئی عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر بن کر نہیں آنے والی ہیں۔

ادھر چند برسوں سے 'زبان وادب' کے مزاج اور اطوار میں جو تبدیلی آئی ہے، اس کی وجہ سے مجھ جیسے قاری کے دل میں اچھی خاصی توقعات پیدا ہوگئی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ پورے اردو حلقے میں شاید یہی صورت ہو۔ جنھیں 'زبان وادب' کی تاریخ سے واقفیت ہے، انھیں پتا ہے کہ یہ رسالہ اپنے تحقیقی، تنقیدی اور گاڑھے مضامین کی وجہ سے پہچانا گیا۔ تخلیقی ادب کی اشاعت کے لیے یوں بھی رسائل کی کمی نہیں ہے۔ مدیرانِ 'زبان وادب' ذرا سی کوشش کریں تو اس رسالے کی افتادِ علمی مکمل طور پر لوٹ سکتی ہے۔ اس کی اشاعت کے وقت کبھی بھی یہ نہ سوچا جائے کہ یہ عظیم آباد کا ایک مقامی رسالہ ہے۔ بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اسے قومی سطح پر پھر سے پہچان دلانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے دو ضروری کام ہیں۔ سب سے پہلے اسے ملک کے دوسرے صوبوں کے اہم کتب فروش اور بک اسٹال تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ پورے ملک کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس سلیقے اور تواتر کے ساتھ یہ رسالہ آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ نیک مہم اسی شمارے سے شروع ہو۔ میرا دوسرا مشورہ یہ ہوگا کہ زبان وادب کے لکھنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہونا چاہیے۔ بہار ہی نہیں بلکہ ملک کے تمام اہم اور غیر اہم ادبی مراکز کے اہلِ قلم کو اس رسالے سے جوڑنا ہوگا۔ رسالہ صرف موصول ہو گئے مضامین یا اعلان کے بعد بھیجے گئے کچے پکے مضامین سے نہیں نکلتا۔ بلکہ اکادمی کو چاہیے کہ وہ مخصوص موضوعات کو پیشِ نظر رکھ کر نئے مضامین اس موضوع کے ماہرین سے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق لکھوائے۔

(2010)

پیروڈی کا فن

یہ بات بالعموم بزرگوں کی طرف سے کہی جاتی ہے کہ آج کی تازہ کار نسل علمی کاموں میں جی نہیں لگاتی۔ تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کے امور میں تو کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ نسلِ نو کے طفیل یہاں جہالت کی فصل لہلہا رہی ہے۔ یہ بات اگر غلط نہیں ہو، تب بھی اس سوال کا جواب بزرگوں کو ہی دینا ہے کہ نئی نسل کی تربیت اور علم کے بیش بہا خزینوں سے انھیں مستحکم کرنے کی ذمّے داری آخر کس کی تھی؟ تعلیمی جماعتوں میں انھیں کس نے پڑھایا، اُن کے تحقیقی مقالے کس کی نگرانی میں لکھے گئے اور انھیں یونی ورسٹیوں میں پڑھانے کے لیے کن لوگوں نے منتخب کیا؟ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ علم کے ساتھ جُہل کا کاروبار ہر دور میں قائم رہا ہے۔ یہ امتیاز کوئی نسلِ نو سے ہی مخصوص نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں میں جہاں علم وادب کے آفتاب وماہتاب کی ایک کہکشاں سجی ہوئی ہے، وہیں ایسے بزرگوں کی ایک لامتناہی فہرست بھی موجود ہے، جنھوں نے اپنے اساتذہ سے تو کچھ نہیں ہی سیکھا اور نہ وہ اپنے شاگردوں تک اپنے علم (؟) کی روشنی بکھیر سکے۔ ایسے اساتذہ جب کسی سے می نار میں مقالہ پڑھتے ہیں تو ان کے شاگرد منہہ چھپائے پھرتے ہیں اور زبان اور تلفظ کی غلطیوں پر مجمع ششدر رہتا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں بھی بلاشبہ ایسے افراد کی کمی نہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کیوں کہ ان کے بعض اساتذہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ جوانوں کو اگر اپنی جہالت کا پتا چل جائے یا اپنے نااہل اساتذہ سے چھٹکارا مل جائے یا کوئی صحیح راہ بر میسّر آجائے تو پھر اُن کی علمی زندگی پٹری پر لوٹ آئے گی لیکن ہمارے بزرگوں کو راہِ راست پر کون لائے گا؟

اس حقیقت کے متوازی ایک دوسری صورتِ حال سامنے ہے۔ اس سچائی سے کیسے انکار کیا جائے کہ تیس چالیس برس کے بعض نوجوان اپنی تصنیفی خدمات کی وجہ سے حیرت انگیز طور پر ہمیں متاثر کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اُس وقت یہ بات اور بھی قابلِ استعجاب ہوتی ہے جب ایسے بچّوں کے مقالاتِ امتحانیہ برائے

ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی میں تنقید و تحقیق کے چمکتے ہوئے ہیرے برآمد ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر امتیاز وحید کی تازہ کتاب 'پیروڈی کا فن' سامنے آئی تو جی خوش ہوگیا جیسے نوجوان نے اس کتاب میں اپنی جان انڈیل کر رکھ دی ہو۔ تحقیق، تنقید اور تجزیہ ہر پہلو سے یہ کتاب اپنے موضوع پر دقّتِ نظری اور گرفتِ کلّی کا کھلا ثبوت ہے۔ بہار کے دورافتادہ علاقے سے نکل کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملّیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی میں صیقل ہوتے ہوئے امتیاز وحید نے اپنی کتاب سے نئے ریسرچ اسکالرس کا علمی بھرم قایم کیا ہے اور اپنے اساتذہ کے علم و فضل سے خود کو سینچ کر ایک مقالہء امتحانیہ کا اس زمانے کے اعتبار سے معیار قایم کیا ہے۔ اس کے لیے امتیاز وحید اور ان کے لائق اساتذہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

طنز و ظرافت کے شعبے میں اردو کی حد تک صفِ اوّل کے لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ اس سے لطف اٹھانے والے عوام و خواص کی تعداد بھی کبھی کم نہ ہوئی۔ لیکن تحقیق و تنقید کے حلقے میں اہلِ ظرافت پر توجہ ذرا کم ہی رہی ہے۔ اسی سے یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوتی رہی کہ کیا طنز و ظرافت کو ہمارے نقاد صفِ دوم کا ادب مانتے ہیں؟ ادبی سچائی بھلے ایسی نہ ہو لیکن موجودہ صورتِ حال ایسی ہی ہے۔ اس عالم میں طنز و مزاح کے ایک خاص شعبے 'پیروڈی' کی طرف کون توجہ کرنے والا ہے۔ اردو ادب کی پوری تاریخ کھنگال جائیے، رسالہ 'اسکالر' علی گڑھ اور 'شگوفہ'، حیدرآباد کے پیروڈی نمبر (1957ء، مدیر: احمد جمال پاشا) اور مظہر احمد کی مرتبہ کتاب 'پیروڈی' (2004ء) کے علاوہ چند متفرق مضامین بھی مشکل سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس فن سے متعلق امتیاز وحید نے 380 صفحات پر مشتمل کتاب تیار کر کے واقعتاً ریگستان میں ایک شجرِ سایہ دار اُگایا ہے۔ اس کتاب کے مواد کی حصولیابی میں تنِ ناتواں (محقق) پر کیا گزری ہوگی؛ کتاب کی سرسری ورق گردانی سے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

امتیاز وحید کے اس تحقیقی سرمایے میں دوسرے مقالہ جات کے بر عکس رسمی اور غیر ضروری ابواب کی شمولیت سے گریز کیا گیا ہے۔ تحقیقی مقالوں کا ''پیٹ بھرنے'' کے لیے اکثر لاتعلق ابواب کو مقالے کا حصہ بنادیا جاتا ہے۔ امتیاز وحید نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ 'پیروڈی' لفظ کی تعریف و توصیف اور اردو میں اس کی روایت کی نشان دہی کرتے ہوئے گفتگو کو اس قدر طول نہیں دیا گیا ہے جس سے بعد کے ابواب میں دہراو کی صورت پیدا ہو جائے۔ پیروڈی کے صنفی نام کے تعلق سے امتیاز وحید کی بحث تقریباً تمام ادبی و لسانی پہلوؤں کا احاطہ کر کے

مکمل ہوئی ہے۔ اس بات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے معاملات سے حسبِ ضرورت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پیروڈی کے دائرۂ کار کو متعین کرتے ہوئے تقریباً تمام ضروری ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ محض ۲۵ر صفحات میں مصنف نے مبادیات سے متعلق تمام کام کی باتوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہاں اردو کے دیگر نقّاد اور ظرافت نگاروں کے خیالات سے بھی اغماض نہیں برتا گیا ہے بلکہ تمام نکاتِ نظر کو سامنے رکھ کر گفتگو کو انجام تک پہنچایا گیا ہے۔

پیروڈی کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے تاریخی طور پر مصنف نے خود کو چاق و چوبند رکھا ہے۔ ایک مختصر تمہید کے بعد جعفر زٹلی سے تذکرہ شروع کیا گیا ہے۔ 'اودھ پنچ' کے مصنفین، اکبرالہ آبادی اور بیسویں صدی کے مشہور اور غیر معروف پیروڈی نگاروں کا نہایت اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ نثری پیروڈی کا نقطۂ آغاز پطرس بخاری کو بنایا گیا ہے۔ لیکن مصنف کے ذہن میں یہ بات محفوظ ہے کہ 'اودھ پنچ' کے دَور میں بھی پیروڈی کے آثار موجود تھے، اس لیے انھوں نے اس دور کی پیروڈی کی نشانیاں فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، احمد جمال پاشا اور ظفر کمالی کی چند نثری تحریروں کا تذکرہ کر کے مصنف نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو پیروڈی کی گم شدہ کڑیوں کو وہ کامیابی کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں۔ امتیاز وحید نے ایک کام یہ کیا کہ پیروڈی کی تاریخ اور روایت پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے بیان کو زیادہ پھیلنے نہیں دیا کیوں کہ آیندہ باب نمائندہ پیروڈی نگاروں کے لیے مخصوص تھا۔ روایت کے باب میں وضاحت آنے سے دہراو قایم ہونا ناگزیر تھا۔ یہ کسی بھی اچھے تحقیقی مقالے کی خوبی کہی جائے گی کہ لکھنے والے کو ہر باب کا دائرۂ کار معلوم ہے اور وہ اس لکشمن ریکھا کو پار نہیں کرتا۔

مصنف نے نثر و نظم دونوں شعبوں میں پیروڈی نگاری کے انفرادی جائزے کے ضمن میں بارہ اہم افراد کو منتخب کیا ہے۔ سیّد محمد جعفری، شہباز امروہوی، رضا نقوی واہی، راجہ مہدی علی خاں، مجید لاہوری، شیخ نذیر، اسرار جامعی، صادق مولا، کنھیا لال کپور، فرقت کاکوروی، شفیق الرحمان، احمد جمال پاشا جیسے اہم پیروڈی نگاروں کے نمائندہ کارناموں کو تقریباً ایک سو دس صفحات میں مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ نثر کے حوالے سے صرف شفیق الرحمان اور احمد جمال پاشا کی شمولیت یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ پیروڈی کا فن جس طرح شاعری میں قبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکا ہے، وہ صورتِ حال نثر میں نہیں ہے۔ نمائندہ پیروڈی نگاروں پر

گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی اہم نگارشات کا تنقیدی جائزہ لے لیا جائے اور مجموعی طور پر پیروڈی نگار کی حیثیت سے ان کا مقام و مرتبہ متعین کر دیا جائے۔ محض چند صفحات میں کسی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے مجموعی کاموں پر حکم لگانا مشکل ہے لیکن امتیاز وحید نے اس کام میں اپنی سلیقہ مندی ثابت کردی ہے۔ ہر جائزے میں نمائندہ تحریروں کو مثال کے طور پر استعمال کر کے مصنف نے عملی تنقید کے نمونے بھی فراہم کیے ہیں جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دورانِ تنقید انھیں دوسرے نقادوں کی طرح ادبی نمونوں سے کوئی گریز نہیں۔ اس طرح قاری کو یہ سہولت بھی میسر آتی ہے کہ یہ تنقید دلائل اور شواہد کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ نسلِ نو میں یہ علمی احتیاط غنیمت ہے۔

امتیاز وحید نے اس کتاب میں اردو کی منظوم اور نثری پیروڈیوں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے اپنے طور پر پچیس نمائندہ پیروڈیوں کا بھی انتخاب کیا ہے۔ یہاں نثر نگاروں کو زیادہ نمایندگی دی گئی ہے۔ یہ تمام پیروڈیاں شہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ کسی مبصر کے لیے یہ بات شاید حیلہ وحجت کے لئے موزوں ہو کہ سید محمد جعفری کی فلاں تحریر ضرور شامل ہونی چاہیے یا رضا نقوی واہی کی کوئی دوسری نظم اس سے زیادہ نمایندہ ہو سکتی تھی۔ لیکن جب اس انتخاب کو سلسلے سے پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتخاب کے مرحلے میں امتیاز وحید نے اس تخلیق کار کے ساتھ ساتھ اپنے انتخاب کے سلسلہ، خیال کو بھی خاطر میں رکھا ہے۔ کنھیا لال کپور، احمد جمال پاشا اور ظفر کمالی کی دو دو تخلیقات کا انتخاب میں شامل ہونا یہ اشارہ کرتا ہے کہ ان اصحاب نے پیروڈی کو اپناتے وقت زیادہ انہماک اور سرگرمی دکھائی۔ انتخاب پیش کرتے ہوئے مصنف نے نثر نگاروں کے ساتھ یہ بے انصافی قایم کردی کہ کتاب کی ضخامت نہ بڑھے، بھلے اردو کی شہ کار نثری پیروڈیاں اپنے مکمل وجود کے ساتھ اس کتاب کے قارئین کے سامنے آنے سے رہ جائیں۔ یہ درست کہ شاعری کی طرح اصل تخلیق اور اس کی پیروڈی کی پیش کش جتنی آسان ہے، اسی طرح نثری پیروڈیوں میں اصل اور اس کی پیروڈی کو ایک دوسرے کے مقابلے پیش کرنے کی گنجایش زیادہ نہیں ہے۔ شاید اسی لیے امتیاز وحید نے نثری پیروڈیوں کا انتخاب اپنے ضمیمے میں شامل نہیں کیا۔

تمام پچیس منتخبہ پیروڈیوں پر امتیاز وحید نے جو تنقیدی تجزیے اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں، ان سے اُن کے ناقدانہ شعور کو سمجھنا مشکل نہیں۔ ہر تخلیق سے اس کے خاص معنی برآمد کرنا اور تحلیل و تجزیہ کر کے امتیازات روشن کرنا سرسری کام نہیں تھا۔ امتیاز وحید نے متن کو گہرائی سے دیکھا اور ہر مصنف کے فنی پہلوؤں کی بہ حسن و

خوبی جانچ پرکھ کی ہے۔ شعری پیروڈیوں میں انھوں نے اصل متن کو سامنے رکھ کر پیروڈی نگار کی خصوصیات پر بحث کی ہے۔ لیکن نثری پیروڈیوں میں یہ انداز بدل جاتا ہے۔ اس حصے میں سب سے اچھا تجزیہ ظفر کمالی کی 'قلیپ نگاری' کا کیا گیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ مصنف متن کے اندر اترنے کے ساتھ ساتھ متعلقات متن پر ایک نظر ڈالے بغیر اپنا کام مکمل نہیں کرتا۔ اس بات کا ذرا افسوس ہوا کہ احمد جمال پاشا کی شاہ کار تحریر 'کپور: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ' کا تجزیہ بھرپور انداز میں ممکن نہیں ہو سکا۔ شاید اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ احمد جمال پاشا کی خدمات کا تذکرہ اس کتاب میں کئی جگہوں پر ہوا ہے اور انھیں ایک ساتھ پڑھنے سے پاشا کا مقام لازمی طور پر متعین ہو جاتا ہے۔

'پیروڈی کا فن' صرف اپنے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہوتی تو یہ بہت بڑی بات نہیں تھی۔ اس کتاب کے بہانے ہماری یونی ورسٹیوں میں پیدا ہو رہی نسلِ نو کا انہماکِ علمی اور اس کی دقیقہ سنجی ظاہر ہو رہی ہے۔ علمی کاموں سے سرسری گزرنے کی عمومی خو عمائدینِ ادب سے لے کر نو واردانِ بساطِ ادب، سب کے یہاں یکساں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں یہ گہرائی و گیرائی، علمی جفاکشی اور تحقیق وتنقید کی سنجیدگی نہایت خوش آیند ہے۔ تجزیے میں ذرا طوالت گھٹے، ہم عصر علمی فضا اور ادبی سرمایے سے ایک سرگرم رشتہ قایم ہو اور مکمل ادبی و علمی صورتِ حال کے سایے میں پیروڈی یا کسی اور صنف سے متعلق کارناموں کا جائزہ لینا اگر امتیاز وحید نے سیکھ لیا، تب مستقبل میں اردو تنقید و تحقیق کا چراغ اُن کے دَم سے بھی روشن ہوگا۔ آمین!

(2012)

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ادبی خدمات

اردو کے علمی حلقے میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کو بہ حیثیتِ ظرافت نگار اپنی زندگی میں زیادہ شناخت اور مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی تھی لیکن اُن کی وفات کے بعد اُن کی چھوٹی بہن اور ہماری زبان کی معتبر فکشن نویس عصمت چغتائی نے 'دوزخی' عنوان سے ان کا جو خاکہ لکھا، اس کے بعد مرزا عظیم بیگ سے عام قارئین کی رغبت اور اپنائیت بڑھی۔ فرحت اللہ بیگ کی تحریر 'نذیر احمد کی کہانی' کے بعد عصمت کا خاکہ ہی وہ شہہ کار ہے، جس سے فنِ خاکہ نویسی کا اس قدر اعتبار قائم ہوا۔ مرزا نے مختصر عمر پائی اور ۴۳ برس ہی میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اس دوران تقریباً تین درجن کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ انھوں نے خالص ظریفانہ تحریروں کے ساتھ ساتھ دوسری نوعیت کی چیزیں بھی شائع کیں۔ خاص طور سے ناول نگاری، افسانہ نگاری اور مذہبی بحث وتمحیص کو اپنے نظامِ تحریر کا انھوں نے حصہ بنایا۔ آج ہم اردو فکشن کی تاریخ کے اہم موڑ کے تعین میں نذیر احمد، مرزا رسوا، پریم چند اور قرۃ العین حیدر پر اپنی جان نچھاور کرتے ہیں لیکن فکشن کی اس عمارت میں کئی بار کبھی بنیاد کا پتھر بن کر اور کبھی پس منظر میں رہ کر جن لوگوں نے اسے استحکام بخشا ہے، اُن پر ہماری نگاہ کم جاتی ہے۔ انیسویں صدی میں اودھ پنچ کے مصنفین بہ شمول سرشار اور بیسویں صدی میں عظیم بیگ اور شوکت تھانوی کے ظریفانہ ناولوں نے کس طرح ہماری زبان میں روشن خیالی اور عقلیت پسندی کی بنیادیں مضبوط کیں، اس پر زیادہ دھیان نہیں رہتا۔ ہمارے معتدد ظرافت نگار صرف اسی بے توجہی کی وجہ سے اپنی علمی شناخت قائم کرنے میں کمزور ثابت ہوئے۔ عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی سے یہ سلسلہ مشتاق احمد یوسفی تک پہنچتا ہے جہاں ظرافت دانش ورانہ رُخ سے دامنِ دل کھینچتی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی کی موت اُس وقت ہوئی جب وہ تصنیف وتالیف کی اُٹھان پر تھے۔ ہمارے

گھروں میں اُن کی کتابیں مرد و خواتین کے مطالعے میں رہتیں۔ ان کے بعض ناولوں کی خاتون کردار اس زمانے میں آئیڈیل کے طور پر سماج میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ اُن کی تحریروں کے دانش ورانہ عناصر نے نذیر احمد اور پریم چند کی طرح ہی ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ ہمارے لیے ایک گم شدہ باب بن گئے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تحریروں کے تعارف، انتخاب اور احتساب کے سلسلے کو کسی نے آگے نہیں بڑھایا۔ ہمارے یہاں جہاں معمولی مصنفین پر ضخیم و جسیم کتابیں تیار کر کے کاغذ کا زیاں کرنا عام بات ہے لیکن ایسے اہم لکھنے والوں پر کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ ہارون ایوب کی ایک مختصر سی کتاب چھوڑ دیں تو اردو تنقید و تحقیق کا دامن عظیم بیگ چغتائی کے تفصیلی ذکر سے خالی ہے۔ اس صورتِ حال میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی لائق طالبہ حنا آفریں کی ۲۷۵ صفحات کی خفی کمپوزنگ میں جب کتاب سامنے آئی تو میری حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔ پروفیسر قاضی جمال حسین کی نگرانی میں ہوئی یہ بھرپور تحقیق عظیم بیگ چغتائی کے ساتھ اردو والوں کی غفلت شعاری کا واقعتاً بہترین ازالہ ہے۔ اس کام کے لیے حنا آفریں کے ساتھ ساتھ ان کے نگراں محترم بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کیوں کہ ایک ناتجربہ کار طالبِ علم سے اس قدر بھرپور اور صبر آزما کام مکمل کرالینا بھی ایک غیر معمولی ماہرانہ صلاحیت کا متقاضی ہے۔

عام طور پر تحقیقی کتابیں یا مقالۂ امتحانیہ غیر ضروری تفصیلات اور پس منظر یا معاصرین کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی وجہ سے گراں بار ہو جاتی ہیں۔ غیر ضروری باتوں سے تو ایسے تحقیقی مقالات بھرے ہی ہوتے ہیں۔ موجودہ تحریر اپنی بھرپور ضخامت کے باوجود ایسے کسی فضول گوشوارے سے ضخیم نہیں بنائی گئی ہے۔ سترہ صفحات میں سوانح مکمل ہو گئی ہے اور دس گیارہ صفحات میں عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کے تار و پود روشن کیے گئے ہیں۔ جن افراد نے 'دوزخی' کا مطالعہ کیا ہے، ان کے لیے بھی حنا آفریں کی کتاب کے متعلقہ صفحات میں بہت ساری نئی اطلاعات لازماً میسر آئیں گی۔ خاندانی ذرائع سے معلومات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور خاص طور سے جب عظیم بیگ چغتائی کے پس ماندگان پاکستان اور یورپ میں مقیم ہوں۔ حنا آفریں نے مطبوعہ ذخائر کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا اور نہایت اختصار کے ساتھ حیات و شخصیت کے بیش تر ضروری اجزا کو سمیٹ کر ایک ایسے انداز میں انھیں پیش کیا ہے جس سے عظیم بیگ سے محبت اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ۴۳ برس کی مختصر زندگی گزار کر رخصت ہونے والے جواں مرگ ادیب کی زندگی کس طرح نشیب و فراز کا شکار رہی،

اس کا اندازہ اس کتاب کے چند اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:

- ''اسی دوران عظیم بیگ نے اپنا مشہور ناول 'کھرپا بہادر' لکھا جو نواب جاورہ اور نواب رام پور کے خاندان کا قصہ ہے اور اسے نواب جاورہ کے منع کرنے کے باوجود عظیم بیگ نے شائع بھی کروادیا۔ اس دوران نواب جاورہ نے اپنے بیٹے کے لیے عظیم بیگ کی بیٹی کا پیغام بھی دیا۔ عظیم بیگ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ نواب جاورہ عظیم بیگ کی ان دونوں باتوں کی وجہ سے اُن سے بدظن ہو گئے اور انھیں دوا کے بہانے زہر دلوانے لگے کیوں کہ عظیم بیگ دمہ کے مریض تھے اور اس کے لیے مستقل دوا لیتے تھے۔''
- ''بیمار ہونے کے بعد پڑھنا لکھنا کچھ زیادہ ہی ہو گیا کیوں کہ گزر بسر کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ بستر پر پڑے رہنے کے باوجود علی گڑھ کے جانسن تالوں کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ جودھپور کے تاجروں کو تالے سپلائی کرتے۔ جودھپور میں تانبے کے بٹنوں کے آرڈر لیتے جو جودھپور حکومت کی پولیس فوج کو سپلائی کرتے۔ اس کے علاوہ عظیم بیگ نے بمبئی کی ''سپلا'' دواؤں کی کمپنی کی ایجنسی بھی لے رکھی تھی۔ اس طرح عظیم بیگ بستر پر لیٹے لیٹے ہی کافی کما لیتے تھے۔''
- ''جب بھی افسانہ وغیرہ لکھنا ہوتا تو وہ لیٹے لیٹے خود بولتے رہتے۔ کبھی بیٹے اور کبھی بھانجے لکھتے رہتے۔ اسی حالت میں لکھنے کا شوق ان کی ضرورت بن گیا کیوں کہ اس وقت ایک افسانے کے پندرہ بیس روپے ملتے تھے۔ عظیم بیگ کو مہینے میں تین چار افسانے گھر کے خرچ کے لیے مجبوراً لکھنا پڑتے تھے۔ کتابوں سے بھی آمدنی تھی۔ اس کے علاوہ جانسن تالوں کی ایجنسی سے بھی تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔''

ان اقتباسات سے عظیم بیگ چغتائی کے داخل میں پیوست توانا شخصیت کو سمجھنا دشوار نہیں۔ مصنفہ نے اختصار کے ساتھ صرف اُن پہلوؤں کو دکھایا ہے جن سے عظیم بیگ کی زندگی آئینہ ہوسکتی تھی۔ انھوں نے زیادہ صراحت اور تفصیل کی طرف بڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہ اچھا ہوا کہ مصنفہ نے صرف کام کی باتوں پر اکتفا

کیا، ورنہ بہت ساری ایسی باتیں بھی تھیں جنھیں عظیم بیگ کی سوانح میں شامل کرکے کوئی دوسرا لکھنے والا چٹخارا پیدا کرسکتا تھا۔

عظیم بیگ کی ادبی خدمات کے تعارف کے لیے (۱) ناول نگاری (۲) افسانہ نگاری (۳) مزاح نگاری اور (۴) مذہبی تحریروں پر الگ الگ مکمل ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ عظیم بیگ کے چار ناولوں پر خاص طور سے صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ 'شریر بیوی'، 'کھرپا بہادر'، 'ویمپائر'، اور 'چمکی'۔ اسی طرح اُن کے افسانوی مجموعوں 'روحِ ظرافت' 'روحِ لطافت' اور 'خانم' کے تعلق سے مصنفہ نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے حنا آفریں نے ۱۹۳۵ء میں رسالہ 'ساقی' کے متعدد شماروں میں شائع ہونے والے عظیم بیگ چغتائی کے سلسلۂ مضامین سے اقتباسات درج کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو افسانے کی تنقید کے تعلق سے جن لوگوں نے سب سے پہلے غور وفکر کیا، ان میں عظیم بیگ جیسا ظرافت نگار بھی ہے۔ یہ مناسب ہوگا کہ فنِ افسانہ نگاری کے حوالے سے شائع شدہ وہ تمام مضامین کتابی شکل میں ترتیب پاکر سامنے آجائیں۔ اس سے عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کا ایک نیا رُخ سامنے آئے گا۔

'دوزخی' میں عظیم بیگ کی مذہبی بحث وتمحیص سے ان کی دل چسپیوں کا ذکر ہے۔ اس سلسلے سے عظیم بیگ چغتائی کی چار کتابیں 'قرآن اور پردہ'، 'حدیث اور پردہ'، 'تفویض'، اور 'رقص وسرود' شائع ہوئیں۔ اردو ادب کے طالب علم کے لیے یہ ایک ضمنی حوالہ ہے کہ عظیم بیگ چغتائی نے مذہبی امور پر چند کتابیں لکھیں۔ اسی لیے کبھی ان کتابوں کا کسی نے جائزہ نہیں لیا یا ان کے مشتملات کا بالاستیعاب مطالعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ حنا آفریں نے تقریباً ایک سو صفحات میں ان کتابوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے حنا آفریں نے ابوالاعلا مودودی، اشرف علی تھانوی اور دیگر ماہرینِ علومِ اسلامیہ کی متعلقہ کتابوں سے بھی بحث کرکے عظیم بیگ چغتائی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ یوں یہ حصّہ براہِ راست ادبی مطالعے سے متعلق نہیں ہے لیکن حنا آفریں نے مدلّل گفتگو کرکے عظیم بیگ چغتائی کی روشن خیال اور liberal شخصیت کے عناصر واشگاف کردیے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کی افسانہ نگاری یا ناول نگاری واقعتاً اُن کی ظرافت سے ہی متعلق ہیں۔ شاید اسی لیے اردو افسانے یا ناول کی تاریخ لکھتے ہوئے لوگوں نے ایسے ظرافت نگاروں کا خیال نہیں رکھا جو ظریفانہ

افسانے یا ناول لکھ رہے تھے۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی اس پہلو سے نقادوں کے التفات سے دور رہے جب کہ یہ سچائی ہے کہ ان کی تحریریں افسانہ یا ناول کے دائرے میں پہچانی جانی چاہئیں۔ حنا آفریں نے (۱) مختصر افسانہ (۲) طویل مختصر افسانہ (۳) ناول کے صنفی تقاضوں کو سمجھتے ہوئے عظیم بیگ کی کم از کم دو درجن ایسی تحریروں کو اپنے تجزیے کا حصہ بنایا جو پڑھنے والوں کے حافظے سے دور جا رہی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ حنا آفریں نے تخلیقات کے تجزیے کے دوران ذرا طوالت سے کام لیا اور موضوعاتی دنیا کی اسیری انھیں فنی محاسبے سے روکتی بھی رہی۔ لیکن یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے ثانوی ماخذات کے مقابلے اصل تخلیقات پر توجہ کر کے اپنی تحقیق اور تجزیے کو با اعتبار بنایا۔

یہ کتاب اگر ایک چوتھائی کم ہو گئی ہوتی تو رطب و یابس کی گنجائش نہیں رہتی۔ اقتباسات کی شمولیت کے بعد متن میں پھر انھی باتوں کا دورانِ تجزیہ دہراو اس کتاب میں گراں گزرتا ہے۔ کتاب کی زبان صاف ستھری اور تحقیقی اعتبار سے موزوں ہے لیکن بعض جملے یا الفاظ بار بار اس طرح دہرائے جاتے ہیں جس سے بیان کا کچا پن سمجھ میں آتا ہے۔ یہ مشق کی کمی کا اشاریہ ہے۔ حنا آفریں نے اس تحقیقی مقالے سے قبل ۲۰۰۷ء میں 'معنی کی تلاش' عنوان سے ایک مجموعۂ مضامین شائع کیا تھا جس کا بڑا حصہ شعری اور افسانوی شہکاروں کے تجزیے پر مشتمل تھا۔ اس دوران اردو کے رسائل و جرائد میں محترمہ کے بہت کم مضامین دیکھنے کو ملے۔ زبان کی سطح پر پختہ کامی آتے آتے آئے گی۔ آج کل کی عمومی تحقیق و تنقید یا شخصی مطالعے کے نام پر مستند و معتبر اہلِ قلم کے نوشتہ جات کے مقابلے میں یہ تحقیقی مقالہ مجھے زیادہ پسند آیا اور یونی ورسٹیوں میں تحقیقات کے معیار کے سلسلے سے ہو رہی گفتگو کے برعکس ایک ٹھوس کارنامہ سمجھ میں آتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو ایسے کاموں کے لیے مبارک باد کا مستحق ہے۔

(2012)

قطعۂ تاریخ انطباع

واحد نظیر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

لگتا ہے جل رہے ہوں گلے نکہت و انوار
تحریر میں یوں علمی شعائیں ہیں عطربیز

جب سے بَسا ہے آنکھوں میں یہ گلبنِ نکات
کہتے ہیں لوگ میری نگاہیں ہیں عطربیز

پھولوں میں پنہاں کانٹوں سے کرتا ہے روشناس
دل سے مری نکلتی دعائیں ہیں عطربیز

رکھتا ہے دُکھتی رَگ پہ یوں اُنگلی کہ واہ واہ
صفدر کی پُرخلوص ادائیں ہیں عطربیز

منبہ موتیوں سے بھرنے کے قابل نہیں نظیر
ہاں فکر کے گُہر کی یہ کانیں ہیں عطربیز

نقدونظر کا دیکھ کے عمدہ یہ اہتمام
ہاتف کی آتی غیبی صدائیں ہیں عطربیز

تاریخ ہوگی نامِ مصنّف سے شادکام
بائیس نئی پرانی کتابیں ہیں عطربیز

1242+771=2013

ظفر کمالی

ظاہر میں تو لوگوں کا ریلا ہے ظفر
محسوس یہ ہوتا ہے کہ میلا ہے ظفر
کچھ لوگ ہی واقف ہیں اس کے غم سے
وہ بھیڑ میں رہ کے بھی اکیلا ہے ظفر

آغوشِ گردش میں جینا سیکھا
تیروں کی بارش میں جینا سیکھا
فن جینے کا اس سے سیکھو، اس نے
کوفے کی سازش میں جینا سیکھا

رعنائی کو اللہ سلامت رکھے
دانائی کو اللہ سلامت رکھے
ایسا ہے وہ رسوا؟ تو دعا کرتا ہوں
رسوائی کو اللہ سلامت رکھے

دشمن ہی بنائے ہیں تو دشمن ہیں بہت
رستے میں ظفر اس کے رہزن ہیں بہت
کچھ بھی ہو مگر بازی جیتے گا وہی
قسمت کے ستارے جو روشن ہیں بہت

نقاد بنا دے وہ شاگردوں کو
فولاد بنادے وہ شاگردوں کو
پتھر کو تراشے تو ہیرا کردے
استاد بنا دے وہ شاگردوں کو

محنت کی ، مشقت کی، ریاضت کی دھاک
حکمت کی ، متانت کی، دیانت کی دھاک
تنقید کی دنیا میں آکر دیکھو
ہے بیٹھی ہوئی اس کی ذہانت کی دھاک

یہ ایک دل چسپ، پُرمغز اور آئے دن چھپنے والی کتابوں کے ہجوم میں ایک الگ طرح کی کتاب ہے۔ کتاب سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ تشویش کا موسم ہے۔ زیادہ تر کتابیں صرف چھپوانے کے لیے لکھی جاتی ہیں؛ اس لیے نہیں کہ پڑھی جائیں اور شاید اسی لیے، لکھنے والے اور پڑھنے والے، دونوں بالعموم رواروی اور غیر ذمے داری کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں۔ کتاب سازی کی وبا عام ہے اور سوچ بچار کی عادت بہت کم ہوتی جارہی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ تبصرے لکھنے والے بھی کسی کتاب کے جائزے سے پہلے اسے پڑھنا ضروری نہیں سمجھتے۔

شاید اسی وجہ سے صفدر امام قادری کے ان تبصرہ نما مضامین نے مجھے کچھ حیران بھی کیا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ تبصرے سے پہلے ہی کتاب غور سے پڑھی؛ لکھتے وقت بھی متانت اور علمی ذمے داری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اپنی باتیں صفائی کے ساتھ، کھرے اور دو ٹوک انداز میں کہیں، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کچھ لکھنے والے یہ ہرگز نہ چاہتے رہے ہوں گے کہ ان کی کتاب اتنی غیر جانب داری اور توجہ کے ساتھ پڑھی جائے۔ صفدر امام قادری نے زیر تبصرہ کتاب کے ساتھ ساتھ زیر بحث موضوع کے ساتھ بھی حتی الامکان انصاف کیا ہے۔ تبصرے کے لیے کتابوں کا انتخاب بھی اکثر سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔ یہ مضامین فرمائشی قسم کے نہیں ہیں اور زیر مطالعہ مصنف یا موضوع کے علاوہ، مبصر کے مطالعے اور بصیرت کا حق بھی ادا کرتے رہے ہیں۔

دلی: ۶ راگست ۲۰۱۳ء

— شمیم حنفی

Nai Purani Kitaben

by: Safdar Imam Quadri

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com

A for Arshia Publications